حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

۷

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر • کراچی • پاکستان

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

جلد — ۷

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مُرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ

بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب — فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب — متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب — متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

خطبۂ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . أَمَّابَعْدُ!

صدرِ محترم! حضرات گرامی، علمائے کرام، مہمانان عظام ومعزز حاضرین! ہم اس ایمانی اور تاریخی اجتماع کے موقع پر جو برِّ صغیر کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی بین الاقوامی تعلیم گاہ ''جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند'' میں بین الاوطانی انداز سے منعقد ہو رہا ہے، جس میں تقریباً تمام اسلامی منطقوں کے فضلاء اور اربابِ دانش جمع ہیں، سب سے پہلے حق جل مجدہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس چھوٹی سی بستی میں ایسی بڑی بڑی ہستیوں کو یکجا کر کے ایک دوسرے کی زیارت وملاقات، ربط باہمی اور اسلامی اخوت ومودت کو تازہ بتازہ کرنے کا موقعہ عطاء فرمایا۔ ہم اس موقع پر اس غیر معمولی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آج یہ کبرائے ملت، ہم غرباءِ امت کے کندھوں سے کندھا ملائے بیٹھے ہوئے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دلوں سے دل ملا کر اسلامی اخوت، مساوات اور مودت باہمی کا عملی ثبوت پیش کر رہے ہیں، جو محض فضل خداوندی اور انعام ربانی ہے۔

﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ ① اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ ہم بصمیم قلب دعاء گو ہیں کہ اہل علم کی ہمت افزائی اور ملتِ اسلامیہ کی عزت افزائی کے لئے آپ حضرات اس سرزمین علم پر بار بار قدم رنجہ فرمائیں! آمین

شکر و سپاس...... اس کے بعد میرا سب زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ خوشگوار فریضہ یہ ہے کہ میں بحیثیت خادم جامعہ اپنی مجلس شوریٰ، اپنے ادارہ کے اساتذہ، شیوخ، طلبائے عزیز، فضلاءِ گرامی، مسلمانانِ ہند، جمیع کارکنان، ادارہ اور بالخصوص اجلاس صد سالہ کے مخلص کارکنوں کی طرف سے آنے والے مہمانان کرام کا شکریہ ادا کروں، جنہوں نے مشرق ومغرب کے دور دراز سفروں کی صعوبتیں جھیل کر محض اللہ کے لئے اس بین الملی اجتماع میں شرکت فرمائی۔

بلاشبہ یہ اسلام ہی کی جامعیت اور اجتماعیت کا کرشمہ ہے کہ ہم جیسے غرباء ان کبرائے قوم اور عظمائے ممالک

① پارہ: ١٠، سورۃ الانفال، الآیۃ: ٦٣۔

کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں اور ان کے پُر از مودّت واخوت چہروں کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور بڑھا رہے ہیں، جس میں علماء وعرفاء بھی ہیں اور اصحاب حدیث وتفسیر بھی، ارباب فقہ واصول بھی ہیں اور دانایان فلسفہ وکلام بھی، علوم شریعت کے شیوخ بھی ہیں اور علوم جدیدہ کے دانشور بھی، عمائد ملک وملت بھی ہیں اور زعماءِ ممالک واقوام بھی، جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی موءقر خدمات سے انسانیت کے لئے رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ کس زبان سے اور کن الفاظ میں ان جلیل القدر ہستیوں کا شکریہ ادا کریں۔ جب کہ الفاظ تو جذبہءِ امتنان ومنت پزیری سے اوپر چڑھنا چاہتے ہیں، لیکن ان ہستیوں کی بلند مکانی تک صد ہزار کوششوں کے باوجود نہیں پہنچ پاتے ؎

دامانِ نگاہ تنگ گل حسنِ تو بسیار

ہم زبان وبیان بلکہ زمین وآسمان سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والے اور ایمانی تقاضوں اور روح اسلامی سے مملو پر خلوص جذباتِ تشکر کو دعائیہ تعبیر میں آپ حضرات کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں کہ! "جَزَاكُمُ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْرًا وَّأَبْقَاكُمْ فِيْ عِزٍّ عَلَى الدَّوَامِ" (آمین!)

دیوبند ایک تاریخی اور مرکزی بستی ...... حضراتِ محترم! "یہ بستی" "دیوبند" جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، بہت پرانی اور قدیم الایام بستی ہے، تاریخوں سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا پتہ چلتا ہے، قدیم زمانے سے یہ بستی برادران وطن کی ایک زبردست تیرتھ گاہ ہونے کی وجہ سے (جو "دیوی کنڈ" کے نام سے معروف ہے۔ اور اس پر آج بھی سالانہ میلہ لگتا ہے) مرکزیّت کی حامل ہے، اس دیوی کنڈ ہی کے نام پر اس بستی کا قدیم نام "ڈیبی بن" تھا جو کثرت استعمال سے "دیوبند" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس چھوٹی سی بستی میں جس میں مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے، سو سے اوپر مسجدیں ہیں، جن میں متعدد مساجد شاہی زمانوں کی یادگار ہیں، آدینی مسجد "یعنی قدیم جامع مسجد" پانچ سو سال اور ایک روایت کے مطابق آٹھ سو سال پرانی ہے جس کے سنگین کتبے پر بہلول شاہ ثبت ہے۔ مسجد خانقاہ عہدِ اکبری کی یادگار ہے "مسجد سرائے پیرزادگان عہدِ جہانگیری کے آثار میں سے ہے۔

یہ بستی شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقہ طول البلد دہلی سے ۹۲ میل شمالی جانب صوبہءِ یوپی میں واقع ہے۔ شیر شاہی شاہراہ اعظم جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے، اس بستی سے ہوکر گزرتی ہے، اس بستی میں قدامت کے ساتھ مرکزیّت کی شان بھی پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن قدرت کو اس رسمی مرکزیّت سے شرعی مرکزیّت کا کام لینا تھا اور اس جگہ سے علم کا ایک ایسا ہمہ گیر چشمہ جاری کرنا تھا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی علوم نبوت سے سیراب کرے۔

روشن ضمیر اہلِ دل اس کی پیشین گوئیاں پہلے سے کرتے آرہے تھے "جس کی تفصیل تاریخ دارالعلوم" میں دی گئی ہے، ان پیشین گوئیوں کے مطابق یہ بستی عالموں، فاضلوں، قادر الکلام ادیبوں، آزادی کے جانبازوں اور

دینی میدان کے سرفروشوں کی بستی بننے والی تھی، یا بااسباب ظاہرہ یہاں کی قدیم مساجد کی اذانوں اور تکبیروں، ذکر و تلاوت کی محفلوں اور نمازیوں کے جمگھٹوں کی برکات کا ظہور دینی رنگ میں ہونے والا تھا۔

قیام دارالعلوم کا پس منظر اور اسباب تاسیس...... وقت آیا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رست و خیز کے بعد اس بستی کا نیا دور شروع ہوا اور یہاں علمی و عرفانی زندگی کا ستارہ طلوع ہوا جبکہ ہندوستان کی باگ انگریز کے ہاتھ میں جا چکی تھی، اسلامی شوکت کے چراغ میں صرف دھواں اٹھتا ہوا رہ گیا تھا، جو چراغ کے بجھ جانے کا اعلان تھا۔ دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا، اسلامی شعائر رفتہ رفتہ روبزوال تھے، دینی تعلیم گاہیں اور علمی خانوادے اجڑ چکے تھے، دینی شعور رخصت ہو رہا تھا، جہالت و ضلالت کی گھٹائیں افق ہند پر چھا چکی تھی، سنن انبیاء کی جگہ جاہلانہ رسوم و رواجات، مشرکانہ بدعات و خرافات اور ہوا پرستی زور پکڑتی جا رہی تھی جس سے دہریت والحاد، فطرت پرستی، آزاد فکری، بے قیدی نفس اور فوضویت کی وباء پھوٹ پڑی تھی، چمن اسلام میں خوش آواز پرندوں کے زمزموں کی جگہ زاغ و زغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی، مسلمان مضطرب و بے چین اور مایوسی کا شکار تھے، علماء کے لئے پھانسیوں کے پھندے تھے یا جلاوطنی کے مصائب، اس وقت چند نفوسِ قدسیہ نے اپنے منور قلوب میں یہ خلش اور کسک محسوس کی کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے ملی وجود کے تحفظ اور علوم نبوت اور اسلامی معاشرے کو بچانے کی کیا صورت اختیار کی جائے اور ان میں دینی شعور اور ایمان دارانہ سیاسی فکر کو حیاتِ نو کس طرح بخشی جائے؟ تو یہ صلحائے امت کمرِ ہمت باندھ کر میدان میں آئے، جو رسمی قسم کے لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاءِ وقت تھے، جو غیبی اشارے کے تحت کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے، جن کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) تھے، جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھ کر اسے اس تجویز کی صورت دی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی تعلیم و تربیت اور علم و عمل کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے مسلمان کو سہارا دے کر دلوں کی مردہ زمینوں کو زندہ کیا جائے۔

چنانچہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء کو تعلیمی رنگ میں عالمگیر احیاءِ دین کی تحریک کا یہ پودا چھتہ کی مسجد میں (جو آپ حضرات کی نگاہ میں آ چکی ہے) ایک انار کے درخت کے نیچے صرف دو آدمیوں کے ذریعہ نصب کیا گیا، دونوں کا نام محمود تھا۔ ایک محمود معلّم تھا اور ایک محمود متعلّم۔ جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے معروفِ زمانہ ہوا۔ اس وقت نہ اس گمنام مدرسہ کے پاس اپنا کوئی مکان تھا نہ مکان بنانے کا سرمایہ، نہ پروپیگنڈہ تھا نہ اشتہار و اعلان کا تخیل، صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ تھا جس کی تلقین اور تاکید خود بانیء اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کے ہشتگانہ اساسی اصول میں بار بار رشد و مد کی گئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور احیائے دین کی عالمگیر تحریک...... غور کرنے کی بات ہے کہ جس طرح ہندوستان سے اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا حادثہ محض مقامی یا محض ملکی قسم کا نہ تھا بلکہ عالمی رنگ کا تھا جس کے دوررس اثرات دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی پڑے، چناں چہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ہندوستان کی غلامی کتنے ہی ملکوں اور

ریاستوں کی غلامی پر منتج ہوئی، اس طرح ایمانی اور علمی رنگ میں احیاءِ دین کی یہ تحریک جو "محمود دین" سے شروع ہوئی، ابتداءً محض ایک ضعیف کونپل کی صورت میں نمودار ہوئی، مگر اہلِ نظر کی نظر میں اس کونپل بلکہ اس کے تخم ہی میں ایک تناور شجرۂ طیبہ لپٹا ہوا محسوس ہو چکا تھا، جس کے شیریں ثمرات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی بہرہ مند ہونے والے تھے اور وہ دین کی نشاۃِ ثانیہ کا مصدر و منشاء بننے والا تھا۔

اس لئے جہاں غلامی کے رنگ میں اس ملک کی تخریب عالمی تھی وہیں تعلیمی رنگ میں یہ تعمیری تحریک بھی بانی اعظم کی فکر پر عالمی رنگ سے اٹھی، جو نہ صرف علمِ دین کے لحاظ سے ہی عالمگیر ہوتی چلی گئی بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ثابت ہوئی تا آنکہ اسی تحریک کے پروردوں نے جہاں سو برس بعد ہندوستان کو آزاد کرایا، وہیں اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر جو ممالک اور ریاستیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، وہ بھی رفتہ رفتہ آزادی کا سانس لینے لگے، تخریب اگر عالمی انداز کی تھی تو اس کے ردِ عمل کے طور پر یہ تعمیر بھی عالمی ہی انداز سے ابھری جس کا علمی و عملی فیضان چند ہی سال میں ایشیاء سے آگے بڑھ کر افریقہ تک پھیل گیا اور آج یورپ و امریکہ تک اس کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں، ان ساری آزادیوں کا خاموش رہنما بھی جامعہ دارالعلوم دیوبند تھا، جس کے فضلاء نے درس و تدریس کے ساتھ مختلف قومی و سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اتر کر تحریکات کے ذریعہ اس ملک میں آزادی کی روح پھونکی اور ۱۸۵۷ء ہی سے پھونکنی شروع کر دی تھی جب کہ ملک کے دوسرے حلقے سراسیمہ اور خاموش تھے یا خوشامد میں لگے ہوئے تھے، ان بزرگوں نے غاصب انگریز کا مقابلہ ابتداءً آہنی تلوار سے کیا، پھر امن اور علم کی ناقابلِ شکست طاقت سے نبرد آزما ہوئے اور علمی رنگ سے یہ جذبات دور رس ثابت ہوئے اور آزادی کی لہریں دور دور تک پھیلیں جس سے اس جامعہ کے موسسین، فضلاء اور روشن ضمیر حلقوں کی سنہری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

جامعہ دارالعلوم دیوبند کا بنیادی اور ہمہ گیر مقصد...... اس مرکزی جامعہ کی تعلیم کا اصل مقصد کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و ترویج، اس کی عملی تمرین اور عمومی اشاعت و تبلیغ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعصب آمیز منافرتوں کا استیصال کر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے، تاریخ اس پر شاہد ہے کہ بحیثیت مکتبِ فکر اس درسگاہ نے ہر اسلامی طبقہ کی طرف موانست و محبت کا ہاتھ بڑھایا اور بحیثیت جامعہ اس نے اپنا تعلیمی نصاب ایسا جامع رکھا کہ کوئی بھی اسلامی طبقہ اس سے باہر نہ رہنے پائے، نصاب میں حفظِ قرآن سے لے کر تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ اصولِ فقہ کلام بلاغت و بیان، حقائق و اسرار اور ان منقولات کے ساتھ علومِ معقولہ، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، عروض و قافیہ، مناظرہ اور اختیاری فنون، مبادی سائنس، معلوماتِ عامہ، علمِ طب، صنعت و حرفت اور خوشخطی وغیرہ نصابِ درس میں شامل کیں تا کہ کوئی بھی علمی، عملی، اخلاقی اور صنعتی طبقہ اس اجنبیت کو محسوس نہ کرے اور نہ صرف یہی بلکہ علمِ دین کے ہر بنیادی شعبے کو اس جامعہ میں ایک مستقل مدرسہ و کلیہ کی حیثیت و صورت دی گئی ہے جیسے مدرسۃ القرآن، مدرسۃ التجوید، مدرسۃ فارسی و ریاضی، کلیۃ الطب، کلیۃ الصنائع، کلیۃ اللغۃ العربیہ

اور کلیۃ الفقہ والافتاء وغیرہ، اس طرح اس درسگاہ نے ایک مذہبی یونیورسٹی اور جامعہ کی صورت اختیار کر لی اور الحمدللہ ہر ہر فن کے متخصص تا حال اس سے ۱۶ ہزار تیار ہو چکے ہیں اور جامعہ سال بسال مائل بہ ترقی ہے۔ ان ۱۶ ہزار فضلاء کی تعداد میں مدرّسین بھی ہیں اور مبلغین بھی، خطباء بھی ہیں اور مقررّین بھی، علماء بھی ہیں اور مفکرّین بھی، مصنفین بھی ہیں اور مؤرخین بھی، اطباءِ جسمانی بھی ہیں اور مصلحان روحانی بھی۔ فضلا دارالعلوم کی مذکورہ ۱۶ ہزار تعداد بلا واسطہ ہے اور بالوسائط ان فضلاء کو بھی شمار کیا جائے جو فضلائے دیوبند کے تیار کردہ ہیں تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس علمی گہوارہ کے لاکھوں مستفیدین نہ صرف برصغیر میں بلکہ ایشیاء، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک میں بیش بہا دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت بانی ءدارالعلوم اور جملہ بزرگان دیوبند کی سب سے بڑی سیاست ہی یہ تھی کہ دینی تعلیم گاہیں قائم کر کے مسلمانوں کو سنبھالا جائے، چناں چہ حضرت الامام بانیٔ دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند کے علاوہ جگہ جگہ بنفس نفیس پہنچ کر دینی درسگاہیں قائم کیں اور اپنے متوسلین کو خطوط بھیج بھیج کر بڑی تعداد میں مدارس قائم کرائے۔

دارالعلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد و مدارس دینیہ ہی برصغیر میں درحقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اس طرزِ فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے اور آج بحمداللہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتبِ فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علمائے دیوبند علمی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کہ تعلیم و تربیت کے بغیر تحفظِ دین اور اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر مسلمانوں کو چلانے اور قائم رکھنے کی اور کوئی صورت نہیں، نبی ءکریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا بنیادی مقصد تعلیم اور تربیتِ اخلاق ہی ظاہر فرمایا ہے۔

"اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ① یعنی احکام کا تعلق تعلیم سے ہے۔ جو حدیثِ اول کا مفاد ہے اور احکام کے مطابق زندگی گزارنے کا تعلق تربیت اور تزکیۂ اخلاق سے ہے جو دوسری حدیث کا مفاد ہے۔ اس لئے علماء دارالعلوم نے انہی دونوں چیزوں کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ٹھہرایا اور کامیابی کے ساتھ یہ منازل طے کیں! "تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَاتَمَسَّكْتُم بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهِ" ②

دارالعلوم کی تصنیفی خدمات...... اس مکتبِ فکر کا دوسرا سلسلہ تصنیف و تالیف کا ہے، تو اس سلسلے میں بھی علماء دیوبند کے قلم حقیقت رقم نے پانچ ہزار سے زائد تصانیف کا عظیم الشان ذخیرہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں جمع کیا جو برصغیر کے ہر اسلامی مکتبِ فکر سے بدرجہا زائد اور وقیع ہے۔

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ١، ص: ٢٧٤.

② مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النهي عن القول بالقدر ج: ٥ ص: ٣٧١.

تصنیف وتالیف کا سلسلہ آغازِ دارالعلوم ہی سے شروع ہوگیا تھا، خود حجۃ الاسلام حضرت بانیٔ اعظم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تصانیف ۲۵ سے زائد ہیں جن میں علمِ کلام، عقائد اور فقہیات وغیرہ کو عقلی اور حسی دلائل سے مبرہن کیا ہے اور ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو نہر سے بحر بنادیا، دارالعلوم کے مشہور مصنفین جنہوں نے علومِ دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، احسان، اجتماعیات، سیاسیات، تاریخ اور سیرت وغیرہ میں تصنیفی خزانہ جمع کیا ہے، ان میں سرفہرست نام مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا آتا ہے جن کی تصانیف کا عدد ایک ہزار تک پہنچا ہوا ہے جو موصوف نے ہر علم وفن میں نثر ونظم میں، عربی، فارسی اور اردو میں مدوّن فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب محدث گوجرانوالہ پاکستان، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند ومحدّث مدرسہ مظاہرالعلوم سہارنپور، حضرت علامہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ محدّث دارالعلوم دیوبند پھر ان کے تلامذہ میں "حضرت شیخ الاسلام پاکستان علاّمہ شبّیر احمد صاحب عثانی" "صاحب فتح الملہم"۔ حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی وصدر جمعیت علماء ہند، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ مدیر رسالہ "القاسم" و"الرشید" دیوبند حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ محدث دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدنی محدّث دارالعلوم دیوبند، پھر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ ثم المدنی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مفتیٔ اعظم پاکستان، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر برہان دہلی، مولانا منظور احمد نعمانی صاحب مدیر "الفرقان" لکھنؤ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حقیر ترین تلامذہ میں یہ احقر راقم السطور بھی شامل ہے جس کی تصنیفات سو (۱۰۰) سے اوپر ہیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ میں مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم اکوڑہ خٹک پاکستان، مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی سربراہ مدرسہ رحمانیہ مونگیر، مولانا حامد الانصاری غازی صاحب وغیرہ اور ہزاروں وہ فضلاء ہیں جن کے قلم سے ہزارہا تصانیف وجود میں آئیں اور اس طرح تصنیف کے سلسلے میں بھی یہ مکتبِ فکر برصغیر کے تمام مکاتبِ فکر سے آگے اور ممتاز ہے۔ جس نے دین کے ہر ہر گوشے کو اجاگر کیا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو علمی رنگ میں دنیا کے سامنے رکھا۔

ساتھ ہی دار العلوم محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک عملی تربیت گاہ بھی ہے جہاں علم کے ساتھ عمل صالح، اخلاق فاضلہ اور کثرتِ ذکر کی روح بھی طلبہ میں پھونکی اور پیوست کی جاتی ہے۔ اس ادارہ میں حسن سلوک واحسان کے تحت شخصی تربیت کے علاوہ اصولی اور علمی طور پر بھی فن کے مسائل کو کتاب وسنت سے واشگاف کر کے اس مصنوعی تصوف پر کاری ضرب لگائی ہے جو فی زمانہ بنام تصوف چند بندھی جڑی رسوم وبدعات ومحدثات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں علم کے ساتھ عزتِ نفس، وقار، استغناء اور خودداری کے ساتھ خاکساری تواضع، زہد وتقویٰ اور صلاح ورشد کی روشنی بھی راسخ ہوتی ہے جو اس کے فروعی مدارس میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔

دار العلوم دیوبند برِ صغیر کے مدارس وجامعات میں ام الجامعات ہے، اس لئے اسے ازہر الہند بھی کہا جاتا ہے جس کے فیضان سے ہزارہا مدارس ومعاہد چل رہے ہیں اور لاکھوں کے قلوب میں ایمانوں کی حفاظت ہو رہی ہے اور بیشمار افراد طریق سنت پر لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح اس دور کی عقلیت پسندی اور خوگری محسوسات چونکہ نقلیاتِ دین کے ماننے میں حارج ہوتی تھی۔ اس لئے انہی فضلائے دار العلوم دیوبند نے قاسمی رنگ سے متکلمانہ انداز کی بھی سینکڑوں تصنیفیں سطح پر لا رکھیں جس سے نام نہاد عقلی شکوک وشبہات، تمدنی تاویلات اور معاشی تحریکات کا پردہ چاک ہو گیا۔ ان فضلائے گرامی کو اگرچہ دستار وسند تو آج دی جا رہی ہے لیکن یہ بہت پہلے سے اپنی خدمات وتعلیمات سے خود سند دمستند ثابت ہو چکے ہیں۔

جامعہ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی امتیاز...... اس دار العلوم میں خصوصیت سے تدریس حدیث پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے جو قرآن حکیم کی اوّلین تفسیر اور فقہ اسلامی کا اولین سرچشمہ ہے، اس لئے کہ فن حدیث کی تکمیل سے قرآنِ مبین اور فقہ فی الدین دونوں کے سمجھنے کی صحیح استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اس کے نصاب کا اساسی حصہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام وبلاغت ومعانی، ادبِ عربی اور صرف ونحو ہے تفسیر فنون بطور مبادی واسباب یا بطور آثار ونتائج پڑھائے جاتے ہیں۔

دار العلوم دیوبند کا سلسلۂ سند...... اس دار العلوم کا سلسلۂ سند اساتذہ دار العلوم سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ تک، اور ان سے سندِ متصل کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ دار العلوم کی جماعت خالصتاً اہلِ سُنّت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنّت اور فقہ ائمہ پر قائم ہے۔ اس کے ذوق پر تمام مسائل میں اولین درجہ نقل وروایت اور آثار سلف کو حاصل ہے۔ اس لئے فضلائے ادارہ کتاب وسنت کی مرادات اقوال سلف سے، ان کے متوارث تعامل وذوق کی معرفت کے ساتھ اساتذہ شیوخ کی تربیت وصحبت اور معیت وملازمت سے حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی یہ مکتبِ فکر عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین کو بھی فہمِ کتاب وسنّت کا ایک اہم ترین رکن قرار دیتا ہے۔

جامعہ دار العلوم کا انتظامی طریقۂ کار...... انتظامی حیثیت سے اس دار العلوم کی تعلیمات وانتظامات کی نگران

اعلیٰ ایک مؤقر مجلس شوریٰ ہے جس میں ملک کے مقتدر علماء اور اربابِ فکر ونظر فضلاء شامل ہیں جن میں بعض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ادارۂ اہتمام کے تحت چوبیس انتظامی شعبے ہیں۔ ساٹھ اساتذہ اور دوسو سے اوپر شعبہ جاتی عملہ ہے جو تقسیم کار کے اصول پر کام کرتا ہے۔ ان تمام شعبوں کا حقیقی مقصد اساتذہ اور طلبہ کی ضروریات کی تکمیل اور نظام کی استواری ہے جس پر سالانہ ۳۰ لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے جس کی تکمیل کا شعبۂ محاسبی ذمہ دار ہے۔ اس کے ذریعہ ہر سال میزانیہ تیار ہو کر مجلس شوریٰ سے منظور کرایا جاتا ہے اور اسے باضابطہ آڈٹ بھی کرایا جاتا ہے۔

ملی اور اجتماعی دائروں میں جامعہ دارالعلوم کی تاریخی خدمات...... اس کے ساتھ دارالعلوم کی سرگرمیاں محض درس وتدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس نے قومی، ملکی اور سیاسی معاملات میں بھی اندرون حدودِ شرعیہ بڑھ چڑھ کر قائدانہ حصہ لیا اور لے رہا ہے، اس کے اکابر کے کارنامے بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ علیہما نے جہاد اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جو نقش اپنے پاکیزہ لہو سے کھینچا تھا، وہ ہر وقت علماء دیوبند کے سامنے ہے۔

۱۸۵۷ء میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم اور حضرت قطبِ وقت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سرپرستِ اعظم دارالعلوم نے شاملی کے میدان میں تلوار اٹھائی اور انگریزوں سے جنگ کی، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مجاہدین کے قائد تھے، پھر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند اسی قیادت کو لے کر اٹھے اور آزادیٔ ہند کے لئے وہی ۱۹۱۵ء کی ریشمی خط کی انقلابی تحریک کے قائد تھے، جس کا مرکز افغانستان اور کثیر التعداد سینٹر مختلف ملکوں میں قائم تھے، مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور احمد انصاری، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے سرفروش مجاہد ان کے دست راست تھے، اس راہ میں ہزاروں، شہید ہوئے، ہزاروں غازی بنے، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پانچ سال تک فرنگی قید میں مالٹا رہے اور رہا ہونے کے بعد ہندوستان پہنچ کر اسی جوش جہاد سے جمعیت علماء ہند کی سرپرستی فرمائی اور آپ کے بعد یہ جماعت فضلاءِ دارالعلوم ہی کے تحت مصروفِ خدمت رہی۔

۱۹۲۰ کی تحریکِ خلافت اور پھر ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں کتنے ہی علماء نے قائدانہ حصہ لیا، یہ اسی موروثی جذبہ اور عمل کا اثر تھا کہ جب ملک معظم عبدالعزیز آل سعود نے جزیرہ عرب میں اسلامی حکومت کا پرداز ڈالا تو علماء دیوبند نے سب سے پہلے اس کی حمایت کی اور دیوبند سے متعدد علماء اس کی تائید کے لئے سفر کر کے حجاز پہنچے، اسی طرح ماضی قریب میں جب بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی تحریک اٹھی تو صیہونی اور برطانوی سامراج کے خلاف علمائے دیوبند ہی کا فتویٰ سب سے پہلے صادر ہوا اور ان مسائل میں دارالعلوم ہی نے تمام مسلمانوں کو اختلاف سے بالاتر ہو کر ایک محاذ پر جمع کیا اور اجتماعی احتجاج عمل میں آیا۔

اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں پر مظالم اور انہیں پسماندہ ومتفرق کرنے کے لئے جب بھی نزاعی مسائل

کھڑے کئے گئے تو ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے بھی فضلائے دیوبند آگے بڑھے۔ چناں چہ مسلمانوں میں تنظیمی اور طبقاتی اتحاد پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قائم کی گئی، جس کی سربراہی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فاضل دیوبند رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم کر رہے ہیں، اس لئے اگر دارالعلوم کی یہ خواہش ہو کہ عالم اسلام کے رہنما، تعلیمی، علمی، تمدنی اور اجتماعی میدان میں علمائے دیوبند اور مسلمانانِ ہند سے تعاون کریں، تو اس کی ہمہ جہت روشن تاریخ کی روشنی میں یہ خواہش یقیناً بجا اور برمحل ہوگی۔ حاصل یہ کہ جب بھی کوئی سیاسی فتنہ اٹھا جس سے مسلمانوں کے اجتماعی یا مذہبی معاملات مجروح ہونے کا اندیشہ ہوا، تو علماء دیوبند نے بیرونِ ملک بھی اس کے سدِ باب میں وہی پامردی دکھلائی جو اندرونِ ملک ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز رہی۔

جامعہ دارالعلوم اور باطل تحریکات کا مقابلہ...... انگریزی حکومت کے ایماء سے اس ملک میں بہت سی گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں، جن کے ذریعہ یہاں کے باشندوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کو راہِ راست سے ڈگمگانے کی کوششیں کی گئیں، مگر دارالعلوم اور اس کے فضلاء نے پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بحمد اللہ ان کی کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکمت کی دسیسہ کاریوں سے بہت حد تک محفوظ رہے۔ بعض باطل پسندانہ تحریکات حضرت بانی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں بڑے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئیں اور ان کی جانب سے اسلامی احکام و مسائل پر جاہلانہ اور غلط اعتراضات کی بوچھاڑ کی گئی لیکن حضرت بانی دارالعلوم اور پھر ان کے تلامذہ نے مناظروں اور تصانیف کے ذریعہ ان کے خلاف ایک مضبوط بند باندھ کر انہیں ختم کر دیا۔

انکارِ حدیث کا فتنہ ابھرا تو انہیں فضلائے دیوبند نے جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور راقم الحروف (رحمۃ اللہ علیہ) نے نہایت مدلّل کتابیں تالیف کر کے اس کا سدِ باب کیا، اسی طرح قادیانیت اور دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اسکیم تیار ہوئی تو دارالعلوم دیوبند نے پچاس سے زیادہ فضلاء اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتار کر ان کی مکروہ سازشوں کا قلع قمع کیا۔ فقہیاتِ اسلامی میں مداخلت کا فتنہ اٹھا تو دارالعلوم ہی نے قضاءِ شرعی قائم کرنے کی تحریک اٹھائی اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خامس دارالعلوم نے پانچ سو علماء کے دستخطوں سے برطانوی حکومت کے سامنے محکمۂ قضاءِ شرعی کا مطالبہ پیش کر دیا جس سے یہ باطل تحریک مضمحل ہوگئی۔ ابھی ماضی قریب میں دوبارہ اس تحریک نے ترمیم فقہ کا روپ اختیار کیا اور عائلی قوانین اور فقہ میں ترمیم کرنے کی آوازیں بلند ہوئی تو دارالعلوم ہی کی تحریک پر بمبئی میں تمام مسلم فرقوں کا کنونشن بلایا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا جس کی صدارت بالاتفاق مہتمم حال دارالعلوم دیوبند کے سپرد کی اور بورڈ کی متحدہ احتجاجی آواز پر حکومت نے اعلان کیا کہ وہ خود مسلم پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی۔

غرض برِ صغیر میں جامعہ دیوبند کے ان علماءِ ربانیین رحمۃ اللہ علیہ اور فضلاءِ صالحین رحمۃ اللہ علیہ نے درس و

تدریس کے مشاغل کے ساتھ مذہبی اور دینی فضاء کو کبھی مکدّر اور زہر آلود نہیں ہونے دیا، بلکہ قلوب اور دماغوں کو جلا بخشنے کے لئے مدلّل تحریر وکتاب اور تقریر وخطاب کے ذریعہ ایک زبردست پشتہ بنا کر ان سیلابوں پر بند باندھ دیا۔ اس طرح برصغیر کے مشرکانہ ماحول میں اس نے دین توحید کو اس کی اصلی صورت میں قائم وبرقرار رکھا ہے۔ اور آج یہ جامعہ اس بین الاوطانی اجتماع میں انہی خدمات پر ایک بڑی حسی دلیل کے طور پر اپنے ہزاروں فضلاء کو پیش کرنے میں شکر آمیز فخر محسوس کر رہا ہے کہ جن کی خدمات سے اطراف عالم میں دین پھیلا اور پھیل رہا ہے۔

عصری بین الاقوامیّت کے تقاضے...... یہ علمی اور عملی ثمرات اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا پھیلی ہوئی تھی اور ہر ملک کا دائرۂ عمل اپنی ہی حدود تک محدود رہتا تھا، لیکن آج وسائل نقل وحمل اور ذرائع علم وخبر کے وسیع تر ہو جانے کے سبب یہ پوری دنیا سمٹ کر ایک عائلہ اور قبیلہ بن چکی ہے اور کوئی بھی ملک محض اپنی داخلی سیاست سے اپنا کام نہیں چلا سکتا جب تک کہ اس کے روابط دوسرے تمام ممالک سے مستحکم نہ ہوں، اسی لحاظ سے آج دنیا کے سارے ممالک ملک واحد بن چکے ہیں اور پوری دنیا ایک نقطہ پر آ گئی ہے، اس لئے سیاسی امور ہوں یا انتظامی، سب بین الاقوامی رنگ ہی سے نمایاں ہو رہے ہیں، اس لئے ہمیں بھی مقامیّت سے آگے بڑھ کر بین لاقوامیّت کے دائرہ میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، گو دارالعلوم کا مزاج ابتداء ہی سے بین الاقوامی ہے، اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات واجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا، مئوتمر عالم اسلامی مصر، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، موتمر السیرت والسنۃ ''دوحہ وقطر'' موتمر ریاض میں اس کے نمائندگان نے شرکت کی اور اب عرب اور امارات متحدہ بھیجا، نیز رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش پر یہاں سے تربیت الاطفال کے سلسلے میں متعدد اہلِ قلم نے مقالات ارسال کئے۔ اور آج بھی دارالعلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم پر آشکارا کیا جائے، نیز اسلام پر وارد کئے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔

بلاشبہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ بین الاوطانی اشتراک کے ساتھ اسلامی منطقوں کے رجالِ علم وفضل کو تکلیف دی جائے اور دارالعلوم کی خدمات پیش کر کے ان کی آراءِ گرامی سے استفادہ کیا جائے، ان خدمات کے پیش کرنے کا منشاء ہرگز ہرگز اس جامعہ کا کوئی تفوق جتانا یا جماعتی خودستائی کرنا نہیں حاشا وکلا، بلکہ یہ ہے کہ ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے آپ حضرات کے مشورہ وتعاون سے ان تبلیغی تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کی تعلیم کا کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی پشت پر سارے اسلامی منطقوں کی اجتماعی قوت کارفرما ہو، جس سے یہ دینی مقاصد اجتماعی انداز سے دنیا کے سامنے آ سکیں اور عام مسلمانوں کی زندگیوں پر کوئی عملی اثر ڈال سکیں، اور وہ ایمانی اخوت، باہمی تعاون، علمی اشتراک اور فکری یکسانیٔ ہمت کے ساتھ اجتماعی عزائم وخدمات کو بروئے کار لا سکیں اور ان میں دینی دعوت کا وہ جذبہ ابھر آئے جو قرنِ اوّل کا نصبُ العین تھا کہ اس کے بغیر ان کی وہ پست ہمتی دور نہیں

ہوسکتی، جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے۔

اگر اسلام کا مقصد واقعی اقوام دنیا کی اصلاح اور انہیں خدا پرستی پر لانا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نام لیواؤں کا یہ مقصد نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد، آج اجتماعی آواز، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ حقیقت آج کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ آج کوئی آواز بھی اس وقت تک وقیع نہیں بنتی جب تک کہ اس میں ہمہ گیری اور عالمیّت نہ ہو، اس لئے کہ آج کی سیاست ہے تو بین الاقوامی، تمدن و معاشرت ہے تو بین الاقوامی، تجارت وصنعت ہے تو بین الاقوامی، صلح و جنگ ہے تو بین الاقوامی، حتیٰ کہ کھیل کود بھی ہیں تو بین الاقوامی۔ اس لئے قدرتی طور پر طبائع میں یہ جذبہ آنا ہی چاہئے کہ دین کی دعوت اور اصلاحی آواز ہو تو وہ بھی بین الاقوامی ہی ہو، بالخصوص جبکہ اسلام خود ہی اپنی ذات سے بین الاقوامی بن کر دنیا میں آیا ہے جو ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے بلکہ اس نے دنیا میں بین الاقوامیت کا پردار ز ڈالا ہے۔ اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں۔ ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ① کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آچکا ہے اور وہ یہی وقت ہے کہ جس میں فطرت اسلام پکار رہی ہے کہ یہ بین الاقوامی دین اور اس کے انسانی فلاح کے ضامن بین الاقوامی مقاصد اور اس کی ہمہ گیر ثقافت بھی عالمی رنگ سے دنیا کے سامنے آئے۔

توحید وسنّت کی حامل جماعت تیار کرنے کے بعد حالاتِ وقت کے پیش نظر جامعہ دار العلوم کی یہ خواہش بجا اور برمحل ہے کہ اس نئی صدی میں امتِ مسلمہ کے عالمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے اسے اجتماعی بنائیں تا کہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔

عالمی دعوت کے لئے تعلیمی جامعات میں ارتباط کی ضرورت...... ہمارے نزدیک قابل غور ضروری مسائل میں سب زیادہ اہم مسئلہ عالمی دعوتِ اسلام اور بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کن کن راستوں سے بگاڑ آرہا ہے اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے، عموماً بے پڑھے لوگوں کا بگاڑ رسوم و رواجات اور کورانہ تقلید سے نشونما پا رہا ہے، جس کا انسداد تبلیغی ذریعہ سے ممکن ہے۔ اور برسرِ اقتدار طبقوں کا بگاڑ جاہ پسندی اور ہواءِ نفسانی سے ابھرا ہوا ہے جس کا حل ان سے ہمدردانہ رابطہ قائم کر کے انہیں راہ پر لگانا ہے، اس لئے ان سب کے لئے نفسیات شناس ایسے مخلص فکری مصلحوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک کے برسر اقتدار طبقہ کو اس کے اقتدار کی برقراری کا یقین دلا کر ان کی شخصی اصلاح کے ساتھ ان عمومی مقاصد دعوت کے لئے انہیں آمادہ بھی کرسکیں اور ان سے کام بھی لے سکیں۔

بہر حال تقسیم عمل کے اصول پر ہر طبقہ میں اسی کے مناسب حال اصلاحی افراد کی تشخیص عمل میں لانے کا مسئلہ آپ کے غور فکر کا محتاج ہے، ساتھ ہی ان مسائل سے متعلق مالیاتی مصارف اور ایک بین الملّی مشترک فنڈ کا وجود

① پارہ: ۲۸، سورۃ الصف، الآیۃ: ۹۔

بھی بھی اپنی طبعی اہمیت کے ساتھ محتاج اعتناء ہے، اس عظیم دینی وملی مقصد وخدمت کے لئے یہ مرکزی جامعہ اپنی تمام تر عملی اور علمی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہے، ہم اس کے آرزومند ہیں کہ ارباب علم وفضل ہمیں اس باب میں بھی اپنے موقر مشوروں سے نوازیں کہ اس مرکزی جامعہ کا عالم اسلام کے تعلیمی جامعات ومعاہد سے ممکن حد تک تعلیمی یکسانی کے ساتھ اس طرح قریبی رابطہ قائم ہو کہ جس سے طلبہ کے بین الجامعاتی تبادلے اور سندات کے معادلے کے مسائل سہل ہو جائیں اور عالمگیر سطح پر دینی خدمات کی راہیں ہموار ہو جائیں، غور کیا جائے تو فی زمانہ اداری قوت ایک بڑی قوت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے تعلیمی، تہذیبی اور تبلیغی معیار سے جوڑ سکتی ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ادارے جہاں ایک دوسرے کی خدمات سے باخبر رہنے کے ذرائع مہیا کریں، وہیں معاندین اسلام کی لڑیری راہوں سے آنے والی دسیسہ کاریوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھنے اور بروقت اس کا سدِ باب کرنے کے لئے اپنے ذرائع ابلاغ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔

اس ناچیز نے دارالعلوم کی ماضی کی خدمات کے اجمالی تذکرہ اور مستقبل کے منصوبوں کی پیش کش کے ساتھ چند مشورہ طلب نقاط بھی پیش کر دینے ضروری سمجھے، تاکہ اس بامقصد اجلاس کے اثرات آئندہ نسلوں کے لئے دیرپا اور خوش آئند ثابت ہوں۔ اس کے بعد میں اس سمع خراشی پر معذرت خواہی کے ساتھ صدرِ معظم اور مہمانانِ کرام اور معزز حاضرین کا تہہ دل سے مکرر شکریہ تشریف آوری پر ان افتتاحی اور خیر مقدمی کلمات کو ختم کرتا ہوں۔

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ کَثِیْرًا اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

دعا جو ودعا گو

محمد طیّب

رئیس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ ۱۳ فروری ۱۹۸۰ء

اساسِ توحید

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿ قَالَ أَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ①

مدارِ حیاتِ انسانی...... بزرگانِ محترم! کائنات میں زمین سے لے کر جس قدر بھی مخلوقات ہیں اور جس قدر اللہ نے اشیاء پیدا فرمائی ہیں وہ سب انسان کے لئے بنائی ہیں اور انسان کے کارآمد ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انسان کا نفع یا نقصان متعلق نہ ہو۔ انسانی زندگی کا دارومدار انہی کائناتی اشیاء کے اوپر ہے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کس چیز کے اوپر رہے، گزر بسر کرے؟ اگر آسمان اور اس میں ستارے، چاند اور سورج نہ ہو تو روشنی کیسے ہو؟ سورج کی گرمی نہ ہو تو کھیتیاں کیسے پکیں، چاند کی ٹھنڈک نہ ہو تو پھلوں میں رس کیسے پیدا ہو؟ اور ہڈیوں میں گودا کیسے پیدا ہو؟ ستارے نہ ہوں تو راستوں کا تعین کیسے ہو؟ جہاز رانی کس طرح سے ہو؟ سمتیں کیسے معلوم ہوں؟ غرض زمین سے لے کر آسمان تک کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کے کارآمد نہ ہو۔

حیوانات ہیں تو وہ انسان کے کام آتے ہیں، کوئی انسان کو سواری دیتا ہے، کوئی انسان کے کھانے کے کام میں آتا ہے، کسی جانور کی ہڈیاں انسان کو کام دیتی ہیں، کسی جانور کا چمڑہ کام آتا ہے، چمڑوں کے اوپر کا اون اور پشمینہ انسان کے کام میں آتا ہے، غرض کوئی جانور ایسا نہیں جس سے انسان کا نفع متعلق نہ ہو۔

درختوں اور جڑی بوٹیوں میں کوئی درخت اور جڑی بوٹی ایسی نہیں ہے جو انسان کے نفع کے لئے نہ ہو۔ سب سے زیادہ وہ چیز جس کو انسان نفرت سے پھینک دیتا ہے وہ فضلات، گندگی اور نجاست ہے، وہ بھی انسان کے کارآمد ہے، اگر کھاد نہ ہو انسان کی کھیتی نہ اگے، تو وہ بھی کام دیتی ہے اور اس کی بھی دنیا میں قدر و قیمت ہے۔ چناں چہ

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶، ۶۷.

کھاد بھی ہزاروں روپے کے حساب سے بکتی ہے اور انسان کے کام آتی ہے۔ تو پاک چیز ہو یا ناپاک چیز ہو، انسان کے لئے کارآمد ہے اور انسان کی زندگی ان چیزوں کے اوپر اٹکی ہوئی ہے۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی نہ ہوگی انسان کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ سورج نہ ہو تب زندگی ختم، چاند نہ ہو تب ختم، ہوا نہ تب ختم، زمین نہ ہو تب ختم، اس کی غذائیں نہ ہوں تب ختم، دوائیں نہ ہوں تب ختم، تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کی زندگی اس پر اٹکی ہوئی نہ ہو۔

کائنات کی انسان سے بے تعلقی ...... لیکن ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی ہو، اگر سارے انسان ختم ہو جائیں تو سورج کا کچھ نہیں بگڑتا، چاند کا کچھ نہیں بگڑے گا، ایک بھی انسان باقی نہ رہے تو زمین کا کچھ بھی نقصان نہیں، آسمان کا کوئی نقصان نہیں، پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ درخت اور جڑی بوٹیاں اپنی جگہ قائم رہیں گی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کے کام کی نہ ہو اور انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا انسان بیکار پیدا کیا گیا ہے۔ جب یہ نہ زمین کے کام کا، نہ چاند کے کام کا، نہ آسمان کے کام کا، آخر یہ انسان کس کام کے لئے بنایا گیا ہے، ان میں سے تو کسی کے کام کا نہیں ہے۔ کسی کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ انسان کو بیکار پیدا کیا گیا ہے تو اس سے اللہ کی حکمت پر حرف آتا ہے حالاں کہ وہ اس سے بری ہے کہ اس کی حکمت پر کوئی عیب یا حرف آئے۔ جب کھاد جیسی گندی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی تو کیا انسان جیسی اشرف المخلوقات کو اللہ نے بیکار پیدا کیا ہے؟ یہ کس مرض کی دوا ہے، غرض جب کائنات میں کوئی چیز بے کار نہیں تو انسان بھی بیکار تو نہیں ہو سکتا جبکہ یہ سب سے اونچا اور افضل ہے۔

تخلیق کائنات وانسان میں باہمی ارتباط ...... اگر ان میں سے کسی چیز کے کام کا نہیں، پھر کس کے کام کا ہے۔ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب مخلوق میں سے کسی کے کام نہیں تو پھر خالق کے کام کا ہوگا۔ اور کسی کے کام کا نہیں ہو سکتا۔ اب آگے یہ سوال رہ جاتا ہے کہ خالق کا کون سا کام انسان کے اوپر اٹکا ہوا ہے؟ اس کی مخلوق کا تو کوئی کام اٹکا ہوا نہیں، تو خالق جو غنی ہے اور ہر برائی اور محتاجگی سے بری ہے، اس کا کون سا کام اٹکا ہوا ہے۔ اس کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے جس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے اور طلب کیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے خزانے میں ہر چیز ہے، اس کے خزانے بھرپور ہیں مگر ایک چیز اس کے خزانے میں نہیں ہے، اس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے۔ اللہ کے خزانے میں علم ہے، کمال ہے، عروج ہے، رفعت اور بلندی ہے، غناء اور استغناء ہے، مگر اللہ کے یہاں محتاجگی نہیں ہے۔ ذلت نہیں ہے، جھکنا نہیں ہے، پس ماندگی نہیں ہے، انسان کو اس لئے بنایا گیا کہ یہ اس کے سامنے جھکے، اپنی ذلت اس کے سامنے پیش کرے اور اپنی محتاجگی نمایاں کرے تاکہ اس کی عزت وعظمت دنیا کے اوپر واضح ہو اور اس کی رفعت وسربلندی دنیا کے اوپر نمایاں ہو جائے، تو انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جھکے یعنی عبادت کرے، عبادت کے معنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں۔ انسان کو اللہ نے اس لئے بنایا کہ یہ اللہ کے آگے اپنی انتہائی ذلت پیش کرے تاکہ اللہ کی انتہائی عزت سب کے سامنے نمایاں ہو جائے۔ یہ

یوں عرض کرے کہ ''اے اللہ! جیسے تیری عزت کی کوئی حدّ ونہایت نہیں ہے، تیرے سامنے میں وہ ذلت پیش کرتا ہوں کہ اس ذلت کی بھی کوئی حدّ ونہایت نہیں ہے انتہائی طور پر تیرے آگے پست ہوتا ہوں''۔

انسان میں سب سے زیادہ عزت کی چیز اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ اگر کوئی ذلیل بن جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ ''فلاں کی ناک کٹ گئی'' یعنی وہ ذلیل ہوگیا، فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا، یعنی اسے ذلت پہنچ گئی، تو ناک اور پیشانی سے زیادہ بلند اور باعزت چیز انسان میں اور کوئی نہیں، انہی کو اللہ کے سامنے زمین پر رگڑا جاتا ہے تاکہ انسان کی انتہائی ذلت ظاہر ہو جائے۔

غرض اللہ عزتِ مطلقہ رکھتا ہے اس کے سامنے جو مخلوق ذلتِ مطلقہ پیش کرے وہ انسان ہے، اس کے بنانے کی غرض وغایت یہ ہے کہ یہ اللہ کے آگے جھکے اور ساری کائنات اس کے آگے جھکے، ہر چیز اس کے آگے چاکر اور نوکر بن کر پیش ہو، اور یہ اللہ کا نوکر بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو۔

''اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اَنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ.'' ① ''ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی اور تم آخرت کے لئے بنائے گئے'' تم دنیا کے لئے نہیں بنائے گئے، دنیا تو تمہارے لئے بنائی گئی ہے، تم درخت اور پتھروں کے لئے نہیں ہو، درخت اور پتھر تمہاری چاکری کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تم چاند اور سورج کے لئے نہیں، چاند اور سورج تمہاری خدمت کے لئے بنائے گئے ﴿خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ ② ''جو کچھ زمین میں ہے وہ سب انسان کے لئے ہے اور انسان پروردگار کے لئے ہے''۔

کائنات میں انسان کا مرتبہ...... اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا کہ ایک شخص عظیم الشان بلڈنگ تیار کرے، کیوں؟ اس لئے کہ اس نے ایک عورت سے نکاح کرنا چاہا جس سے اس کو محبت پیدا ہوئی۔ نکاح کر کے اس نے عورت کی ضرورت سے ایک بلڈنگ بنائی۔ تاکہ وہ راحت سے اس میں رہے اور گزر بسر کرے۔

بلڈنگ کے اندر اس نے ملازم رکھے، فرّاش رکھے، جھاڑو اور صفائی کرنے والے رکھے تاکہ مکان صاف ستھرا رہے، اس کی بیوی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اس نے باورچی رکھے تاکہ بیوی بھوکی نہ مرے، اس کے لئے کھانا پکائیں، اس نے مشعلچی رکھے تاکہ رات کو مکان میں روشنی کریں، تاکہ اندھیرے میں رات کو اسے تکلیف نہ پہنچے۔ غرض جتنی بھی خدمت کی اشیاء ہیں وہ سب مہیا کیں، اور ہر خدمت کے خادم مہیا کئے۔ یہ سب بیوی کے لئے، اور بیوی کاہے کے لئے ہے؟

بیوی ان خادموں کے لئے نہیں ہے۔ فرّاش اور باورچی کے لئے نہیں ہے، مالک نے بیوی اپنے لئے

---

① شعب الایمان للامام البیہقی، النوع التاسع والثلاثون من الایمان، ج: ۲۲، ص: ۲، رقم: ۱۰۱۸۵. علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں: اخرجہ البیہقی فی الشعب من حدیث الحسن عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفیہ انقطاع دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۷ ص: ۲۶۲. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۹.

رکھی ہے تاکہ ساری ضرورتیں اور خدمتیں بیوی کی ہوں اور بیوی میرے کام آئے۔ اگر بیوی خاوند کی خدمت سے انکار کردے یا سرکشی دکھلانے لگے یا خاوند کو آنکھ دکھانے لگے۔ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیوی کو طلاق دے گا بلکہ گولی مار دے گا، اس مکان کو بھی ترک کرے گا، اسے بڑھادے گا، خادم بھی ختم کردے گا، اس کی ضرورت سے یہ رکھے تھے، جب یہ میری وفادار نہ ہوئی تو مجھے نہ بلڈنگ کی ضرورت ہے نہ خادموں کی ضرورت ہے، نہ فرّاش کی ضرورت ہے، اس پر تین طلاق، یہ اس قابل نہیں ہے کہ یہاں رہے بلکہ گولی ماردینے کے قابل ہے۔

خالقِ کائنات کا انسان سے خصوصی معاملہ...... یہی صورت بعینہٖ انسان کی ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی محبوب ترین مخلوق بنایا، اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا کہ کائنات کی کسی چیز کے ساتھ اس محبت کا برتاؤ نہیں کیا، عزت اسے دی، کھانے پینے کی اشیاء اسے دیں، دریا اور پہاڑ اس کے لئے بنائے، آسمان وزمین کی بلڈنگ تیار کی، اس میں سورج اور چاند کے انڈے لٹکائے تاکہ روشنی ہو، اس میں بادل بنائے تاکہ پانی برسے، ہوائیں چلائیں تاکہ مکان صاف ستھرا رہے۔ یہ سب کچھ انسان کے لئے اور انسان مالک کے لئے، اگر مالک کے کام نہیں آئے گا تو یہ انسان گولی ماردینے کے قابل ہوگا۔ اور اگر سارے انسان مل کر سرکش بن جائیں تو اس خیمے ہی کو بڑھا دیا جائے گا کہ نہ آسمان کی ضرورت ہے نہ زمین کی، جب یہ ہی قابلِ گردن زدنی بن گیا تو اب اس کے خدّام کی ضرورت باقی نہیں رہی، تو یہ انسان کا نقشہ ہے کہ انسان اللہ کے لئے بنایا گیا ہے، کائنات انسان کے لئے بنائی گئی۔ ''اِنَّ الدُّنۡیَا خُلِقَتۡ لَکُمۡ وَ اَنَّکُمۡ خُلِقۡتُمۡ لِلۡاٰخِرَۃِ۔''

اب اگر وہی جس کے لئے بلڈنگ بنائی تھی اور خادم رکھے تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ خاوند کی خدمت نہ کرے چھوڑے، تب بھی قابلِ گردن زدنی تھی۔ اور اگر اس سے بڑھ کر بیوی یہ حرکت کرے کہ کہیں اس نے کسی خادم سے آنکھ ملانی شروع کردی، کہیں اس نے فرّاش سے آشنائی شروع کردی، کہیں باورچیوں سے اس نے دل لگی کی باتیں شروع کردیں تو اب زندہ رکھنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ خاوند اس کو گولی ماردے گا، کہ یہ تو بدکار اور فاحشہ ہے، یہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے زندہ چھوڑا جائے۔ جہاں تک میری خدمت ترک کردی تھی، بری تو بنتی تھی مگر خیر۔ چھوڑ دینے کے قابل تھی، اسے چھوڑا جاسکتا تھا۔ جب مجھے چھوڑ کر اس نے دوسروں سے آشنائی شروع کی۔ اور وہ بھی اپنے باندی غلاموں سے، اب تو یہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ کہ اللہ نے یہ بلڈنگ بنائی، اس میں خادم رکھے۔ کس طرح سے خادم رکھے؟

کائناتی خدّام...... فرّاش رکھے تاکہ مکان صاف ہو۔ یہ ہوا جو ہے یہ اس کائنات کی فرّاش ہی تو ہے۔ اگر ہوائیں نہ چلیں تو کوڑا کرکٹ نہیں جاسکتا، تو اس بلڈنگ کے صاف کرنے کے لئے اللہ نے ہوائیں پیدا کیں تاکہ فرّاش کا کام دیں۔ اور مکان کو صاف ستھرا رکھیں۔ یہ سورج کیا ہے۔؟ یہ آپ کا باورچی ہے جو آپ کی کھیتیاں پکاتا ہے، اس کی گرمی سے آپ کے دانے پکتے ہیں اور یوں سمجھنا چاہئے کہ سورج فی الحقیقت ایک باورچی ہے جو اللہ

نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔

یہ بادل کیا ہیں؟ یہ بہشتی ہیں جو پانی بھر بھر کے لاتے ہیں اور آپ کی کائنات کو سیراب کرتے ہیں، ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے کہ اس وقت آ کے آپ کے تالابوں کو بھریں۔ آپ کی نہروں کو چلائیں۔ اور آپ کے کنوؤں کو پانی دیں۔ تاکہ سال بھر تک یہ خزانہ پانی سے بھر پور رہے اور انسان کو تکلیف نہ ہو۔ تو کوئی بہشتی ہے، کوئی باورچی ہے، کوئی فراش ہے جو کام کر رہا ہے۔ اب اگر یہ انسان مالک کو چھوڑ کر کہیں باورچی سے آنکھ ملانا شروع کرے اور سورج کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے اور باروچی کے آگے جھکنے لگے، کہیں فراش جو ہوا ہے اس کے سامنے سجدہ کرنے لگے اور ہوا پرستی کرے، کہیں آپ کے لئے پانی برسانے کا بادل سامنے آئے، اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو اور منتیں مانگنے لگے۔ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے بیوی بہشتی سے آشنائی کرلے۔ یا فراش سے آشنائی کرلے۔ تو گولی ماردینے کے قابل ہوگی، اس قابل نہیں ہے کہ اسے بلڈنگ میں رکھا جائے۔

مخدوم کائنات کی بے عقلی...... بلکہ جب وہ اس درجہ پر ہے تو یہ بلڈنگ بھی منحوس ہے۔ اسے بھی بڑھادو۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ ساری چیزیں اس کے لئے ہوں اور یہ اللہ کے لئے ہو۔ یہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہ کرے۔ اس سے زیادہ انسان کی کم حوصلگی نہیں ہوگی کہ وہ آگ کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے، وہ پانی کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے وہ سورج اور چاند کے آگے جھکنے لگے، جو باندی، غلام اور خادم بنائے گئے تھے ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا، کھڑا ہونا قلبِ موضوع ہے کہ جو مخدوم تھا وہ خادم بن گیا، جو خادم تھا اسے مخدوم بنالیا گیا۔ گویا عقل کو انسان نے الٹ دیا کہ جس کو اپنے سامنے جھکانا چاہئے تھا۔ اس کے سامنے یہ خود جھک گیا، یہ تو وہ ہیں کہ جب اللہ والوں کو ضرورت پیش آتی ہے تو یہ خدمت کرتے ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے، اسے پھٹتے بن پڑی، حضرت یوشع ابن نون علیہ الصلوٰۃ السلام کے لئے جنگ کے موقع پر سورج روک دیا گیا تاکہ دن دن میں فتح ہوجائے، تو دن کو ٹھہرا دیا گیا تھا، سورج خادم تھا تو اسے لئے روکا گیا۔ لیکن حضرت یوشع علیہ السلام کے کام کو نہیں روکا گیا۔ کہ وہ مقصود تھا اور سورج اس کا وسیلہ تھا۔ وسیلے پر پابندی عائد کی گئی مقصود پر پابندی عائد نہیں کی گئی۔ غرض بادل ان کے لئے آتے ہیں، سورج ان کی خدمت کے لئے آتا ہے، چاند ان کے سامنے اطاعت کرتا ہے، ذرّاتِ کائنات اطاعت کرتے ہیں۔

کائنات کا افادی پہلو اور اس کا مقصد...... انسان کو دیکھو سمندروں میں اس کا تصرف ہے، پہاڑوں میں اس کا تصرف ہے، زمین اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے، چاہے زمین کو کھودے، چاہے سڑکیں بنائے، فرمایا گیا ﴿هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ﴾ ①

''وہ، وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے ذلیل بنادیا، تاکہ اس میں کھیتی کرو، دانہ ڈالو، سڑکیں بناؤ، کنویں کھودو، ذلیل

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵.

ہے زمین چوں نہیں کر سکتی، انسان کے سامنے اُف نہیں کر سکتی''۔ مگر انسان کس لئے ہے؟ ﴿وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ﴾ تا کہ یاد رکھے کہ اسے اپنے مالک کے آگے جانا ہے اور اس کے آگے جوابدہی کرنی ہے۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ حشر و نشر کو سوچے، قیامت کے دن کو سوچے، اور ان چیزوں کا کام یہ ہے کہ انسان کی چاکری میں لگی رہیں، جو خدمت یہ لے، اف نہ کریں، چپ چاپ اس کے کام میں لگی رہیں۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ ① یہ چوپائے اور مویشی ﴿خَلَقَهَا لَكُمْ﴾ تمہارے لئے پیدا کئے ہیں، ﴿فِيْهَا دِفْءٌ﴾ بعضوں سے تم گرمی حاصل کرتے ہو، اونی کپڑے بنا کر ان سے گرمی حاصل کرتے ہو۔ ﴿وَمَنَافِعُ﴾ اور مختلف منافع ہیں ﴿وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ اور بعض جانوروں کے گوشت سے تمہارے کھانے پینے کا تعلق ہے۔ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ② بعضوں سے تم کرّ و فرّ اور حشم و خدم حاصل کرتے ہو جب ہاتھی اور گھوڑوں پر جھولیں ڈال کر جلوس نکالتے ہو اور اپنا کرّ و فرّ دکھلاتے ہو اور اپنے حشم و خدم کی نمائش کرتے ہو۔

اور فرمایا ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ ③ بعضے جانور وہ ہیں کہ ان پر مال کو لاد کر ایک بستی سے دوسری بستی تک لے جاتے ہو۔ غرض مختلف منافع فرمائے گئے۔ ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ④ یہ وہ چیزیں ہیں کہ آج سواریاں بن گئی ہیں فرماتے ہیں، اور تمہیں کیا خبر ہے کہ آئندہ ہم نئی نئی قسم کی سواریاں پیدا کر دیں جن پر چڑھ کر انسان منزلیں طے کریں۔ چناں چہ موٹر سائیکلیں ہوائی جہاز اور دُخانی جہاز۔ غرض مختلف قسم کی سواریاں انسان کے لئے نکلیں تا کہ وہ احترام کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو۔ چوپائے اور جانور کو یہ عزت نہیں بخشی گئی، چوپایا جہاں بھی جائے گا اپنے پیروں سے چل کر جائے گا اور انسان سوار ہو کر جائے گا، کبھی چوپائے کے سر پر، کبھی جمادات کے سر پر اور کبھی نباتات کے سر پر، ہر چیز انسان کے لئے سواری بنا دی گئی۔ بہر حال حاصل یہ نکلا کہ انسان اللہ کے لئے ہے اور کائنات انسان کے لئے ہے۔

معیارِ عبادت...... یہ اللہ کے لئے کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نفع اور نقصان کے معیار پر کی جاتی ہے، جس کے قبضے میں انسان کا نفع اور نقصان ہے، اس کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کے ہاتھ میں انسان کے نفع اور نقصان کی باگ ڈور ہے، نفع دے جب بھی اس کے قبضے میں ہے، نقصان پہنچائے جب بھی اس کے قبضے میں ہے۔ خواہ نعمتیں دے دے، خواہ مصیبت ڈال دے، نعمت دیکر چھین لے، یا چھینی ہوئی نعمت پھر واپس کر دے، ہر صورت میں اس کے دستِ قدرت میں ہے۔

معطیٔ حیات...... مادی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت انسان کے لئے زندگی ہے، اس پر انسان کا کوئی بس

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۵۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۶۔
③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۔ ④ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۔

نہیں ہے، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے زندگی دے دے اور جب چاہے زندگی چھین لے۔ جب تک زندگی نہیں آتی، ایک انسان چاہتا ہے کہ میری اولاد ہو جائے۔ لیکن زندگی ہاتھ میں نہیں ہے تو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے کہ جب چاہے پیدا کرے۔ وہ دینا چاہے تو دے دے، نہ دینا چاہے تو انسان کو تمنائیں کرتے کرتے کرکے اور اسباب مہیا کرتے کرتے برس گزر جاتے ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی، اس لئے کہ زندگی ہاتھ میں نہیں ہے، غرض زندگی کی نعمت اسی کے ید قدرت میں ہے۔ جب چھننے پر آتی ہے اور موت کا وقت آتا ہے تو آدمی ساری دنیا کے خزانے علاج پر صرف کر دے لیکن ایک منٹ کے لئے بھی آدمی زندگی کو روک نہیں سکتا۔ جو اس کے جانے کا وقت ہے اس پر جا کر رہتی ہے، غرض نہ زندگی کو لانا قبضے میں ہے، نہ روکنا قبضے میں اور نہ واپس لے آنا قبضے میں ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ سب سے بڑا نافع ہے جس کے قبضے میں نفع کی باگ ڈور ہے۔

معطیٔ صحت...... آپ زندہ موجود ہیں۔ زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت تندرستی ہے۔ تندرستی آپ کے بس کی چیز نہیں ہے، جب تک مالک تندرست رکھنا چاہے آدمی تندرست رہتا ہے۔ چھیننا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ لوگ اسباب مہیا کرتے ہیں اور صحت کا تحفظ کرتے ہیں لیکن قابو نہیں ہے کہ اس کو حاصل کر لیں، آج شہر کے اندر انفلوئنزا پھیلا ہوا ہے۔ گورنمنٹ بھی سعی کر رہی ہے۔ مونسپلٹیاں بھی سعی کر رہی ہیں۔ شخصی طور پر ڈاکٹر بھی مطب کھولے ہوئے ہیں۔ پبلک بھی ایک دوسرے کی خدمت پر کھڑی ہوئی ہے۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ منٹ بھر میں یہ مادّہ رفع ہو جائے۔ لیکن قبضے میں نہیں ہے۔ جب مالک کا حکم ہوگا جب ہی یہ بیماری واپس جائے گی۔ خواہ کتنا ہی جتن کیا جائے، اپنے وقت تک رہے گی۔

مبالغہ فی الاسباب کی ممانعت...... جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب کوئی مصیبت آتی ہے، وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے، جب اس کا وقت ختم ہوگا، جبھی ٹلے گی۔ بندے کا کام یہ ہے کہ اسباب کے درجے میں کچھ نہ کچھ اجمالی طور پر تحفظ کی فکر کی جائے۔ اسباب میں زیادہ مبالغہ نہ کرے ورنہ الجھ کر مصیبت کی عمر بڑھ جاتی ہے، فی الجملہ یہ سمجھ کر تحفظ کا سامان کرتا رہے کہ میں بندہ ہوں اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسباب اختیار کروں تو ''وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَ تَوَکَّلُوْا عَلَیْهِ'' ①

اجمال کے ساتھ اسباب کو طلب کرتے رہو، اللہ کے اوپر بھروسہ رکھو، اسباب پر بھروسہ مت کرو۔ اجمالی طور پر آدمی کچھ تحفظ کا سامان کرتا رہے، دوا پی لی۔ طبیب کو دکھلا دیا، لیکن طبیب کے اوپر توکل کر بیٹھے، یا دواؤں پر توکل کر بیٹھے یا ہمہ تن دل کو ڈال دے کہ یہی چیز شفا دینے والی ہے۔ یہ غلط ہے، دواؤں میں شفاء نہیں ہے، اور طبیب کے قبضے میں شفا نہیں ہے یہ تو وسائل اور اسباب ہیں۔ وسائل کے اندر تاثیر رکھنا مسبّبُ الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔

---

① المستدرک للامام الحاکم، ج: ۴، ص: ۳۶۱، رقم: ۷۹۲۴. امام حاکمؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے ان کی موافقت فرمائی ہے۔ دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۶ ص: ۱۰۶ رقم: ۲۶۰۷.

تاثیراتِ اسباب کی حقیقت...... یہ آگ پانی، ہوا، اور مٹی بھی اسباب ہیں۔ آگ کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جلائے، لیکن یہ اس کی ذاتی تاثیر نہیں ہے۔ اللہ نے اس میں یہ تاثیر رکھ دی ہے۔ وہ یہ تاثیر دکھلاتی رہتی ہے لیکن قبضے میں مالک کے ہے۔ اگر وہ آگ کی تاثیر کھینچ لے تو آگ جلانے کا ارادہ بھی کرے تو اس کے قبضے میں جلانا نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا، جلانے کی تاثیر سلب کرلی گئی، آگ جھک مار کر بیٹھ گئی آگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی، غرض آگ نہیں جلاتی، مشیتِ خداوندی جلاتی ہے۔ جب مشیت تقاضا کرتی ہے آگ جلانا شروع کردیتی ہے۔

یہ پانی اصل میں ٹھنڈک بخشنے والا نہیں ہے، مشیتِ الٰہی ٹھنڈک بخشتی ہے۔ اگر پانی میں سے تبرید کا مادہ نکال لیں اور وہ خود بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے تو قابو نہیں پاسکتا، جب تک مالک اس کی تاثیر کو نمایاں نہ کر دے، ہر چیز کے افعال اور خاصیتیں یہ مخلوق خداوندی ہیں جب وہ نہیں چاہتے ہیں، نمایاں نہیں ہوتیں، اس لیے اصل موثر کو چھوڑ کر آدمی ان چیزوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ یہی مجھے شفا بخشنے والی ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔

موہمِ شرک عنوان سے احتراز کی تاکید...... اسی واسطے شریعت نے بہت سے عنوانات کی اصلاح کی ہے۔ مثلاً یہ عنوان کہ انسانوں کو چاہئے کہ اولاد پیدا کیا کریں۔ شرعی اعتبار سے یہ عنوان غلط ہے، شرعی طور پر اس عنوان کو بے ادبی کہا گیا ہے۔ پیدا کرنا خالق کا کام ہے، ماں باپ کا کام نہیں ہے کہ اولاد پیدا کریں۔ ماں باپ کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب کے درجے میں باہم مل جائیں اور اللہ سے دعا کریں کہ اولاد پیدا کردی جائے۔ اگر حق تعالیٰ شانہٗ پیدا نہ کرنا چاہیں تو ہزار دفعہ خاوند بیوی ملا کریں، کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ مانگنا بھی اسی سے ہے۔ بھروسہ بھی اسی پر ہے، ملتا بھی اسی سے ہے۔ جب اسباب اور وسائل میں وہ اثر ڈالتے ہیں تو اثر آجاتا ہے۔ اور اگر آدمی مطلقاً اسباب کی طرف رجوع کرے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

معرفتِ توحید و تصرّف...... حضرات انبیاء علیہم السلام ہی فی الحقیقت حق تعالیٰ شانہٗ کی توحید اور تصرّف کو پوری طرح سمجھتے ہیں، وہ مانگتے بھی ہیں تو اللہ ہی سے مانگتے ہیں۔ فریاد بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں، کسی مصیبت کی شکایت بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں۔ ہر چیز میں اللہ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

بارگاہِ حق میں سوال کا طریقِ کار...... حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ انہیں بیٹا مانگنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کی نبوت کا مشن آگے چلے اور بڑھے۔ تو بیٹا مانگا۔ اس مانگنے کو حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ: مانگنا بھی ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ مانگنے کا ڈھنگ بھی حقیقتاً حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ ان کے بتلانے ہی سے دوسروں کو آتا ہے۔ غرض حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹا مانگا؟ اس دعا کو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقل کیا ہے اور واقعی اس طرح سے مانگنے کا انہیں کا حق تھا، دوسرے تو اس طرح سے سوجھ بھی نہیں سکتی۔

﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ ① فرماتے ہیں اس وقت کو یاد کرو جبکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے چپکے چپکے اپنے دل میں اللہ سے مانگنا شروع کیا اور چھپی ہوئی آواز سے اولاد کی طلب کی۔ جس کو وہ سنتے تھے اور ان کا اللہ سنتا تھا، کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں تھی، اس طرح سے مانگنا شروع کیا۔

معلوم ہوا کہ مانگنے کا پہلا ادب تو یہ ہے کہ آدمی زیادہ چلا کر نہ مانگے۔ ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ ② ''اللہ کے سامنے دعائیں کرو چپکے چپکے اور آہستہ آہستہ''۔ غرض آہستہ آہستہ مانگنا شروع کیا۔ کس طرح سے مانگا؟ عرض کیا: ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ﴾ ③ ''اے اللہ! میری ہڈیاں خشک ہو گئیں''۔ بڑھاپے کی انتہا یہ ہے کہ ہڈیاں بھی خشک ہو گئیں، ان میں گودا تک باقی نہیں رہا۔ ظاہر بات ہے کہ جب گودا تک باقی نہیں رہے گا، تری اور روغن باقی نہیں رہے گا، ہڈیاں خشک ہو گئیں تو گوشت کہاں باقی رہے گا؟ حاصل یہ نکلا کہ ہڈی سے چمڑا الگ چکا ہے، کوئی طاقت میرے اندر باقی نہیں ہے۔ اور عرض کیا۔

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ ④ ''اور سر سفید ہو گیا ہے جیسے آگ جلا کرتی ہے''۔ تو اندر بھی بڑھاپا سرایت کر گیا کہ ہڈیوں میں روغن تک باقی نہیں۔ اور اوپر بھی بڑھاپا چھا گیا کہ بالوں میں سیاہی نہیں ہے۔ غرض اوپر سے سفید ہو گیا ہوں اور اندر سے خشک ہو گیا ہوں۔ یہ میری حالت ہے۔ یعنی بیٹا مانگنا چاہتے ہیں اور حالت وہ پیش کر رہے ہیں کہ جس میں اسباب کے درجے میں بیٹا ہونا ناممکن ہے۔ جب بڑھاپے کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ اندر روغن تک باقی نہ رہے، ہڈیاں تک خشک ہو جائیں اور بڑھاپا چھا جائے تو اولاد کہاں سے ہو گی؟

مگر یہ مانگنے کا طریقہ ہے کہ وہ اسباب جن کے ذریعے سے اولاد ہوتی، وہ موجود نہیں، تو خود ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ سبب بھی میرے اندر موجود نہیں، یہ سبب بھی میرے اندر موجود نہیں، تاکہ جواب یوں نہ آجائے۔ کہ اگر یوں مانگتے کہ یا اللہ! مجھے بیٹا دیدیجئے۔ تو یہ ہو سکتا تھا کہ جواب یوں آجائے کہ نہیں تم بوڑھے ہو گئے ہو، عادتِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔ ایسے میں بیٹا نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا خاموش ہو جاؤ۔ تو پہلے ہی ان چیزوں کو پیش کر کے دفع دخل مقدر کر دیا، جو جواب آگے ممکن تھا میں وہ جواب خود ہی نہ دے دوں تاکہ آئندہ کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ تو کہا کہ: اے اللہ! میری ہڈیاں تو خشک ہو گئیں اور سر کے بال سفید ہو گئے، بڑھاپا چھا گیا۔ اور بیچ میں ایک لفظ یہ بھی کہہ دیا: ﴿وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا﴾ ⑤ اے اللہ! میں کبھی بھی آپ کے سامنے سے نامراد واپس نہیں گیا، جب گیا ہوں کچھ نہ کچھ لے کے گیا ہوں یہ کبھی نہیں ہوا کہ مایوس گیا ہوں۔ یہ بھی بیچ میں کہہ دیا۔ حاصل یہ کہ اسباب کے درجے میں کچھ موجود نہیں اور آپ کے در سے کبھی مایوس گیا نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین رکھنا چاہئے کہ منہ مانگی مراد ملے گی۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۳. ② پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۵.
③④⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۴.

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: دعاء اس طرح سے مانگو ''اَلِحُّوْا.'' ① الحاح کرو، اتنی زاری کرو کہ لیچڑ بن کے مانگو، کہ بے لئے ہم نہیں ٹلیں گے، کلام بھی ایسا ہی عاجزانہ ہو، جھکنا بھی ایسا ہی ہو اور بیٹھنا بھی ایسا ہی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کریم کے دروازے پر آئیں اور خالی ہاتھ واپس جائیں۔ ہم لے کے ہٹیں گے۔ اور آگے عرض کیا ﴿وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ﴾ ② ''مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈر بھی ہے۔ اور کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے، بلکہ میرے مقصد کو ضائع کر دیں گے''۔

اس کے بعد عرض کرتے ہیں ﴿وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا﴾ ③ یا اللہ میاں! میں ہی بوڑھا نہیں میری بیوی بانجھ بھی ہے اور اس کے اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بھی ساتھ میں عرض کر دوں۔ تو میں بوڑھا ہوں، مجھ میں اولاد کی صلاحیت نہیں، بیوی بانجھ ہے اس میں اولاد ہونے کی قابلیت نہیں، رشتہ داروں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ تو ہوا کیا؟

﴿فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا﴾ ④ پس اللہ میاں! ایک بیٹا مجھے عطاء کر دیجئے جو میرے ان کمالات کا وارث بنے اور ان کو آگے بڑھائے۔ تو حقیقت میں مانگنے کا ڈھنگ بھی حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ بارگاہِ حق میں کس طرح سوال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کے آداب ارشاد فرمائے ہیں کہ دعائیں مانگو مگر اس کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

چناں چہ کسی شخص نے عرض کیا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! لوگ دعائیں مانگتے ہیں، قبول نہیں ہوتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔'' فرمایا: مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهٗ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَارَبِّ يَارَبِّ، اَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهٗ ⑤ کھانا دیکھو تو حرام کا، لباس دیکھو تو حرام کا، کمائی دیکھو تو وہ مشتبہ اور آدمی کہہ رہا ہے۔ ''يَارَبِّ يَارَبِّ اَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهٗ'' دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی؟ یہ تو دل لگی اور مذاق کرنا ہے۔ پاک بن کر اللہ کے آگے آئے تب دعا سنی جائے گی، ناپاک بن کر آئے تو دعا کیوں سنی جائے گی؟

بادشاہ کے دربار میں جب جاتے ہیں تو پاکیزہ کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔ عطر لگا کر جاتے ہیں، معطر ہو کر جاتے ہیں۔ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ دربار میں سیٹ دی جاتی ہے، اگر دربار میں عرض و معروض کریں تو اس کی شنوائی ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی میلے کپڑے پہن کر اور اوپر سے نجاست مل کر چلا گیا تو دربان دھکے دے کر نکال دیں گے کہ یہ پاس کھڑے ہونے کے قابل نہیں چہ جائیکہ اسے دربار میں سیٹ دی جائے۔ اور چہ جائیکہ اسی کی بات مانی جائے۔ تو اسے نکال دیں گے کہ یہ آدابِ دربار کے خلاف ہے۔ تو حرام کی غذا کھا کے اور حرام کا لباس پہن کر

① عمدة القاري، كتاب الفتن، باب التعوذ من الفتن، ج: ٢٢، ص: ١١.

② ③ ④ پارہ: ١٦، سورة مريم، الآية: ٥.

⑤ الصحيح لمسلم، كتاب الزكوة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب، ص: ٨٣٧، رقم: ٢٣٤٢.

جانا اور پھر یا اللہ، یا اللہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی نجاست لیپ کر دربار میں جائے اور بادشاہ کے سامنے عرض و معروض کرے، تو شنوائی ہوگی یا دھکے دئیے جائیں گے؟ تو قبولیت ہوگی یا نامقبولیت ہوگی؟

کسبِ حلال کے آثار...... غرض بتلایا گیا کہ دعاء کے آداب میں سے یہ ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے، پہلے اپنے ضمیر کو پاک کرے کہ میں آج سے حرام کی غذا سے تائب ہوتا ہوں، اور اور مشتبہ کمائی سے تائب ہوتا ہوں کہ اگر کمائی مشتبہ ہوگی تو اس سے قلب کے اندر ظلمت پیدا ہوگی اور اس سے توفیق سلب ہو جاتی ہے، حلال کی کمائی کا اثر قلب میں نورانیت پیدا ہونا اور توفیق کا پیدا ہونا ہے۔ حرام کی کمائی کا اثر سلبِ توفیق ہے۔ قلوب کے اندر سے توفیق نکل جاتی ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا، ہمارے دیوبند میں ایک بزرگ ''شاہ جی عبداللہ'' تھے۔ اور عوام میں شمار ہوتے تھے لیکن صاحبِ نسبت بزرگ اور درویش تھے، انہوں نے کمائی کا طریقہ یہ رکھا تھا کہ گھاس کھود کے لاتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی بیچ کر اپنا گزر اوقات کرتے تھے، صاحبِ نسبت تھے، اوقات کے پابند تھے، ان کے ہاں گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر تھی، تو دیوبند میں جتنے گھاس خریدنے والے لوگ تھے وہ قطار باندھ کر کھڑے رہتے تھے کی شاہ جی کہ گٹھڑی ہم خریدیں گے، ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر میں نے خرید لی تو میرے مویشی میں بھی برکت ہوگی، میرے گھر میں بھی برکت ہوگی۔

اس لئے جہاں شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ سامنے آئے۔ لوگ دوڑتے تھے، جس نے ہاتھ پہلے لگا دیا، انہوں نے گٹھڑی وہیں ڈال دی اور چھ پیسے لے لئے۔ سردی ہو، گرمی ہو، برسات ہو۔ نہ سات پیسے نہ پانچ پیسے، چھ پیسے متعین تھے۔ جب چھ پیسے لے لیتے تو ان کے خرچ کا ان کے ہاں کیا طریقہ تھا؟ دو پیسے تو اسی وقت فقیروں میں صدقہ کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں کوڑیاں ہوتی تھیں۔ گنڈے ہوتے تھے۔ پانچ گنڈے کا ایک پیسہ ہوتا تھا۔ تو دو پیسے کے گنڈے لے کر کسی یتیم کو، کسی غریب کو، کسی بیوہ کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ اس میں کچھ نمک لے لیا اور کچھ تیل لے لیا، کچھ ترکاری لے لی۔ سستے کا زمانہ تھا۔ جو آج دو روپے میں کام چلتا ہے۔ وہ دو پیسے میں چل جاتا تھا، تو دو پیسے ان کے گھر کا خرچ تھا۔ اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب دو پیسے روز کے جمع کرتے کرتے سات آٹھ روپے ہو جاتے تو ان کا کھانا پکا کر ہمارے ان سب بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے دار العلوم دیوبند قائم کیا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان تمام بزرگوں کو جمع کر کے دعوت کر دی۔ تو میں نے اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور بڑے صاحبِ نسبت ولیِ کامل گزرے ہیں کہ ''سال بھر تک ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کا کھانا کھائیں''۔

اور فرمایا کہ: ’’جس دن کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور رہتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ نماز پڑھیں، جی چاہتا تھا کہ تلاوت کریں۔ دل میں طاعت و عبادت اور زہد و ریاضت کی امنگ پیدا ہوتی تھی‘‘۔ یہ اس حلال کی کمائی کا اثر تھا۔ تو جتنی پاک کمائی ہوتی ہے قلب میں توفیق پیدا ہوتی ہے۔

حرام کی نحوست...... جتنی ناپاک یا مشتبہ کمائی ہوتی ہے، توفیق سلب ہوتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ یہ کام نیکی کا ہے۔ مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کے کرنے کی امنگ نہیں ہوتی جیسے غالب نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زھد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

معلوم تو ہے کہ یہ کام اچھا ہے، یہ برا ہے۔ اور اچھے کو کرنا چاہئے مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا، تو دل میں جب ناپاکی گھس جاتی ہے تو وہ اچھے کام کے لیے ابھرتا نہیں۔ آج جو ہم اور آپ معصیت میں مبتلا ہیں وہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں، علم تو بڑا وسیع ہو چکا ہے، حلال و حرام کا امتیاز اچھے اور برے کی تمیز اتنی ہو چکی، ہر شخص شریعت میں رائے زنی کرنے کے لئے تیار ہے۔ جہاں کوئی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے، بس اس نے قرآن و حدیث میں رائے زنی شروع کر دی، گویا مجتہد بن گیا۔ تو علم کی کمی کی وجہ سے گناہ میں مبتلا نہیں ہیں۔ علم موجود ہے۔ پھر بھی مبتلا ہیں تو توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اور توفیق اس لئے سلب ہوگئی کہ ہماری کمائی مشتبہ ہے، حلال کی غذا اندر نہیں پہنچتی۔ معدہ حوض بدن ہے جو اس میں بھر دیں گے، رگ و پے میں وہ چیز پھیلے گی۔ پاک کمائی بھریں گے، پاکی کے اثرات رگ و پے میں بھریں گے۔ ناپاک چیزیں بھریں گے، ناپاکی کے اثرات پھیل جائیں گے، تو حلال کی کمائی کا ایک اثر ہوتا ہے۔

لقمۂ حلال کی علمی و عملی برکات...... حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے۔ یہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی جلیل القدر امام ہیں۔ چار ہی بڑے امام ہیں جن کی فقہ آج کل رائج ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ علیہ، اور بھی صاحب فقہ آئمہ گزرے ہیں لیکن ان کی فقہ ختم ہوگئی۔ من جانب اللہ ان چار فقہوں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور کروڑہا کروڑ انسان ان کی فقہ پر چل رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ترکستان یہ سب حنفی المذہب ہیں اور سب میں فقہ حنفی رائج ہے۔ مصر قریب قریب کل کا کل شافعی فقہ پر چل رہا ہے۔ حجاز بھی قریب قریب شافعی فقہ کا پابند ہے۔ نجد وغیرہ ممالک یہ فقہ حنبلی کے پابند ہیں۔ مغربی ممالک جیسے الجزائر وغیرہ میں مالکی زیادہ ہیں تو دنیا کے اکثر حصوں میں یہی چار فقہ رائج ہیں۔ انہیں چار اماموں کے مسلک پر لوگ عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں جلیل القدر امام ہیں، مگر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام مصر میں تھا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں لکھا کہ بہت عرصہ ہوگیا ملاقات کئے ہوئے۔ اگر کوئی ملاقات کا موقع ہو تو کوشش کر کے آجاؤ، مصر میں

ملاقات ہو، اور علماء آپ کے منتظر ہیں۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور تاریخ معیّن کر دی کہ فلاں تاریخ کو پہنچوں گا۔

مقررہ تاریخ پر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ پہنچے۔ تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے، بادشاہِ وقت چوں کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد تھا، وہ بھی ساتھ ہو گیا۔ جب بادشاہ آیا تو وزراء، امراء، علماء، اور زعماء غرض پورا مصر استقبال کے لئے نکل آیا۔ اور بڑے عزت و احترام سے حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو لے کر آئے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان میں عید کی سی خوشی تھی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بچیاں کودتی پھرتی تھیں کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہا ہے۔ ایک عجیب خوشی تھی۔ غرض ان خوشیوں کے ساتھ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ علماء و زعماء اور سب اکابر ملت ملنے کے لیے آئے۔

کھانے کا وقت آیا تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے دستر خوان بچھایا۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو بٹھلایا گیا۔ اور بھی لوگ بیٹھے۔ حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جو کھانا شروع کیا تو اس طرح سے کھایا جیسے کوئی بہت حریص آدمی کھایا کرتا ہے۔ اور جیسے کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے۔ تو بہت زیادہ کھایا اور جلدی جلدی کھایا، جیسے معلوم ہو کہ کھانے کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب کھانے کے بعد گھر پہنچے تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بچیوں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ یہ حضرت امام وقت ہے۔ یہ کیسا امام وقت ہے جو عوام الناس کی طرح پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے۔ اتقیاء کی شان تو یہ ہے کہ وہ کم کھاتے ہیں، طاعت زیادہ کرتے ہیں۔ یہ پیٹ بھر کے کھانا اور وہ بھی ناک تک کھا لینا، یہ عوام کا کام ہے خواص کا نہیں۔ خواص میں بھی جو شخص امامت کے رتبہ کو پہنچا ہوا ہو، اس کا کام یہ نہیں ہے کہ اس طرح سے الَنسٹھ کھا لے، جیسے اناڑی کی بندوق بھری جاتی ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک، یہ اونچے طبقے کے لوگوں کا کام نہیں جو دیانت میں اونچا مقام رکھتے ہوں۔ تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جواب نہیں بن پڑا اور یہ فرمایا کہ: محسوس تو میں نے بھی اس کو کیا مگر میں یوں بول نہیں سکتا تھا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میں یوں کہتا کہ تم زیادہ کیوں کھاتے ہو، تو تہمت آتی کہ شاید میں مہمان سے اپنا کھانا بچانا چاہتا ہوں، اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں تھا مگر محسوس میں بھی کر رہا تھا کہ یہ حضرت احمد بن حنبل کو ہو کیا گیا۔ اس طرح سے پیٹ بھر کے کھانا ۔

اندرون از طعام خالی دار   تا نورِ معرفت درو بینی

پیٹ کو کھانے سے خالی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ نورِ معرفت پیدا ہو، نہ یہ کہ آدمی اتنا بھر لے۔ بہر حال حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جواب نہیں بن پڑا، بچیوں نے اعتراض کیا تو چپ ہو گئے۔ وہ وقت گزر گیا۔ اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ عشاء کی نماز کے لئے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد چھوٹی چھوٹی بچیوں نے بستر بچھایا۔ اور پانی کا لوٹا بھر کے رکھا کہ امام جب تہجد کے لئے اٹھیں تو پانی لانے کی دشواری نہ ہو۔ اطمینان سے وضوء کرلیں۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے لئے جب اٹھ کر گئے تو بستر وغیرہ اٹھانے کے لئے بچیاں آئیں۔ دیکھا کہ لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔ اب تو ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ کیسا امام ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے، رات کا کوئی وقت عبادت کا اسے نصیب نہ ہو۔ وضو یہ نہ کرے، تہجد یہ نہ پڑھے۔ یہ خواہ مخواہ ہی دنیا میں غلط شہرت ہوگئی کہ اپنے وقت کا بڑا امام ہے۔

جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پہنچے تو بچیوں نے دامن پکڑلیا کہ آپ نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا کہ حضرت احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ راءس الاتقیاء متقیوں کا سردار ہے۔ یہ کیسا امام ہے۔؟ ناک تک یہ کھانا کھاتا ہے اور تہجد کی توفیق اسے نہیں۔ رات بھر پڑ کر یہ سوئے۔ اب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی رہا نہ گیا اور باہر آ کر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ ''اے احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ)! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا؟ مجھے تو اس کی توقع نہیں تھی۔ یہ تمہاری حالت کب سے بدلی، پیٹ بھر کر تم کھانا کھاتے ہو۔ تہجد کی توفیق تمہیں نہ ہوئی۔ رات کو تم نہ اٹھے، وضو تم نے نہ کیا، آخر یہ تغیر تمہارے اندر کیسے پیدا ہوا''؟ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے۔ اور عرض کیا حضرت واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں، فرمایا، واقعہ کیا ہے؟

''عرض کیا کہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے آج عشاء کے وضو سے تہجد اور صبح کی نماز کی نوبت آئی ہے۔ اور عرض کیا کہ قصہ یہ ہوا کہ جب دسترخوان پر کھانا چنا گیا تو میں نے دنیا میں اتنی حلال کی کمائی نہیں دیکھی۔ اس کھانے کے اوپر آسمانوں سے انوار و برکات کی اتنی بارش تھی کہ مکان منوّر تھا اور کھانے پر نظر ڈال کر قلب میں ذکر اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی تھی، اتنی حلال اور پاک کمائی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی، تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جتنا کھا سکوں کھالوں، چاہے بعد میں مجھے سات دن فاقہ کرنا پڑے، پھر یہ نورانی کھانا مجھے کہاں نصیب ہوگا، اس واسطے میں زیادہ کھایا''۔

اور عرض کیا۔: اس کھانے کی دو برکتیں نمایاں ہوئیں، ایک علمی برکت اور ایک عملی برکت۔ عملی برکت تو یہ ہوئی کہ عشاء کے وضو سے میں نے صبح کی نماز پڑھی، اور تہجد پڑھا۔ مجھے وضو کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور علمی برکت یہ ہوئی کہ چارپائی پر لیٹ کر قرآن کریم کی ایک آیت سے آج میں نے فقہ کے سو مسئلے نکالے، جواب تک مجھے سمجھ نہیں آئے تھے، علم کے دروازے میرے قلب کے اوپر کھل گئے۔ اور سو مسئلے ایک ہی آیت سے میں نے استنباط کئے، یہ علم کی برکت ہوئی۔

تب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاڑھی کا بال بال خوشی سے کھل گیا۔ اور بچیوں سے کہا کہ دیکھا ہم نہیں کہتے تھے کہ یہ امامِ وقت ہے۔ تب بچیوں کو تسلّی ہوئی۔ تو عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حلال کی کمائی کا اثر یہ ہے کہ معرفت بڑھتی ہے، علمِ الٰہی کی برکت پیدا ہوتی ہے اور عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ آج ہمارے میں عمل کی کوتاہی اس وجہ سے نہیں کہ آج ہمیں مسائل کا علم نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ علم کے وسائل اتنے عام ہوگئے کہ

پہلے زمانے میں نہیں تھے، کتابیں چھپی ہوئی الگ، اخبار الگ، رسالے الگ، پیپر الگ اور ہر چیز میں شریعت پر ہی مشق کی جارہی ہے، سب مسائل ہی کو موضوعِ بحث بنا رہے ہیں۔ تو اختلافی مسائل ان کے علم میں نہ ہوں مگر اس کے باوجود کہ زبان، علم کے بارے میں کافی چلتی ہے۔ ہاتھ پیر عمل کے لئے نہیں چلتے۔

نمائشِ علم ...... علم کو بھی اگر لوگ استعمال کرر ہے ہیں تو اس انداز سے جیسے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اخیر زمانے میں علم تجمل کے لئے رہ جائے گا۔ جس طرح سے لوگ کپڑوں سے زینت حاصل کرتے ہیں، اچھی بلڈنگ سے تجمل حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم سے بھی اپنی زینت اور نمائش کریں گے کہ ہم بھی پڑھے لکھے ہیں، ہم بھی عالم ہیں اور ہم بھی مسائل پر عبور رکھتے ہیں۔ تو علم عمل کے لئے نہیں رہے گا، نمائش کے لئے رہے گا کہ اپنا جمال دکھلایا جائے، اپنا کمال دکھلایا جائے۔

کثرتِ علم کے باوجود قلتِ عمل ...... غرض علم کی کمی نہیں، اگر کمی ہے تو عمل کی کمی ہے۔ اگر علم کی کثرت سے عمل نصیب ہوجایا کرتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ عمل کرنے والی ہوتی، کیوں کہ علم کی کمی نہیں ہے۔ مگر جتنا علم بڑھتا جارہا ہے عمل گھٹتا جارہا ہے۔ اس واسطے کہ علم تجمل کے لئے ہے۔ اسبابِ علم بڑھتے جاتے ہیں، علم کی حقیقت دلوں میں ختم ہوئی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ: اخیر زمانے میں علم گھٹ جائے گا، اور ایک میں خبر دی گئی کہ قربِ قیامت میں علم بڑھ جائے گا۔ علماء نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے، وہ یہ کہ اسبابِ علم بڑھ جائیں گے اور علم کی حقیقت دلوں میں گھٹ جائے گی۔ اسباب اتنے کہ قدم قدم پر علم کے نقشے سامنے ہوں گے اور ظلمت اتنی کہ قلب کے اندر نورانیت کا نشان نہیں کہ آدمی حق و باطل کا پورا امتیاز کرسکے۔ اور اس کے اندر عمل کا جذبہ اور امنگ پیدا ہو۔

آثارِ علم ...... علم کے آثار میں سے ہے۔ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① اہل علم میں جو علم ہوتا ہے کہ ان میں خشیتِ الٰہی اور خوفِ خداوندی ضرور پیدا ہوتا ہے، یہ علم کی تاثیر ہے اور جو خوفِ آخرت ہوگا اور اپنے مرنے کا ڈر ہوگا اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ ہوگا تو عمل کا جذبہ انسان میں پیدا ہوگا۔ لیکن جب علم سے خشیت اور خوف پیدا نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم حقیقی نہیں ہے، رسمی علم ہے، لفظی علم ہے، لفظی علم کے لئے خشیت کا وعدہ نہیں ہے۔

ابتلاءِ معصیت کے اسباب ...... غرض آج کی معصیت اور گناہ قلتِ علم کے سبب سے نہیں ہے بلکہ قلتِ اخلاق کے سبب سے ہے۔ قلتِ نورانیت کے سبب سے ہے، اور قلتِ توفیق کے سبب سے ہے اور توفیق سلب ہونے کے اسباب میں سے مشتبہ کمائی، حرام کمائی ہے کہ آدمی احتیاط سے نہ کمائے، حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہ کرے، مشتبہ اور غیر مشتبہ کو نہ دیکھے۔ پیسہ مقصود ہوجائے۔ کہ جس طرح ہو پیسہ بٹورلو۔ ڈکیتی سے ہو، چوری سے

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸.

ہو، رشوت سے ہو، کسی بھی انداز سے ہو پیسہ آنا چاہئے، ایسے پیسے کا اثر تو یہی ہوتا ہے کہ توفیق جاتی رہتی ہے۔ بہر حال حاصل یہ نکلا کہ عبادت اور زہادت کی جب توفیق ہوتی ہے جب قلب میں نور ہو، اور نور قلب میں جب ہوتا ہے جب کمائی ٹھیک ہو حلال کی ہو، حلال کا لقمہ میسّر ہو۔

رزقِ حلال میں قلت و برکت...... نیز حلال کی کمائی ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ حرام کمائی تو ہوسکتا کہ زیادہ ہو لیکن عادتاً حلال کی کمائی کم ہوتی ہے۔ الا ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کسی کو بڑھا دے، مگر عادتاً لازمی بات یہ ہے کہ ضرورت کے موافق ملتا ہے، مگر برکت اس میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی خیر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

بناءِ عبادت...... غرض انسان عبادت کے لئے بنایا گیا ہے اور عبادت جب ہوگی جب اس کے وسائل اور اسباب درست ہوں۔ اس لئے فرمایا گیا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ساری چیزیں اس کے لئے بنائیں۔ اسے اپنے لئے بنایا تا کہ میری یاد میں لگے، ساری دنیا اس کے لئے مددگار بنے۔ یہ دنیا سے نفع حاصل کرے مگر کہے کے مطابق جو حدود کے اندر میں جائز طریقے سے بتلاؤں، اس طریق پر نفع حاصل کرے۔ تو نفع اور نقصان سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، عبادت کی بنیاد نفع اور نقصان ہے جو میں عرض کر رہا تھا۔ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ﴾ ② اپنی قوم کو خطاب کیا، کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جو تمہیں ادنیٰ درجے کا نفع نہیں پہنچا سکتے، ادنی درجہ میں ضرر نہیں پہنچا سکتے؟ ان مورتیوں کو جو سامنے رکھی ہوئی ہیں' جن کو تم خود ہی اپنے ہاتھ سے بناتے ہو اور خود ہی تصور کر لیتے ہو کہ یہ ہمارے معبود ہیں۔ یہ بے جان چیزیں ہیں۔ تو مصنوع تمہاری اور تم اس کے صانع' اس کے باوجود تم نے اپنے لئے مالک تجویز کر لیا۔ یہ چیزیں تمہیں نفع بھی نہیں پہنچا سکتیں اور نقصان بھی نہیں پہنچا سکتیں۔ حاصل یہ نکلا کہ عبادت کی بنا نفع اور نقصان کا مالک بنتا ہے۔

اہلِ شرک کا دھوکہ...... اہل شرک کو یہیں سے دھوکہ لگا ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع نقصان پر ہے تو دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جس میں انسان کا کچھ نہ کچھ نفع نہ ہو، یا کچھ نہ کچھ نقصان نہ ہو، دنیا کی کوئی چیز نہ محض نفع ہی پہنچاتی ہے نہ محض نقصان پہنچاتی ہے۔ ہر چیز سے کچھ نفع پہنچتا ہے کچھ ضرر پہنچتا ہے۔ غرض ہر چیز میں نفع ضرر موجود ہے۔ یہ روٹی جو آپ روز کھاتے ہیں، نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی پہنچا دیتی ہے، اگر ذرا حدود سے زیادہ کھالی، بیماری پیدا ہوگی، حدود کے اندر کھائیں گے نفع دے گی۔ یہی پانی اگر اعتدال کے ساتھ پئیں گے نفع دے گا، اگر بے اعتدالی کے ساتھ پانی چڑھاتے چلے جائیں گے، بارد امراض پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے۔

یہی ہوا ہے، نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی دیتی ہے۔ بے اعتدالی کے ساتھ ایسی چیزیں کھائیں گے جس سے فاسد ہوا پیدا ہو، نفخ کی بیماری پیدا ہوگی، اعتدال کے ساتھ کھائیں گے تو ہوا نفع دے جائے گی۔ غرض ہر چیز

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶۔

میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے، نباتات ہوں، جمادات ہوں، حیوانات ہوں، ہر ایک میں نفع ونقصان مشترک ہے، جب عبادت کی بنیاد نفع ونقصان پر رہی اور دنیا کی ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے، تو مشرکین نے ہر چیز کو پوجنا شروع کیا کہ جب عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے اور نفع وضرر دنیا کی ہر چیز میں ہے تو کہیں پانی کو پوجنا شروع کیا کہ اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے۔ اور کہیں آفتاب کو پوجنا شروع کیا کہ اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے تو ضرر سے بچنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں اور نفع حاصل کرنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں۔ اسی طرح ستاروں کو، پتھروں کو، مورتیوں کو، سونے اور چاندی کو پوجنا شروع کیا۔ تو پوجنے والا ایک ہے اور تینتیس کروڑ اس کے خدا ہیں، جتنی دنیا کے اندر انواع ہیں کہ ان میں سے ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نفع ونقصان موجود ہے۔

آلاتِ صنعت کی پرستش..... حتیٰ کہ اگر بعض قومیں صنعت وحرفت بھی رکھتی ہیں تو جتنے ان کی صنعت وحرفت کے آلات ہیں وہ ان کو پوجتی ہیں کہ یہ ہمارے نفع کا ذریعہ ہیں اور یہی نقصان کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کاتب ہے تو وہ قلم کے آگے بیٹھ کر ڈنڈوت کرتا ہے۔ اگر کوئی تلوار کا دھنی ہے تو وہ تلوار کو پوجتا ہے۔ کوئی بڑھئی ہے تو وہ بسولی کو پوجتا ہے کہ میرا نفع ونقصان اس سے متعلق ہے۔ غرض دنیا کی ہر چیز کو معبود بنالیا، کیوں کہ عبادت کی بنیاد نفع ونقصان ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ مشرکین نے یہ اصول تو صحیح اختیار کیا کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے لیکن یہ غلط سمجھا کہ ہر چیز میں نفع وضرر ہے۔

اسلام کا دعوئے توحید..... شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے مگر وہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو، تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع ونقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے، یہ مالک کے ارادے سے نفع و نقصان پہنچتا ہے۔ خود، تھوڑا نفع نہیں پہنچاتا، خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی مشیت خداوندی نفع پہنچاتی ہے۔ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو مسبب الاسباب ہے۔ اسباب کے ہاتھ میں نفع ونقصان پہنچانا نہیں۔ اس لئے عبادت اسی کی، کی جائے گی جس کے قبضے میں نفع ونقصان ہے، نہ اس کی جو نفع ونقصان کا صرف سبب ہے۔ نفع ونقصان کا موجد نہیں ہے، نفع و نقصان کا خالق نہیں ہے، محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق ہونا لازم نہیں آتا۔

استحقاقِ عبادت...... انسان اولاد کے پیدا ہونے کا سبب ہے لیکن اولاد کے حق میں اس کو خالق تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟ کاشتکار کھیتی اگ جانے کا سبب ہے لیکن کھیتی کو اگانے والا کاشت کار کو تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟

اسی لئے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ① تم کاشتکاری کرتے ہو یا ہم کاشت کاری کرتے ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ تم کھیتی کے اگ جانے کا سبب بن جاتے ہو، کھیتی کے اگانے والے نہیں ہوا، گانے والے ہم ہیں، منوں مٹی میں جو بیج چھپا دیا جاتا ہے۔ تو زمین کی تہہ میں سے کون کونپل نکالتا ہے، کیا تم نکالنے جاتے ہو یا ہماری قدرت نکالتی ہے؟

ماں کے پیٹ میں نطفہ پہنچتا ہے تو اس پانی کے اوپر صناعی کر کے نقشہ تم کھینچتے ہو یا ہم کھینچتے ہیں۔؟ ہم اسے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

مُضغہ بناتے ہیں اور بڑھاتے ہیں یا تم بڑھاتے ہو؟ غرض تم سببِ خلقت ہو خالق نہیں ہو، کاشت کار زراعت کا سبب ہے خود کاشت کار زراعت پیدا نہیں کرتا، تو دنیا میں جتنی بھی اشیاء ہیں یہ نفع ونقصان کا سبب بنتی ہیں، نفع و نقصان کو پیدا کرنے والی اور ایجاد کرنے والی نہیں ہیں۔ نفع ونقصان مُسبّب الاسباب کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے زندگی دے دے جس سے چاہے زندگی چھین لے، جسے چاہے صحت دے دے اور جس کی چاہے چھین لے، جسے چاہے اولاد کی نعمت دے دے اور جب چاہے چھین لے، ہاتھ میں اسی کے ہے، اسباب میں نہیں ہے۔

اگر تم اولاد کے خالق ہوتے تو جیسے تم پیدا کرنے پر قادر تھے تو روکنے پر بھی قادر ہوتے، کوئی بھی ماں باپ اولاد کو مرنے نہ دیتے۔ لیکن بے بس ہیں۔ جب زندگی کے روکنے پر قادر نہیں ہو، تو زندگی ڈالنے پر انہیں قدرت کہاں سے آئی؟ تم زیادہ سے زیادہ سبب ہو۔ اس سے زیادہ نہیں ہو۔ موت کا بھی سبب بن جاتا ہے۔

آدمی کسی کو چھری مار دے تو وہ موت دینے والا نہیں ہے، سببِ موت ہے، موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں۔ اگر کوئی چھری مار دے اور وہ چھری میں سے تاثیر نکال دیں اور موت نہ دیں، تو لاکھ ذبح کیا کرو، کبھی کوئی ذبح نہیں ہوگا۔ آگ سے جل کر اگر کوئی مر جائے تو مارنے والی آگ نہیں ہے، مرنے کا سبب ہے، مارنے والی اللہ کی مشیت ہے، آگ کو اس نے سبب بنا دیا۔

اس لئے اسباب میں سے جو نفع ونقصان پیدا ہوتا ہے وہ مالک کے حکم سے پیدا ہوتا ہے۔ خود یہ اسباب نفع و نقصان پر قادر نہیں ہیں، اس واسطے ان اسباب کی عبادت بھی جائز نہیں ہوگی، عبادت اسی کی کی جائے گی جس کے قبضہ قدرت میں نفع ونقصان ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ تو نفع ونقصان کا سبب ساری دنیا بن جائے وہ پوجا کے لائق نہیں ہے۔ جو نفع ونقصان کو بھیج رہا ہے۔ وہ عبادت کے لائق ہے۔ تو اس میں گویا اصول بتلا دیا کہ: ﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَایَنْفَعُكُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ ① ”تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو کہ تمہیں نہ نفع پہنچا سکیں، نہ تمہیں نقصان پہنچا سکیں“۔ ﴿اُفٍّ لَّكُمْ﴾ تمہارے اوپر اُف ہے، تمہارے بنائے ہوئے ان فرضی معبودوں کے اوپر جن میں نہ نافع ہونے کی صلاحیت ہے، نہ مضر ہونے کی صلاحیت ہے۔ جیسے ایک دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ ② ”یہ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کو پکارتے ہیں، جن مورتیوں کے آگے بیٹھ کر پوجا کرتے ہیں۔ یہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگر ساری مورتیاں جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ایک مکھی کو پیدا کر دیں، ان کے بس میں نہیں ہے“۔ ﴿وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّایَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ ③ ۔ ④

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶، ۶۷. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۷۳. ③ ④ یہ تقریر اتنی ہی حاصل ہو سکی، جو کہ شاملِ اشاعت کی جا رہی ہے، بقیہ حصہ دستیاب ہوا تو کسی دوسری اشاعت میں شاملِ کتاب کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز (از مرتب غفرلہ)

حج بین الاقوامی عبادت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

اسوۂ مساوات...... بزرگانِ محترم! مساوات اور ایک رُخی کو برنگِ عبادت عملی صورت دینے کے لئے حق تعالیٰ نے حج کی عبادت مقرر فرمائی کہ اس قبلہ پر مشرق ومغرب کی قومیں یکساں انداز سے جمع ہوں تا کہ ان میں سے اونچ نیچ کے جراثیم ختم ہوں، بلکہ اس مساویانہ اجتماع سے پیدا شدہ عملی مساوات کے نمونہ کو سامنے رکھ کر اپنی پوری زندگی اسی مساوات اور باہمی برابری کے ساتھ گزار دیں۔

اس بناء پر شریعتِ اسلام نے اس قبلہ کو اوّل تو سارے انسانوں کا قبلہ قرار دیا چناں چہ آثار وروایات حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی نبی دنیا میں ایسے نہیں گزرے کہ انہوں نے اس قبلہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب سارے حضرات انبیاء علیہم السلام اس بیتِ خداوندی کی عظمت اور اس سے عشق ومحبت کرتے آئے ہیں اور اسے اپنا قبلہ تسلیم کر چکے ہیں۔ تو قدرتی طور پر ان کے ماننے والی قوموں کا قبلہ بھی یہی بیت اللہ ثابت ہوتا ہے۔

عالمی ہدایت کا قبلہ...... پھر قرآن نے بھی یہی بتلایا کہ: قبلہ کی وضع دنیا کے سارے انسانوں کے لیے ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے کہ: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② سب سے پہلا خدا کا گھر (کعبۂ معظم) جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ مکہ میں ہے۔ آیت کریمہ میں اول تو ﴿وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾ کا لفظ لایا گیا، یعنی سارے انسانوں کے لئے وُضِعَ لِلْعَرَبِ یا لِلْعَجَمِ نہیں فرمایا گیا، جس سے عرب اور بقیہ ساری اقوام کا قبلہ یہی بیت کریم ثابت ہوا۔ پھر اسے ہدایت اور راہنما بتلانے کے لئے "عَالَمِيْنَ" کا لفظ استعمال فرمایا کہ: وہ جہانوں اور عالموں کے لئے ہدایت ہے، جس سے اس قبلہ کا تمام جہانوں کے لئے عالمی

①② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

ہدایت کا قبلہ ہونا ثابت ہوا، جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ اطراف واکناف عالم سے تمام اصنافِ بشر اور تمام قومیں اس عالمی رہنمائی کے تحت حج کرنے کے لئے اسی کی طرف بڑھیں اور اپنی اجتماعیتِ کبریٰ یا عالمی اجتماعیت کا ثبوت دیں۔

امامِ ناس (علیہ السلام) اور مرکزِ ناس...... اسی لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جنہیں قرآن نے امام الناس فرمایا ہے کہ: ﴿اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ ① اور فرمایا ﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ ② لوگوں کے لئے حج بیت اللہ کا اعلان عام کر دیں۔

تو یہاں بھی دونوں جگہ بلا تخصیص عرب وعجم "الناس" کا لفظ لایا گیا۔ یعنی موذن تو امام الناس بنائے گئے جنہیں بلا تخصیص تقریباً دنیا کی تمام بڑی قومیں امام تسلیم کرتی ہیں اور اس اعلان کا مخاطب بھی "الناس" ہی کو بنایا گیا جس میں کسی قوم یا ملک کی تخصیص نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے انسانو! حج کے لئے چلو، اس لئے امام العرب یا امام الشام یا امام العراق نہیں بلکہ امام الناس" کہا گیا۔ جنہیں یہود ونصاریٰ بھی امام مانتے ہیں۔ اور مسلمان بھی انہیں اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ مجوس اور فارس قومیں بھی زرتشت کے نام سے انہیں امام تسلیم کرتی ہیں اور براہمہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اپنا لقب براہمہ رکھا ہے۔ نیز بقیہ اقوام بھی تبعاً اسی ذیل میں آجاتی ہیں جو ممکن ہے کہ ناموں کے تفاوت سے وہ بھی ان کی امامت کو تسلیم کرتی ہوں، غرض اعلان حج کے لئے امام الناس کو منتخب فرمایا جانا اس کی کھلی علامت ہے کہ حج کا یہ اذن عام دنیا جہاں کے سارے انسانوں کے لئے تھا اور حج کے اس اعلان عام کا خطاب "الناس" کو بنایا جانا بھی جس میں کسی ملک یا قوم کی تخصیص نہیں، اس کی کھلی دلیل ہے کہ حج کا خطاب دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے، جس سے صاف واضح ہے ہے حق تعالیٰ نے اس قبلہ مقدسہ کو مرکزِ ناس اور مرکزِ عالم بنا کر حج کے لئے اس کے اردگرد سارے ہی انسانوں کو جمع کرنے کا اذن عام دیا ہے۔ جس سے حج ایک بین الاقوامی عبادت ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اور قومیں اس سے منحرف بھی ہو جائیں اور صرف مسلمان ہی اس کی طرف رجوع کریں تب بھی وہ بین الاقوامی ہی ثابت ہوگا، کیوں کہ مسلمان دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں اور وہ یورپ، ایشیاء، افریقہ اور امریکہ سے چل کر نوبت بہ نوبت حج کے لئے آئیں گے تو بین الاقوامیت پھر بھی نمایاں رہے گی۔ اور اس میں پہنچ کر حج بین الاقوامی ہی عبادت ثابت ہوگا۔

عالمی مساوات...... خلاصہ یہ کہ حج بروئے قرآن اس دنیا میں ایک عالمی اجتماع ہے جس میں ساری قومیں یکسانی کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ اس لئے ان میں قدرتی طور پر اخوتِ اسلامی، عالمی مساوات، اور عالمی بھائی چارہ اور عالمی خدمت کا جذبہ ابھرنا چاہئے، پھر ساتھ ہی حج میں صورتوں میں بھی مساوات رکھی گئی ہے۔ پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی کہ اقوام ہی یکساں رہیں، بلکہ آنے والے افراد میں بھی باہم یکسانی رونما ہو، لباس بھی سب کا ایک ہو،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۴۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۷۔

وضع ایک اور افعال بھی سب کے ایک اور یکساں ہو، امیر وغریب، بادشاہ وگدا، خواص وعوام، عالم وجاہل، نیک وبد، صالح وطالح، متقی اور فاسق، ایک ہی لباس میں، ایک ہی کفن میں، ننگے سر، ننگے پاؤں یکساں فقیرانہ انداز سے اس بیتِ کریم کے اردگرد جمع ہوں، احرام بندھا ہوا ہو۔ اور ایک وضع اور ایک رُخ ہو کر اس بیتِ کریم کے اردگرد پروانوں کی طرح چکر کھائیں، طواف کریں، اور اس پر جاں نثاری کا ثبوت دیں۔

بندگی میں یکسانی...... عرفات کے میدان میں بھی اسی ایک وضع میں خاک بہ سر ہو کر اپنے رب کے سامنے گڑ گڑائیں، فریاد کریں، مزدلفہ میں بھی ایک ہی انداز سے گریہ وزاری میں محو اور مست ہوں، صفا ومروہ کے پہاڑوں کے درمیان بھی اسی ایک اندازِ گرویدگی اور محویت سے عاشقانہ اور والہانہ دوڑ لگائیں، ایک قافلہ، دوسرے قافلہ کو دیکھے تو بجائے کسی دنیوی یا معاشرتی نعرہ کے ''لبیک لبیک'' کا نعرہ بلند کرے تا کہ باہمی یکسانی کے ساتھ ان کی بندگی میں بھی یکسانی رہے اور ایک ہی متواضعانہ اور سرفروشانہ انداز سے ایک دوسرے کے سامنے آئیں، خواہ وہ حکمران ملک اور سربراہان ریاست ہوں، یا عوام الناس اور پبلک میں ہوں، ظاہر ہے کہ جب اسی طرح لاکھوں لاکھ انسانوں کی ایک ہی فقیرانہ وردی، ایک ہی سب کی نقل وحرکت، ایک ہی عمل ایک ہی مرکز اور ایک ہی رُخ ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ اس مساویانہ انداز میں ہو کر ان میں اونچ نیچ کا کوئی تصور بھی باقی رہے، دنیا کی کوئی قوم اس عملی مساوات کا نمونہ دکھلائے تو سہی کہ ایسی بین الاقوامی مساوات کس میں ہے؟ اور ظاہر وباطن کی برابری اور ہمواری کا ایسا سچا مظاہرہ کس نے کر کے دکھلایا ہے یا دکھلا سکتی ہے۔

قلوب وقوالب کی یکسانی...... پھر اسی کے ساتھ سب کی پارسائی اور زہد وقناعت کا یہ عالم کہ گھر وبار چھوڑے زر ومال بقدرِ ضرورت ہی لئے ہوئے، نہ رسمی عزت وجاہ کا تصور، نہ کسی پر کسی کو بڑائی کا زعم، نہ کسی میں اونچ نیچ کا وہم، نہ کسی کی زبان پر کوئی فحش وبے حیائی کا کلمہ، نہ آپس میں جھگڑا اور نزاع، نہ جدال وقتال۔ بلکہ قلبی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ گرویدگی، خدمتِ باہمی کا جذبہ، ایثار وقربانی کا ہمہ وقت تصور اور ہر ایک میں بجائے نیچ ہونے کے غناء وتوکل کا جذبہ۔ رسمی کرّ وفرّ اور ٹھاٹھ باٹھ سے کوسوں دور۔ سادگی اور بے تکلفی سے مخمور، اسی ایک کی محبت میں چور چور اسی ایک کو پکارنا، اسی ایک سے مانگنا، اور اسی ایک کے آگے جھکنا، جو سب کا ایک ہی مرکزِ حقیقی، اصل وجود اور خالق ومالک ہے۔ اور اسی کے اس بین الاقوامی گھر کے اردگرد گھومنا جو سب کا مرکزِ ظہور، سب کی مادی اصل اور سب کے لئے مرکزِ کشش ہے۔

دنیا کی کوئی قوم قلوب کی یہ یکسانی، قوالب کی یہ مساوات، افرادِ انسان کی یہ عالمی موانست اور اولادِ آدم کی یہ عالمی اخوت دکھلائے تو سہی کہ کہاں ہے جو اسلام اور مسلم نے اپنے رب سے جڑ کر دکھلائی اور نہ خود ہی دکھلائی بلکہ اسی نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اونچ نیچ کا مٹانا نعروں سے نہیں بلکہ عملاً یوں ہوتا ہے۔ اور کبر وغرور کا سر اس طرح توڑ دیا جاتا ہے۔

مساوات وعبادت کی یکسانی......اسی توجہ الی اللہ اور ایک رُخی کا قدرتی اثر ہے کہ لاکھوں لاکھ کے مجمعے میں جس میں مردعورت مساوات کے ساتھ ایک جگہ ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں۔نہ کہیں فحش کا نشان ہوتا ہے۔نہ بے حیائی کا وہم وگمان، نہ معصیت کاری کا کوئی داعیہ، نہ کسی کی حق تلفی کا کوئی جذبہ۔نہ طبقہ وارانہ فسادات، نہ نزاع وجدال ہے، نہ قتل وقتال، نگاہوں میں پاکی اور دلوں میں حق شناسی، اور ساتھ ہی ساتھ عبادت اور اللہ سے وابستگی۔

یوں باہم کس نے کئے ساغر وسنداں دونوں

عملاً دکھایا جاتا ہے کہ معاصی اور گناہوں سے کیوں کر بچا جاسکتا ہے اور انسانی ہمدردی اور مساوات کو عبادت کے ساتھ کس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے۔

عالمی اخوت...... پھر حج میں عالمی اخوت ومساوات محض لفظی یا اخلاقی حد تک محدود نہیں رکھی گئی بلکہ اس کے ساتھ تعاون باہمی، ضرورت مندوں کے لئے مالی اعانت وہمدردی کا سلسلہ بھی قائم فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ اخوت و مساوات ہر نہج سے مستحکم ہوتی رہے اور اس حسن سلوک اور احسان عام سے دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ منت پذیری اور احسان شناسی کے ساتھ مربوط ہوں، کیوں کہ خصوصیت سے اس طویل وعریض سفر میں صرف امراء ہی نہیں آتے بلکہ غرباء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثریت غرباء ہی کی ہوتی ہے جو اپنے ذوق وشوق سے کسی نہ کسی ضروری حد تک ہی سامان سفر مہیّا کر کے پہنچ پاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس رقم کی قلت ہوجائے۔اور وہ اپنی بعض واجبی ضروریات بھی پوری نہ کرسکیں۔اور تکلیف میں مبتلا ہوجائیں یا ضرورت کی حد تک رقم ہومگر اچانک کوئی غیر معمولی ضرورت پیش آجائے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جیسے بیماری اور دوادارو وغیرہ کی پریشانی۔یا یہ بھی نہ ہو۔مال چوری ہوجائے اور وہ غنی ہوتے ہوئے بھی اس سفرِ غربت میں فقیر بن جائیں۔اور مستحقِ امداد بن جائیں یا ان میں کوئی بھی صورت پیش نہ آئے، وقتی حالات کے لئے تالیفِ قلوب ہی ضروری ہوجائے، ان تمام احوال کے پیش نظر حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ان کی مالی اعانتوں کی ترغیب دی کہ حرم محترم میں جو بھی غریبوں پر خرچ کیا جائے گا، اس کا اجر ایک لاکھ گنا ہوگا۔یعنی ایک روپیہ کا صدقہ ایک لاکھ روپے کے صدقے کے مساوی ہوگا۔

حج میں روحانی ترقی کے درجات......جس کا حاصل یہ ہے کہ غیرِ حرم میں تزکیۂ نفس یا رذیلۂ بُخل سے پاکی اور غنائے نفس کا ملکہ ایک لاکھ روپیہ دے کر پیدا ہوتا ہے وہ حرم محترم میں ایک روپیہ دے کر ہوجائے گا، اور روحانی ترقی کے درجات ایک سے ایک لاکھ تک پہنچ جائیں گے، سوکون ہوگا کہ اس ترغیب کے بعد اس بہتی ہوئی سبیل میں ہاتھ تر نہ کرے۔

عالمی حسن سلوک...... پھر قرآن کریم نے حج کی قربانیوں تک میں جو مناسکِ حج میں سے ہیں، غرباء اور ضرورت مندوں کی رعایت فرمائی اور اس حسن سلوک کا سلسلہ بھی عالمی بنادیا، ارشاد حق ہے: ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا

وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِيۡرَ ﴾ ① سوان قربانیوں کے جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ۔ غرض حج میں جیسے عالمی اخوت ومساوات رکھی گئی ہے ویسے ہی مالی تعاون کو بھی بین الاقوامی بنا دیا ہے۔ کیوں کہ مصیبت زدہ فقیر میں کسی ملک یا وطن کی تخصیص نہیں فرمائی گئی کہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، بلکہ دنیا کے کسی خطہ کے ہوں سب اسی میں داخل ہیں۔

حج میں عالمی تجارت...... سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص صدقہ وخیرات کا جذبہ بھی رکھتا ہے اور غریبوں کی امداد بھی کرنا چاہتا ہے لیکن نقد رقم اس کے پاس اتنی نہ ہو کہ وہ یہ جذبہ پورا کر سکے۔ تو قرآن حکیم نے اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی مالِ تجارت ساتھ لے جا کر فروخت کر سکے جس سے اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں، تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور نہ اس عبادت میں اس سے کوئی فرق پڑے گا۔

ارشاد فرمایا گیا: ﴿لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ ② اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج) میں معاش کی تلاش کرو (جو تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھا) ہے۔

دوسری جگہ ایک دوسرے عنوان سے اسی اجازت کو اس طرح دھرایا گیا ہے کہ اس میں ترغیب دینے کی شان بھی پیدا ہوگئی۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کا اعلان کر دینے کا امر فرمایا گیا وہیں یہ بھی ارشادِ حق ہے فرمایا: ﴿لِيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ﴾ ③ (اس اعلان سے لوگ پیدل اور دبلی پتلی اونٹنیوں پر جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، چلے آئیں گے) تا کہ وہ اپنے فوائد کے لئے آ موجود ہوں۔

یہاں منافع کا لفظ عام ہے جس میں اوّلیت کے ساتھ حج کے اخروی منافع جیسے رضاءِ خداوندی، اجر وثواب اور آخرت کی ترقی ءدرجات بھی داخل ہیں اور ثانویت کے ساتھ دنیوی منافع جیسے قربانی کا گوشت کھانا اور کھلانا اور تجارت یا صنعت وحرفت یا علاج معالجہ وغیرہ سے مال کمانا بھی شامل ہیں۔

عالمگیر امدادِ باہمی...... پس قرآن حکیم نے جیسے مناسکِ حج کے سلسلہ میں عالمی اخوت ومساوات کے رشتے قائم فرمائے، ویسے ہی عالمی تجارت اور بین الاقوامی انداز سے صنعت وحرفت کے منافع کا راستہ بھی ہموار فرما دیا۔ تا کہ اخوت ومساوات حسنِ سلوک کی مضبوط بنیادوں پر قائم رہے اور عالمگیر طریق پر امداد باہمی بقائے باہم کے سلسلہ جاری رہیں تا کہ مسلمان کے روابط صرف اپنے ہی ملک کے مسلمانوں تک محدود نہ ہو جائیں بلکہ دنیا کے آخری کناروں تک پہنچیں اور بین الاقوامی بنیں۔

بہرحال حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت، اور بین الاقوامی تعاون کا ایک

---

① پارہ:١٧، سورة الحج، الآية: ٢٨. ② پارہ:٢، سورة البقرة، الآية: ١٩٨.
③ پارہ:١٧، سورة الحج، الآية: ٢٨.

بے مثال اور عظیم المرتبت نمونہ ہے جس میں مرکز بھی ایک، محبت بھی ایک، اور سب کی انسانیت بھی ایک ہو کر سامنے آتی ہے اور اونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت و حقارت باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے۔ پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونہ، مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں، ورنہ وہ بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر نہ لائیں۔ وہ صرف مساوات، اخوت اور بھائی چارہ کے الفاظ رٹے ہوئے ہیں۔

جوہرِ تخلیق میں مساوات کا تقاضا...... اور شاید وہ بھی اسلام ہی کی اس عام پکار اور دعوت کی بدولت کہ ''أنتم بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ'' (۱) ''تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے''۔ تم میں نہ کوئی سورج کی اولاد ہے نہ چاند کی، نہ کوئی سونے سے بنا ہوا ہے نہ چاندی سے، نہ کوئی خدا کے منہ سے نکلا ہوا ہے نہ اس کے پیروں سے، بلکہ سب اس کی مشیت و تخلیق سے ایک ہی جوہر سے اور ایک ہی باپ کی اولاد سے پیدا شدہ ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اخوت و محبت کے لئے بنائے گئے ہیں، وہ لوگ چاند اور سورج کی اولاد بن کر انسانوں کو اخوت و مساوات کا درس نہیں دے سکتے بلکہ آدم خاکی کی اولاد ہو کر اور آدمیوں میں مل کر ہی یہ سبق پڑھا سکتے ہیں۔ وہ بہت سے خداؤں کے بندے بن کر دنیا کو ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکتے بلکہ ایک اور صرف ایک واحدِ قہار اور بے مثل و یکتا خدا کے بندے بن کر ہی وحدیت اور مرکزیت کے نقطہ پر لا سکتے ہیں۔

عالمی اخوت کے مرکزی نقاط...... کیوں کہ اسی خدائے واحد و بے مثال نے عالمی اخوت اور محبت کے لئے دنیا میں تین مرکز (۱) کلام اللہ (۲) بیت اللہ (۳) اور رسول اللہ بھیجے ہیں جنہیں عالمی مرکزیت دی ہے۔ قرآن کو ﴿ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ﴾ (۲) بتلایا۔

بیت اللہ کو ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ فرمایا اور حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (۳) کہا۔ قرآن سے عالمگیر ہدایت بصورتِ قانون پھیلی، بیت اللہ سے عالمگیر اخوت و مساوات بصورتِ حج ابھری اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے عالمگیر رحمت و محبت اور انسانیت بصورتِ عمل سامنے آئی۔

طلب صادق...... اس لئے جو قومیں صحیح ہدایت، صحیح اخوت و مساوات اور صحیح انسانیت انسانوں میں دیکھنا چاہتی ہیں انہیں ان تین مرکزوں سے چارہ کار نہیں ہے اور یہ پاک پونجی انہیں ان ہی تین دروازوں سے مل سکتی ہے، اگر تعصبات کو چھوڑ کر طلبِ صادق کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گی بلاشبہ کامیاب واپس ہوں گی، حاصل یہ کہ حج جیسے بین الاقوامی اور اجتماعی رنگ کی عبادت ہے، ویسے ہی عالمی اخوت و مساوات اور عالمی امدادِ باہمی کا سرچشمہ بھی ہے۔

قرآن حکیم نے اخوت و مساوات کا ایک مستقل قانون دیا ہے جس کا ایک اہم پہلو حج کی عبادت میں بھی

---

(۱) السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب، ج: ۱۱ ص: ۱۶ ! رقم: ۵۱۱۶.

(۲) پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۰. (۳) پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷.

مضمر تھا اس لئے موضوع کی رعایت سے اسی پہلو کو مختصر خطاب اور اس قلیل وقت میں ظاہر کرنا مقصود تھا، ورنہ حج کے سلسلے میں دینی اور دنیوی فوائد اور منافع کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے۔ اتنی نہیں کہ ان چند سطروں میں سما سکے، اس کے لئے دفتر درکار ہیں۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ ①

① ماخوذ از ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک (پشاور)

اہمیت تزکیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . اَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .

حرفِ آغاز...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی چند آیات ہیں جو اس وقت میں نے تلاوت کی ہیں، ان میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے دین کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے۔ جو اصل مقصد ہے اور انسان کی پیدائش کی بنیادی غرض وغایت ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کی تشریح کی جائے، پہلے بطور تمہید کے ایک مقدمہ سمجھ لیجئے، پھر ان آیات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

خیر و شر سے مرکب مخلوق...... اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان میں اللہ نے دو مادّے رکھے ہیں، ایک خیر کا مادّہ ہے اور ایک شر کا مادّہ ہے، خیر کے مادے سے وہ اچھے افعال انجام دیتا ہے اور شر کے مادے سے برائی، بدی اور معصیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ کوئی انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ دو مادّے اس کے اندر نہ ہوں۔ انسان، انسان بنا ہی اس لئے ہے کہ اس میں خیر اور شر دونوں موجود ہیں۔ اگر وہ خیرِ محض ہوتا، تو وہ انسان نہ ہوتا، اس کو فرشتہ کہتے اور اگر شرِ محض ہوتا تب بھی انسان نہ ہوتا، اس کو شیطان کہتے، تو جس میں شر کا نشان نہیں ہے وہ فرشتہ ہے، اور جس میں خیر کا نشان نہیں ہے وہ شیطان ہے۔ انسان دونوں کا مجموعہ ہے۔ کہ وہ فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی ہے۔ دونوں مادّے اس کے اندر رکھے ہوئے ہیں۔

انسان کی ترقی کا راز...... اور اسی لئے اسی میں ترقی ہے۔ نہ فرشتہ ترقی کر سکتا ہے نہ شیطان، مادی و روحانی جتنی ترقی کی ہے وہ انسان نے کی ہے۔ اس لیے کہ اس میں دونوں مادّے موجود ہیں۔ اور دو ضدیں جب ٹکراتی

① پارہ: ۳۰، سورة الشمس، الآية: ۷، ۱۰.

ہیں تب ہی کوئی تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ترقیات عطاء فرمائی ہیں کہ اس میں یہ دونوں مادّے موجود ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہر انسان میں ایک لَمّہ خیر کا موجود ہے اور ایک لَمّہ شر کا موجود ہے۔ یعنی ایک جذبہ اور داعیہ بھلائی کا موجود ہے۔ ایک جذبہ اور داعیہ برائی کا موجود ہے۔ پھر ان دونوں مادّوں کو امداد دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو ہی خزانے رکھے ہیں جن سے ان دونوں مادّوں کو امداد پہنچتی ہے۔

جذباتِ خیر و شر کا محرک...... حدیث میں ہے کہ: ہر قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو خیر کی طرف ابھارتا ہے، اور ہر قلب کی بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ جب یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے؟ فرمایا بَلٰی وَلٰکِنَّہٗ اَسْلَمَ میرے قلب کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے مگر وہ میرے تصرّف اور میری برکت سے مسلمان ہو گیا، اب اگر وہ بھی مجھے امر کرتا ہے تو خیر کی بات کرتا ہے، سُجھاتا ہے تو خیر کی بات سُجھاتا ہے۔''

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر و برکت نے اس کی ماہیت بدل دی کہ بجائے شر کے خود اس میں خیر پیدا ہو گئی۔ مگر بٹھلایا گیا ضرور۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو یہ فرمایا گیا تھا۔ قران کریم سے بھی واضح ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ: ''جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چیختا ہوا اور روتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان اس کو چوکے لگاتا ہے۔ اپنے اثرات پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی کوکھ میں اپنی چونچ مارتا ہے تاکہ اس کا اثر پہنچ جائے۔ صرف دو ہستیوں کو مستثنیٰ کیا گیا جن کو شیطان کوئی اثر نہیں پہنچا سکا۔ ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ایک حضرت مریم رضی اللہ عنہا۔ ان کی پیدائش کے وقت شیطان اپنا کوئی اثر نہیں پہنچا سکا''۔

اس سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ بظاہر اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی افضلیت ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: صرف دو ہی انسان ہیں جن تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم رضی اللہ عنہا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں بلکہ حضرت مریم علیہا السلام بھی۔

لیکن میں نے جو ابھی حدیث بیان کی اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واضح ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیطان پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر غالب ہو گیا، تو وہ شیطان ہی باقی نہ رہا۔ تو قوی تاثیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نکلتی ہے نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی۔ وہاں بہت سے بہت یہ ہوا کہ شیطان نہیں آ سکا۔ یہاں آ بھی نہیں سکا۔ اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اثر ڈال کر اسے بدل ڈالا، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واضح ہوئی۔ بہر حال یہ

واضح ہے کہ ہر انسان میں دو مادّے رکھے گئے ہیں ایک خیر کا اور ایک شر کا، اور قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے۔ فرشتہ خیر کی طرف توجہ دلاتا ہے اور شیطان شر کی طرف۔

محرکاتِ خیر وشر کی جنگ اور ان کی مدد...... یہ تو آپ نے بعض اوقات دیکھا ہوگا کہ ایک نیک کام کرنے میں آدمی کو تردّد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں۔ یا بدی کرنے میں تردّد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں؟ یہ شیطان اور فرشتے کی جنگ کا اثر ہوتا ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ خیر کر، شیطان کہتا ہے کہ شر کر، آدمی تردّد میں پڑتا ہے کہ کیا کروں، جو چیز غالب آجاتی ہے وہی کرتا ہے۔ خیر غالب آگئی تو گویا فرشتے نے غلبہ پالیا، شر غالب آگئی تو گویا شیطان نے غلبہ پالیا، بہر حال ہر انسان میں دو مادّے بھی ہیں اور ان دونوں مادّوں کو امداد بھی پہنچتی ہے، اس لئے انسان دو ہی قسم کے افعال کرتا ہے یا برائی کے یا بھلائی کے، یا نیکی کرے گا یا بدی کرے گا۔

اوامر ونواہی کی حکمت...... یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام دو۲ حصے لے کر دنیا میں اتری، ایک حصہ اوامر کا ہے۔ حکم دیا گیا کہ یہ کام کرو، یہ تو خیر کو ابھارنے کے لئے ہے، ایک حصہ نواہی اور ممانعت کا ہے کہ ان کاموں کو مت کرو۔ یہ شر کو دبانے کا ہے تو شریعت کے دو۲ حصے ہیں، ایک ماموارت کا، ایک منہیات کا، ماموارت کا معنی ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور منہیات کا معنی ہے جن کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا اور ان سے روکا گیا۔ ایک طرف کہا گیا کہ تم تو نماز پڑھو، تم عبادت کرو، تم روزے رکھو، تم حج کرو، تم سچ بولو۔ یہ اوامر اور احکام خداوندی ہیں، اور ایک طرف نواہی ہیں ''لَا تَقْتُلُوْا. لَاتُسْرِفُوْا. لَا تَزْنُوْا '' نہ چوری کرو، نہ زنا کرو، نہ قتل کرو اور نہ شراب پیو، نہ بدکاری کرو۔ یہ منہیات کا حصہ ہے، اس لئے شریعت کے دو حصے ہوگئے، ایک امر بالمعروف یعنی اچھائیوں کا حکم دینا اور ایک نہی عن المنکر، یعنی برائیوں سے روکنا۔ یہ شریعت کی دو۲ جانبیں ہیں، ان دو کے بغیر انسان کو ترقی نہیں ہوسکتی، اگر وہ ساری نیکیاں کرتا رہے مگر بدیوں سے نہ بچے، ادھر نماز پڑھتا ہے، ادھر شراب خوری بھی کرتا ہے۔ ادھر روزہ بھی رکھتا ہے، ادھر معاذ اللہ زنا کاری میں بھی مبتلا ہے، اسے کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی نیکیاں اکارت جائیں گی، دونوں چیزیں جب تک جمع نہ ہوں کہ بچنے کی چیزوں سے بچتا رہے، کرنے کی چیزوں کو کرتا رہے، اس کے بغیر انسان کی ترقی نہیں ہوسکتی۔

تقدیم نواہی...... اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص بیمار ہو، طبیب یہ کہے کہ یہ دوائیں پینی پڑیں گی۔ یہ امر کا حصہ ہے۔ اور فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرنا پڑے گا۔ یہ نہی کا حصہ ہے۔ تو علاج میں دو چیزیں نکلتی ہیں۔ ایک دوا کا پینا، ایک پرہیز کرنا۔ اگر آدمی دوا پیتا رہے مگر پرہیز نہ کرے، بیماری رفع نہیں ہوگی، اطباء ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرہیز کرنا دوا پینے کی نسبت زیادہ مقدم ہے۔ بعض دفعہ دوا نہ بھی پئے۔ پرہیز کرنے سے آدھی سے زیادہ بیماری خود بخود ختم ہوجاتی ہے، اس لئے پرہیز مقدم ہے، اسی طرح سے شریعت میں بچنے کی چیزوں سے بچنا، کرنے کی چیزوں سے زیادہ مقدم ہے، اگر آدمی معاصی سے، بدعملیوں سے اور برائیوں سے بچتا رہا تو اس کے دین کا بہت سا

حصہ محفوظ ہو جائے گا۔ اگرچہ کرنے کی چیزیں اس نے نہیں کیں۔ بہرحال انسان میں بہت حد تک پاکی پیدا ہو جائے گی۔ تو پرہیز دوا سے مقدم ہوتی ہے، مضرت سے بچنا، نفع حاصل کرنے سے مقدم ہوتا ہے۔

ایک تاجر کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مجھے نقصان نہ پہنچ جائے، جب نقصان سے بچ گیا تو دوسری سعی ہوتی ہے کہ نفع حاصل کرے۔ تو خسارے اور نقصان سے بچنا مقدم ہے۔ اسی طرح شریعت میں مقدم یہ ہے کہ آدمی بدعملی سے بچ جائے، اس سے کچھ نیکی کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور بدعملیوں میں مبتلا رہنے سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ آدمی نیکی نہیں کرتا۔ یہ عقلی اصول ہے کہ دفعِ مضرت جلبِ منفعت سے مقدم ہے۔ تو شریعت کے اعمال میں منکرات سے بچنا جتنا ضروری ہے، معروفات پر عمل کرنا اس درجہ کا نہیں، پہلے ضرورت ہے کہ آدمی منکرات سے بچے۔ قتلِ ناحق ہے۔ شراب خوری ہے۔ جوا ہے۔ جھوٹ بولنا ہے۔ رشوت ستانی ہے۔ سود بٹے کا کاروبار ہے۔ ان سے بچنا مقدم ہے، اس کے بعد نماز سے بھی نفع پہنچ سکتا ہے، روزے سے بھی، حج سے بھی، زکوۃ سے بھی، اگر ایک انسان کی کمائی ناپاک ہے، وہ سود خوری بھی کرتا ہے، نفلیں بھی پڑھتا رہے نفلوں کی تاثیر نہیں ہوگی، ممکن ہے فرض ادا ہو جائے، ممکن ہے کہ مفتی فتوی دے دے کہ فریضہ ادا ہو گیا لیکن قلب پر کوئی اثر پہنچ جائے۔ نہیں پہنچے گا جب تک اس چیز سے نہ بچے۔

آدمی چوریاں کرتا پھرے، اور ساتھ ہی روزے بھی رکھتا رہے، بے شک فریضہ ساقط ہو گیا۔ لیکن روزے کی وہ تاثیر کہ نفس پاک بن جائے، نہیں ہوگی، جب تک ایک طرف سے آلائش لگی ہوئی ہے کہ چوری، بدکاری کر رہا ہے، تو بدعملی سے بچنے پر ہی قلب میں نیکی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں، اس لئے شریعت کی تاکید ہے۔ اور علماء نے لکھا ہے کہ پہلے منکرات سے بچنے کی کوشش کرے، بدعملی سے بچے تاکہ نیکی تمہارے لئے کارآمد اور مفید ثابت ہو۔

وسائلِ منہیات سے احتراز...... ان منکرات میں پھر دو درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ تو آخری ہے جو اصل مقصد ہوتا ہے اور ایک درجہ اس کے وسائل کا ہے۔ شریعت وسائل سے بھی بچاتی ہے تاکہ مفسد سے آدمی خود بخود بچ جائے۔ مثلاً شریعت نے زنا سے روکا اور فرمایا ﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا﴾ ① زنا کے پاس بھی مت پھٹکو، اس لئے کہ وہ فحش اور بے حیائی کی حرکت ہے اور بدترین راستہ ہے جو انسان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے، اور آخرت میں بھی رسوا کرتا ہے، مقصود اصلی زنا سے روکنا ہے۔ لیکن زنا تک پہنچانے والے جو افعال تھے شریعت نے ان سے بھی روکا۔

حکم دیا گیا کہ عورت پر بری نگاہ بھی مت ڈالو، اجنبیہ کی طرف چل کر بھی مت جاؤ، اس کی خوشبو سونگھنے کی طرف بھی ناک کو متوجہ مت کرو، اس کی آواز پر بھی کان مت دھرو۔ حالانکہ آواز کا سن لینا کوئی گناہ نہ تھا، خوشبو کا ناک میں آجانا کوئی گناہ نہیں تھا، لیکن چوں کہ یہ ایک گناہ کا ذریعہ بنتا ہے، اس واسطے اس سے روک دیا گیا اور کہا

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۲۔

گیا کہ اس سے رکو ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ـ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ـ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴾ ① ''اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان والوں سے فرما دیجئے اپنی نگاہوں کو نیچا اور پست کریں۔'' اسی طرح ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ ﴾ ② اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

نگاہ نیچی رکھنے کا حکم کیوں بیان کیا گیا۔؟ اس لئے کہ نگاہ پڑے گی، تو قلب اس سے اثر لے گا، ممکن ہے کہ دل میں فتنہ پیدا ہو جائے یا برائی کا جذبہ پیدا ہو جائے، اس لئے وہیں سے روک دیا۔ اسی طرح سے عورت کی آواز کو بھی عورت کہا گیا ہے کہ اس کی آواز سننے کی بھی کوشش مت کرو۔ بعض دفعہ آواز کی تاثیر سے بھی آدمی کے قلب میں برے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے آواز سے بچایا گیا۔

حکمتِ حجاب...... یہی وجہ ہے کہ عورتوں لئے حجاب رکھا گیا کہ باہر نکلیں تو نقاب ڈال کر نکلیں، کھلے چہرے نہ نکلیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ الْمَرْاَةَ عَوْرَةٌ مَسْتُوْرَةٌ اِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطٰنُ.'' ③ عورت، مرد کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے، اس کا ناموس اور اس کی آبرو ہے، جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے تاکتا ہے کہ اب کتنوں کو مبتلا کروں گا۔ کسی کو بدنگاہی میں، کسی کو بدخیالی میں مبتلا کروں گا۔ اس واسطے ارشاد فرمایا گیا کہ: جب عورت باہر نکلے تو چہرے پر نقاب ڈال کر نکلے۔

پھر یہی نہیں فقط، یہ بھی کہا گیا کہ خوشبو لگا کر نہ نکلے۔ خوشبو لگا کر نکلی تو خوشبو پھیلنے پر خیالات متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کو بھی روک دیا گیا، بلکہ یہاں تک فرمایا گیا ''مَنْ اَصَابَتْ بُخُوْرًا فَهِيَ كَذَا وَكَذَا.'' ④ جو عورت خوشبو لگا کر باہر نکلی، وہ بمنزلۂ زنا کار کے ہے۔ گویا اس نے زنا کر لیا، اور زنا کا راستہ صاف کر دیا۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں یہاں تک بھی ہے کہ وہ گھر میں آ کر غسل کرے۔ اس نے ناپاکی کا راستہ اختیار کیا۔

ممانعتِ اختلاط...... پھر تاکید فرمائی گئی کہ جب عورت باہر نکلے اور نقاب ڈال کر نکلے تو راستے کے بیچ میں نہ چلے، کنارے پر چلے تاکہ مردوں سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہو۔ مسلم کا حق فرمایا گیا ہے سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا۔ عورت کو ممانعت کی گئی کہ اجنبی مردوں کو نہ سلام کرے اور نہ اس کے سلام کا جواب دے۔ یہ صرف اس لئے کہ عورت مرد کا اختلاط پیدا نہ ہو۔ یہی اختلاط برائیوں اور بدعملیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس سوسائٹی میں مرد عورت کا اختلاط بڑھ جائے گا یقیناً وہ سوسائٹی بدکار بن کر رہے گی۔ کتنا ہی وہ دعوے کرے کہ وہ تقویٰ شعار ہے مگر ناممکن اور محال ہے، اس لئے شریعت نے روکا کہ اجنبی مرد عورت کا خلط ملط نہ ہو۔

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۳۱.

③ الجامع للترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی کراھیۃ الدخول علی المغیبات، ج: ۴ ص: ۴۰۶.

④ الحدیث اخرجہ الامام مسلم فی صحیحہ ولفظہ: ایما امرأۃ اصابت بخوراً فلا تشھد معنا العشاء الآخرۃ، ج: ۲ ص: ۴۲۸.

اوّل تو بے ضرورت گھر سے باہر جانے کی ممانعت ہے، لیکن اگر کسی ضرورت سے جائے تو نقاب ڈال کر جائے، نقاب بھی ڈال کر جائے تو راستے کے کناروں پر چلے وسط میں نہ چلے، کناروں پر بھی چلے تو خوشبو لگا کر نہ چلے کہ وہ خود کو لوگوں کی تو جہالت کا ذریعہ بنائے۔ یہ سب چیزیں اس لئے کہ اختلاط نہ ہونے پائے۔

مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابیہ رضی اللہ عنہن کی شرکتِ جماعت کے لئے درخواست......

حدیث میں ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے جو ایک انصاری عورت صحابیہ رضی اللہ عنہا ہیں اور خیر القرون ہے۔ نیکی ہی نیکی مردوں اور عورتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ غرض ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک درخواست پیش کی اور عرض کیا "یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں مسجدِ نبوی میں آ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں میری نماز ہو"۔ کتنی پاکیزہ درخواست پیش کی!

اول تو نماز افضل العبادات ہے کہ اس سے اونچی کوئی عبادت نہیں، اس کی درخواست کی۔ پھر اس عبادت کی درخواست بھی کہاں کی؟ مسجدِ نبوی میں۔ جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے۔ کون سے امام کے پیچھے درخواست کی؟ جو عالم میں سب سے افضل ہستی اور ذاتِ بابرکات ہے۔ اور کس جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھنے کی درخواست کی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں جن کے بارے میں مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ امت میں بڑے سے بڑا قطب، غوث کسی مقام پہ پہنچ جائے۔ صحابیت کے مقام کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تمام امت سے بالاجماع افضل ہیں۔ تو کتنی پاکیزہ درخواست کی کہ افضل العبادات نماز کی درخواست تھی۔ بہترین اور اعلیٰ ترین مسجد میں نماز پڑھنے کی درخواست تھی۔ اعلیٰ ترین جماعت میں شامل ہونے کی درخواست تھی اور اعلیٰ ترین امام کے پیچھے نماز کی درخواست تھی۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: "صَلٰوتُکِ فِیْ دَارِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوتِکِ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا. " تیرا نماز گھر میں پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ پھر فرمایا: "وَصَلٰوتُکِ فِیْ بَیْتِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوتِکِ فِیْ دَارِکِ. " اور گھر کے صحن میں نماز پڑھنے سے بہتر گھر کے دالان میں نماز پڑھنا ہے۔ پھر فرمایا: "وَصَلٰوتُکِ فِیْ مِخْدَعِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوتِکِ فِیْ بَیْتِکِ. " "اور گھر میں بھی اندر کی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ گھر کے دالان میں نماز پڑھنے سے۔" ①

گویا اس کا مطلب یہ نکلا کہ جس حصے میں پردہ بڑھتا گیا، اس حصے میں افضلیت بڑھتی گئی ہے۔ مسجد میں جانے کی بہ نسبت گھر میں عورت زیادہ پردہ نشیں ہے تو اس میں نماز افضل قرار دی گئی، پھر گھر کے صحن سے دالان میں زیادہ پردہ ہے کہ آسمان سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں بہ نسبت صحن کے افضل ہے، پھر اندر کی کوٹھڑی

① مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الصلوٰة، باب من کرہ ذالک (خروج النساء الی المسجد) ج: ۲ ص: ۲۷۷.

دالان سے زیادہ افضل ٹھہرائی گئی کہ اس میں اور بھی زیادہ پردہ ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جتنا زیادہ پردہ ہوگا، جتنا زیادہ چھپنا ہوگا، اتنی ہی زیادہ افضلیت عورت کے لئے بڑھتی جائے گی۔

حتیٰ کہ مسجدِ حرام و مسجد ابراہیمی مکہ مکرمہ میں جس کے حج کے لئے عالم جاتا ہے۔ جو ہم سب کی عبادت کا مرکز ہے کہ جب تک ہماری اپنی مسجد کا رخ مسجدِ حرام کی طرف نہیں ہوگا اس وقت تک قبول نہیں ہوگی۔ گویا ہر مسجد، مسجدِ حرام کی طرف رخ کئے ہوئے ہے۔ اس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ: ''وہاں ایک نماز پڑھنا، ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے''۔

گویا ایک لاکھ گنا اجر ملتا ہے۔ لیکن عورت کے لئے یہ افضلیت نہیں رکھی گئی۔ عورت وہاں بھی اگر گھر میں پڑھے گی تو اس نماز سے زیادہ افضل نماز ہوگی جو کہ وہ مسجدِ حرام میں نماز پڑھتی۔ تبرکاً آدمی عورت کو اجازت دے دے کہ وہ کسی نہ کسی وقت جا کے مسجد حرام میں نماز پڑھ لے۔ لیکن وہ اتنی پابندی نہ کرے کہ دھوپ ہو، گرمی ہو، کسی نہ کسی طرح پہنچے۔ فرمایا افضل یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھے، اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ وہاں اجنبی مردوں کا ہجوم ہے، اختلاط زیادہ پڑھے گا، ممکن ہے کہ قلب میں کوئی فساد پیدا ہو جائے۔ ممکن ہے کوئی برائی آ جائے، ممکن ہے کوئی برائی پیدا ہو۔ تو شریعت چاہتی ہے کہ نفسِ انسانی کو پاک بنایا جائے جس میں خیالات بھی برے پیدا نہ ہوں، اس لئے ان اسباب کو قطع کیا جائے گا جن سے کوئی بدخیالی پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ کیفیت کیوں ہے؟ دراصل اسے اُسی بری حرکت سے بچانا ہے، یہ چیزیں اس برائی کا جسے زنا کہتے ہیں، ذریعہ بن سکتی تھیں، تو یہیں سے روک دیا گیا۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع کہتے ہیں۔ یعنی وسائل سے روک دیتے ہیں تا کہ آدمی مقاصد سے بچ سکے۔ اگر وسائل اور ذرائع میں پھنس گیا تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور مقصد تک پہنچ جائے گا۔

طریقِ تربیت ...... حدیث میں ہے کہ: '' مَآ اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ. '' ① جس چیز کے بہت سے حصے میں نشہ ہے اس کا تھوڑا حصہ بھی ناجائز ہے۔ شراب کا جیسے ایک گھونٹ ممنوع ہے، ایک قطرہ چکھنا بھی ممنوع ہے، حالاں کہ ایک قطرہ پینے سے نشہ نہیں پیدا ہوتا، اور شراب نشے کی وجہ سے حرام کی گئی ہے، تو ایک قطرہ پی لینا جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس میں حکم کی علت نہیں پائی جاتی اور وہ نشہ ہے۔ جب ایک قطرہ چکھنے میں نشہ نہیں ہے تو جائز ہوتا، مگر اسے ناجائز قرار دیا گیا۔ کیوں۔؟ اس لئے کہ جس نے آج ایک قطرہ چکھا ہے، وہ کل ایک گھونٹ بھی پیئے گا۔ اور جو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، وہ کل کو ایک گلاس بھی پیئے گا۔ اور جو پرسوں کو ایک گلاس پیئے گا وہ چند دن کے بعد شرابی بن جائے گا۔ شرابی بننے سے روکنا اصل مقصود ہے۔ تو ایک قطرہ سے رکاوٹ شروع کی تا کہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حدیث میں ہے کہ: ''مَنْ اَتٰى عَرَّافًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

① السنن لابن ماجه، كتاب الاشربة، باب ما اسكر كثيره فقليله حرام ج: ١٠ ص: ١٧١ حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجه ج: ٧ ص: ٣٩٣ رقم: ٣٣٩٣.

وَسَلَّمَ." ① "حدیث میں ہے کہ: جو کسی جادوگر کے پاس گیا اس نے شریعتِ محمدی کے ساتھ کفر کیا"۔ حالاں کہ کفر جب ہوتا ہے جب آدمی توحید کا انکار کر دے، نبوت کا انکار کر دے قیامت کا انکار کر دے، تب کفر لازم ہوتا ہے۔ جادوگر کے پاس جانے سے تو بظاہر کفر نہیں آنا چاہئے۔

مگر اسے کفر کیوں قرار دیا گیا؟ نتیجے کے اعتبار سے کہ جو آج جادوگر کے پاس گیا ہے تو اوّل تو اس کے دل سے جادو کی برائی نکلے گی۔ کل کو وہ فرمائش کرے گا کہ تو کچھ جادو کر۔ پرسوں کو وہ سیکھے گا کہ مجھے بھی یہ تعویذ اور منتر سکھلا دے اور ترسوں کو اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا۔ اس سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے ہی سے روک دیا گیا۔ کہ جادوگر کے پاس جاتے ہی کیوں ہو؟ اور یہ نوبت آئے ہی کیوں۔؟ تو یہ سدِ ذرائع ہے کہ وسائل سے روک دیتے ہیں تا کہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچ پائے۔

آج کی عورت کا تمدّن...... اب آج کی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو ہم سب سے زیادہ منکرات میں گرفتار ہیں۔ یعنی کہا تو یہ گیا ہے کہ اجنبی عورت باہر نہ نکلے بے پردہ نہ نکلے، آج عورتوں کا کیا' قوم کا شعار اور تمدن یہ بن گیا ہے کہ جتنی عورت زیادہ سے زیادہ باہر جائے اسے تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ حدیث میں صاف فرمایا گیا اور خبر دی گئی کہ "رُبَّ كَاسِيَاتٍ عَارِيَاتٍ مَائِلَاتٍ مُمِيلَاتٍ لَايَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ." ② بہت سی عورتیں جو لباس پہنی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی ننگی ہیں۔ وہ نکلیں گی کہ لباس بھی پہنے ہوں گی، مگر پھر بھی عریاں ہوں گی، خود بھی اجنبیوں پر مائل ہوں گی، دوسروں کو بھی اپنی طرف مائل کریں گی ان کو جنت میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جنت کا مقامِ کریم ان کا ٹھکانا نہیں ہوگا جب تک انہیں سزا دے کر پاک نہ بنایا جائے یا جو بھی اللہ چاہے، ایکا ایکی وہ اس مقامِ کریم میں داخل ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔

فرمایا گیا کہ ایک وقت آئے گا کہ عورتوں کے سر ایسے ہوں گے جیسے اونٹ کی کوہان حرکت کرتی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی بال اس طرح سے بنائیں گی جیسے اوپر ایک ٹوکرا سا رکھا ہوا ہو اور معلوم ہو کہ اونٹ کی کوہان ہے۔ آج ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے۔ اسی طرح سے مائلات بھی ہیں اور ممیلات بھی ہیں اور کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں۔

لباس کی عریانی...... لباس پہنے ہوئے ہیں اور پھر عریاں ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لباس ہی ناقص ہو۔ جیسے آج کل ہے کہ پنڈلیاں بھی کھلی ہوئی ہیں بازو بھی کھلے ہوئے ہیں۔ سینہ بھی کھلا ہوا، پشت بھی کھلی ہوئی اور سر بھی کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ عورت کا بدن گردن سے لے کر ٹخنوں تک ستر قرار دیا گیا ہے کہ اس کو وہ نہ چھپائے تو نماز نہیں ہو سکتی۔ سوائے خاص حالتوں کے۔ تنہائی میں بھی اس کا چھپانا ضروری ہے۔ چہ جائے کہ بھرے مجمعوں

---

① الصحيح لمسلم، كتاب السلام، باب تحريم الكهانة، ص: ١٠٧٤، رقم: ٥٨٢١.

② الصحيح لمسلم، كتاب اللباس والزينة، باب النساء الكاسيات...... ص: ١٠٥٨، رقم: ٥٥٨٢.

میں عورتیں ستر کھول کر نکلیں۔ تو ایک تو لباس کے ناقص ہونے کی وجہ سے عریانی ہو اور لباس ہی ناتمام ہو کہ گھٹنے ٹخنے سب ننگے۔ اور ایک یہ کہ لباس تو پورا ہو، گردن سے لے کر ٹخنے تک سب بدن چھپا ہوا، لیکن اتنا باریک ہو کہ چھپنے کے باوجود بدن اندر سے ڈھپک رہا ہے۔ یہ بھی کاسیات اور عاریات میں داخل ہے کہ لباس بھی ہے اور عورت پھر بھی ننگی ہے۔ اتنا باریک لباس نائیلون کا پہن لیا کہ وہ لباس نظر نہیں آتا، مگر بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس سر سے پیر تک ہو اور موٹے کپڑے کا ہو مگر بدن کے اوپر اتنا چست ہو کہ بدن کی ساری حیثیت نمایاں ہو رہی ہے۔ یہ بھی اس کا فرد ہے۔ جیسے آج کل ہم سنتے ہیں کہ ایک لباس چلا ہے جسے ٹیڈی کہتے ہیں کہ پاجامہ ہے تو وہ اتنا کسا ہوا اور چست ہے کہ اس میں ران اور پنڈلی کی پوری حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ نظر نہ آئے۔ غرض ایک عُریانی یہ ہے کہ لباس ناتمام ہو، اور ایک یہ کہ لباس پورا ہو مگر اتنا باریک ہو کہ بدن کو چھپا نہ سکتا ہو۔ اور ایک یہ کہ لباس پورا بھی ہو اور موٹا بھی ہو مگر چست اتنا ہو کہ بدن کی حیثیت نمایاں کرتا ہو۔ یہ سب کاسیات و عاریات کہ لباس پہنے ہوئے ہو کر بھی عریانی کے افراد میں داخل ہیں۔ اس کو فرمایا گیا: ''لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ.'' وہ جنت کی ہوا نہیں پائیں گی، مقامِ کریم تک نہیں پہنچیں گی۔ انہیں رضائے خداوندی کا مقام حاصل نہیں ہوگا۔ آج نماز، روزہ جتنا ضروری ہے ان سے زیادہ ان چیزوں سے بچنا اور بچانا ضروری ہے کہ ہم خود بھی بچیں اور اپنی نسلوں کو بھی بچائیں اور اپنی عورتوں کو بچائیں۔

اجتنابِ منکرات کی تاکید...... شریعت نے یہاں تک اس کی تاکید کی ہے کہ حقیقی بہن بھائی ہوں، ابھی جوان بھی نہیں ہوئے، دس گیارہ برس کے ہیں تو فرمایا گیا کہ: دونوں کو تنہا مکان میں مت چھوڑو، ایک چارپائی پر شریعت نے دو بہن بھائی کو لیٹنے کی اجازت نہیں دی، حالاں کہ حقیقی بہن بھائی ہیں۔ ابھی بالغ بھی نہیں ہیں۔ مراھقت کا درجہ ہے۔ دس گیارہ سال کی عمر ہے۔

مثل مشہور ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ شیطان کو آتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے۔ شریعت رحیم و کریم ہے وہ ایسے اسباب ڈالتی ہے کہ ہر انسان مقدس اور منزّہ بنے، پاک اور پارسا بنے، تو ان اسباب سے بچنا پڑے گا جو تقویٰ و طہارت اور پارسائی میں حارج ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ جتنا کہ فرائض کا انجام دینا ضروری ہے، ایک طرف آپ نماز پڑھیں اور ایک طرف گھر کی معاشرت جو بدکاری کی طرف جارہی ہو اسے نہ روکیں تو وہ نماز بھی اپنا اثر نہیں دکھائے گی جب تک ان چیزوں سے بچاؤ نہ ہو، دوا اثر نہیں دکھلائے گی، جب تک پرہیز نہ کیا جائے، ایک طرف تو زکام کی حالت میں آپ نے گلِ بنفشہ پیا اور دوسری طرف آپ نے سیر بھر دہی برف ملا کر پی لیا، تو گل بنفشہ کا ایسے میں کیا اثر ظاہر ہوگا۔؟ غرض منکرات سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے، جتنا کہ معروف چیزوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

سوسائٹی کی تباہی کے عوامل...... اور منکرات میں بھی چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، مجھے حضور نے فرمایا اے عائشہ! ''اِیَّاکِ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ.'' حقیر گناہوں سے زیادہ بچنے کی کوشش کرو، بڑے بڑے گناہوں سے تو آدمی کبھی وضع داری اور ظاہرداری کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ ایک اچھی سوسائٹی میں بیٹھنے والا کبھی کھلے بندوں شراب نہیں پیئے گا۔ اس کا جی تو چاہتا ہے مگر خیال یہ ہے کہ دنیا کیا کہے گی کہ ایسا بڑا آدمی اور شراب خانوں میں بیٹھا ہے۔ تو اس سے بچنا کبھی سوسائٹی کی وجہ سے بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے گناہ جن کی طرف کسی کی بھی نگاہ نہیں جاتی، انہیں آدمی کرتا رہتا ہے۔ اس کو یہ سمجھتا ہے کہ وضع داری کے خلاف مجھ پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ان سے بچنے کی زیادہ کوشش کرو، وہی آدمی کے قلب کا ناس مارتے ہیں، آپ اجنبیہ کی طرف نگاہ ڈال دیں کوئی دیکھنے والا نہیں، کوئی بھی نہیں سمجھے گا، لیکن اس سے بچنا، اس سے زیادہ ضروری ہے جتنا زنا سے بچنا کیوں کہ آگے بڑھنے کا یہی راستہ ہے۔

تو ''اِیَّاکُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ.'' ① سب سے زیادہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچو جن کو آدمی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی گناہ ہوگا۔ اور کر بھی لیتا ہے۔ اور انجام کار وہ بڑی برائی کی طرف پہنچا دیتے ہیں۔ سوسائٹی جو تباہ ہوتی ہے۔ وہ منکرات سے تباہ ہوتی ہے۔ اس واسطے ان سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

اخلاقی جرأت کے بغیر استیصالِ جرائم ممکن نہیں ...... اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ قلب کے اندر پارسائی کا جذبہ پیدا نہ کرلیا جائے، یعنی دوسرے روکتے ہیں اور آپ رکتے ہیں۔ اسے رکنا نہیں کہتے، یہ تو مجبوری کا رکنا ہے، آپ کے قلب کے اندر خود داعیہ پیدا ہو کہ مجھے رکنا چاہئے اگر قانون آپ کو روکے اور آپ رک جائیں، یہ مجبوری کا رکنا ہے۔ ہزاروں جرائم اور ہزاروں برائیاں ہیں کہ قانون سے ان کا استیصال نہیں ہوسکتا، قانون سے وہ جرائم بند نہیں ہوسکتے جب تک خود انسان میں بچنے کی اخلاقی جرات نہ ہو اور اپنے اندر جذبہ نہ ہو۔

ایک تھیلی میں بھرا ہوا تین لاکھ روپیہ ایک تنہا مکان میں رکھا ہوا ہے، وہاں پولیس کا بھی کوئی آدمی نہیں، سی آئی ڈی کا بھی کوئی آدمی نہیں۔ اگر آپ اٹھالیں کوئی روکنے والا نہیں۔ پھر بھی اگر آپ رکتے ہیں۔ تو کیوں رکتے ہیں؟ اللہ کا خوف آپ کو رکاوٹ ڈالتا ہے۔ تو اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے، پولیس نہیں بچا سکتی۔

قوانین کی کثرت سے جرائم کم نہیں ہوسکتے ...... اگر پولیس سے، ہتھیاروں سے، اور فوجی قوتوں سے گناہوں سے روکا جاسکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی، نہ پولیس کی کمی، نہ ہتھیاروں کی کمی۔ زمانے میں کبھی ایسے نئے نئے ہتھیار نہیں دیکھے گئے جتنے آج کے زمانے میں ہیں، فوج کی اتنی تعداد دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے۔ پولیس اتنی کبھی نہیں، جتنی آج ہے۔ حتیٰ کہ راستے راستے پر پولیس ہے۔ لیکن یہ چیزیں بڑھتی جارہی ہیں جرائم بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ بناؤ ہی ہے کہ جرائم کا روک لینا، پولیس

① مسند احمد، حدیث ابی مالک سھل بن سعد الساعدیؓ ج: ۴۶ ص: ۲۹۲. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترھیب للالبانی، الترغیب فی الامر ج: ۲ ص: ۳۲۴.

کا کام نہیں ہے، محض قانون کا کام نہیں، جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو، اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا۔

تقویٰ شعار ہی جرم سے بچتا ہے...... حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ جو خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہی سنایا تھا کہ وہ سہارنپور کا سفر فرما رہے تھے۔ اور سہارنپور کے گنے مشہور ہیں، بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ تو دو تین دھڑی گنے خرید لئے۔ اتفاق سے ساتھ میں دو ایک مسلمان چیکر بھی تھے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "بھائی! کانٹے پر جا کر انہیں تلوا دو۔ تاکہ محصول ادا کر دوں"۔ وہ جو چیکر ساتھ تھے، انہوں نے کہا، حضرت! اس کی ضرورت نہیں، ہم ہی تو چیک کرتے ہیں اور ہم ساتھ چل رہے ہیں۔ آپ بے تکلف رکھیئے۔ فرمایا "بھائی! مجھے آگے جانا ہے"۔ انہوں نے کہا، آگے آپ کہاں جائیں گے؟ فرمایا "فی الحال تو میں کانپور جا رہا ہوں۔ اور آپ لوگ غازی آباد میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ دلی چلیں جائیں گے۔ پھر آگے کیا ہوگا؟ وہ دوسرے چیکر آئیں گے۔ اور وہ ڈبل محصول لیں گے، ممکن ہے کہ وہ جرمانہ بھی ڈالیں، تو آپ مجھے بتلا کرنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے کہا کہ ہم غازی آباد میں اس گاڑی کے چیکر کو کہہ دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں روکیں گے۔ فرمایا "جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور دروازے سے باہر جاؤں گا تو وہاں ٹکٹ لینے والا کھڑا ہوگا، وہ کہے گا۔ انہوں نے کہا۔ ہم ان چیکروں کے ذریعے اس بابو سے بھی کہلوا دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں چھیڑے گا۔

اس پر فرمایا "بھائی! مجھے اور آگے جانا ہے۔" انہوں نے کہا، حضرت! آگے اور کہاں جانا ہے۔ بس آپ گھر پہنچ گئے، فرمایا، "اس سے بھی آگے جانا ہے"۔ "مجھے اللہ کے پاس بھی تو جانا ہے، مجھے اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے اگر چیکر نے چھوڑ دیا اور گھر تک پہنچ گیا، مگر قبر اور حشر میں میرا کیا حال ہوگا۔ پھر مجھ سے گرفت ہوگی کہ تم نے کیوں یہ ناجائز حرکت کی؟ تم نے قانون کی یہ چوری کیوں کی۔؟ اس وقت میں کیا جواب دوں گا؟ اس لئے آپ مہربانی کر کے تلوا دیں، میں یہیں سے محصول دیئے دیتا ہوں تاکہ میں دنیا اور آخرت کی گرفت سے بچا رہوں"۔

یہ چیز تھی جس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بچایا، اور ہر مسلمان کو بچانے والی چیز یہ "خوفِ خداوندی" ہے جو قلب کے اندر ہوتا ہے، یہ جرائم سے بچاتا ہے، قانون منظر عام کی برائیوں کو روک سکتا ہے، اگر آپ کھلے بندوں ڈکیتی ڈال رہے ہوں یا کھلے بندوں بدامنی کی، پولیس آ کر آپ کو پکڑ لے گی، مگر جہاں تنہائی میں چھپ کر بدامنی ہوتی ہے، جہاں پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو وہاں بچانے والا کون ہے، وہ تو وہی اپنا ضمیر اور اپنا قلب بچائے گا۔ تو سب سے بڑی پولیس وہ قلب کا جذبہ ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، ایک بھی پولیس نہ ہو اور قلب کے اندر جذبہ موجود ہو آدمی خود بخود دبکے گا۔

انسدادِ جرائم میں پارلیمنٹ کی ناکامی...... دو واقعے مجھے یاد آئے۔ اور دونوں میں فرق کا آپ اندازہ کریں۔ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کچھ عرصہ ہوا ہے کہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا کر شراب کی بندش ہونی

چاہئے۔ چناں چہ جتنے ذمہ دارانِ حکومت تھے وہ اس پر متفق ہوگئے کہ شراب کو بند ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو شراب بندی کا قانون بنائے۔ اس کے لئے کتنے لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ برس ڈیڑھ برس میں وہ قانون تیار ہوگا تو قانون بنانے والوں کی تنخواہیں دی جائیں گی، دفتری اخراجات ہوں گے، تو لاکھوں روپے کا بجٹ منظور ہوا۔ برسوں میں وہ قانون تیار ہوا۔ جب قانون بن گیا، اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا، اس کی پہلی خواندگی ہوئی۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے منظور کر کے یہ حکم جاری کیا کہ پبلک میں اس کا اشتہار دیا جائے اور اس قانون کو عام کیا جائے، تاکہ اس کے بارے میں رائے عامہ معلوم ہو۔ اس کی لکھائی چھپائی اور رائج کرنے کے لئے کئی لاکھ روپے کا بجٹ منظور ہوا، تاکہ اس قانون کو چھاپ کر پورے ملک میں شائع کریں۔ تاکہ جتنے اہل فکر ہیں وہ اس پر رائے زنی کریں۔

ایک عرصے تک اس کو منتشر رکھا گیا اور پھیلایا گیا، تاکہ لوگ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں۔ جب رائیں آگئیں پھر وہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا، پارلیمنٹ نے اس کو منظور کیا، اب اس کو چلانے کے لئے کئی کروڑ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ زائد پولیس رکھی جائے جو اسے جاری کرے اور نافذ کرے، تاکہ اہلِ ملک اس پر عمل کریں، گویا کروڑوں روپے خرچ کر کے قانون بنا اور وہ جاری کر دیا گیا۔ پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایک برس کے بعد رپورٹ کرے کہ اس پر عملدر آمد کیسا رہا، اور اس کے کیا اثرات نمایاں ہوئے؟ برس دن کے بعد پولیس نے رپورٹ دی کہ پہلے اگر شراب پینے والے پچاس ہزار تھے تو اب ایک لاکھ بن گئے ہیں۔ یہ اس کا اثر نمایاں ہوا۔ اور وہ کیوں نمایاں ہوا؟

اس لئے کہ پہلے شراب خانے کھلے ہوئے تھے، ہزاروں آدمی پیتے تھے۔ مگر بہت سے وضعدار لوگ اس لئے نہیں پیتے تھے کہ ہماری ساکھ پر دھبہ آئے گا، لوگ ہمیں برا سمجھیں گے کہ یہ شرابیوں کی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں، وہ بچتے تھے اور اکا دکا آدمی چھپ چھپا کر پی لیتا تھا۔

لیکن جب قانون کی بندش ہوگئی، اور سب کو روک دیا گیا تو سب نے بلیک کر کے اسے چوری سے پینا شروع کیا، تو جو لوگ وضعداری کی وجہ سے کھلم کھلا نہیں پی سکتے تھے، انہوں نے کہا کہ اب جب سارے چوری سے پی رہے ہیں تو ہم بھی چوری سے پینے لگیں، تو پہلے پینے والے پچاس ہزار تھے، اب ایک لاکھ بن گئے۔ یہ گویا اس قانون کا نتیجہ نکلا۔ گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے کہا کہ یہ حکومت کے وقار کے خلاف ہے کہ اس قانون کو واپس لیا جائے۔ قانون جاری رہے اور پولیس دارو گیر کرتی رہے تو قانون بھی چلتا رہا۔ اور شراب خوری بھی چلتی رہی۔ دونوں چیزیں اپنی جگہ رہیں۔ انسداد نہیں ہوسکا، بالکل شراب بند نہیں ہوسکی، پینے والے پیتے رہے، چوری سے پیتے رہے گویا وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ اکارت گیا جو صرف کیا گیا تھا۔ جو پہلے صورت تھی وہی اب ہے بلکہ بری ہوگئی کہ چھپ چھپ کر لوگ پیتے ہیں ایک تو یہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ اور ایک دوسرا واقعہ سامنے رکھئے۔

انسدادِ جرائم میں اسلام کا طریق کار...... اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں شراب عام تھی، تمام عرب پیتے

تھے، شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، حتی کہ بچہ پیدا ہوتا تو پہلے اس کو شراب چٹاتے تھے۔ اتنی شراب عام تھی۔ اسلام آنے کے بعد بھی شراب رائج رہی، لوگ پیتے رہے۔ مسلم بھی ہیں اور پیتے بھی رہے۔ لیکن جب وقت آیا کہ شراب کو بند کیا جائے، تو ایکا ایکی حکم نہیں دیا گیا کہ روک دو، سب سے پہلے چیز یہ تھی کہ قلوب میں ایک سوال پیدا ہوا۔ قرآنِ کریم نے اس کو نقل کیا۔ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ ① اے پیغمبر! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں" ﴿قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ② آپ فرما دیں کہ جوئے اور شراب میں کچھ نفع ہے، کچھ نقصان ہے، مگر نقصان غالب ہے، نفع مغلوب ہے۔ نقصان زیادہ ہے نفع کم ہے۔

﴿اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ ③ شراب اور جوے کا نقصان زیادہ ہے، نفع کم ہے۔ بس اتنی آیت نازل ہوئی، شراب پینے کی ممانعت نہیں فرمائی گئی، صرف اس کی مذمت بیان کی گئی، تو حدیث میں ہے کہ: بہت سے وہ خواص صحابہ رضی اللہ عنہم جو منشاءِ نبوّت کو سمجھتے تھے، انہوں نے آج ہی سے شراب ترک کر دی کہ جب اللہ تعالیٰ نے نقصان بیان کیا ہے تو شراب پسند معلوم نہیں ہوتی۔

غرض بہت سے حضرات نے تو اسی دن ترک کر دی تھی۔ لیکن کچھ لوگ پیتے بھی رہے۔ چند دن کے بعد ایک دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور ایک دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ ④ اے ایمان والو! شراب پی کر نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو"۔ تو نمازوں کے اوقات میں شراب ممنوع قرار دی گئی۔ نمازوں کے اوقات کے سوا لوگ پیتے رہے، نماز کی حالت میں شراب پی کر جانا حرام قرار دیا گیا، گویا پانچ اوقات میں بندش ہوئی، باقی اوقات میں جائز ہوئی۔ اس آیت کے اترنے کے بعد ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے شراب ترک کر دی کہ رخ یہ بتلا رہا کہ یہ ممنوع کی جائے گی، اللہ کو یہ پسند نہیں ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد تیسرا حکم نازل ہوا ﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ ⑤ "اے اہل ایمان! یہ شراب اور جوا، اور یہ فال نکالنے کے تیر و ترکش یہ شیطانی حرکتیں ہیں ان کے پاس بھی مت پھٹکو۔ آج مکمل طور پر شراب حرام ہوئی"۔ حدیث میں ہے کہ: جس دن یہ آیت نازل ہوئی ہے، جس کے گھر میں دس مٹکے تھے، اس نے وہ پھوڑ دیئے، جس کے ہاں ایک مٹکا تھا، اس نے وہ توڑ دیا، اور مدینے کی گلیوں میں، نالیوں میں شراب اس طرح بہتی پھر رہی تھی جیسے برسات میں پانی برستا ہے۔ ایک قطرہ کسی کے گھر میں باقی نہیں رہا۔

تو آپ نے فرق دیکھا کہ امریکہ نے کئی کروڑ کا بجٹ منظور کیا اور ثمرہ یہ نکلا کہ پینے والے دگنے ہو گئے، اسلام کے دور میں نہ بجٹ منظور ہوا، نہ ایک کروڑ کا، نہ ایک پیسے کا۔ ممانعت کا حکم بھی پوری طرح سے نہیں آیا کہ

---

① ② ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۱۹.

④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۴۳. ⑤ پارہ: ۷، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۹۰.

لوگوں نے شراب کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ اور ایک ایک گھر پاک اور صاف ہو گیا۔

قانونِ حکومت اور قانونِ الٰہی کا فرق...... فرق کیا تھا؟ وہاں قانون کا دباؤ تھا، یہاں اللہ کا خوف تھا، خوفِ خداوندی آیا تو شراب کا استیصال ہو گیا اور جڑ کٹ گئی، وہاں قانونِ محض کا دباؤ تھا۔ تو قانونِ محض سے جرائم بند نہیں ہوا کرتے جب تک اپنے قلب میں اللہ کا خوف اور ڈر موجود نہ ہو۔ تو شریعتِ اسلام برائیوں اور منکرات سے بچانا چاہتی ہے، مگر دباؤ سے نہیں۔ اس کے ذریعے بچانا چاہتی ہے کہ خود تمہارے ضمیر کے اندر دباؤ پیدا ہو۔ ضمیر خود کہے کہ یہ بری چیز ہے۔ ہم اسے چھوڑنا چاہتے ہیں۔

حقیقتِ معصیت...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''مَا الْإِثْمُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ .'' یا رسول اللہ، گناہ کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ شراب پینا گناہ ہے، زنا کرنا گناہ ہے، چوری کرنا گناہ ہے، یہ نہیں فرمایا۔ کیا فرمایا؟ ''مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ'' ① ''تم پوچھتے ہو گناہ کیا ہے؟ جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے وہ گناہ ہے۔ اسے ترک کر دو، جس کو تم کھلے بندوں نہ کر سکو، لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے شرماؤ، سمجھ لو، وہ برائی ہے اور گناہ ہے، بس اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ گویا گناہ سے بچنے کا تعلق قلب سے رکھا گیا۔ ماحاک في صدرک، جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کر دے، اس سے بچو۔ یہ نہیں کہا گیا جس سے پولیس روکے اس سے بچو، جس سے حکومت اور فوج روکے اس سے بچو، اس لئے کہ وہ منظرِ عام کی چیزوں سے روکیں گی، اور دل میں تمہارے کھوٹ رہا تو آنکھ بچا کے پھر تم وہی حرکت کرو گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دل پاک ہو۔ فقط ہاتھ اور پیر کے پاک ہونے سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ جب چور کو جیل میں بند کر دیتی ہے۔ وہ یقیناً اتنے دن چوری سے بچا رہے گا جتنے دن جیل میں رہے، لیکن اس کے قلب سے چوری کا جذبہ نہیں نکلتا، وہ اس ارادے میں ہے کہ جب چھوٹوں گا پھر آ کر وہی حرکت کروں گا۔ بلکہ بعض چور تو یہ کہتے ہیں کہ گھر ویسی اچھی روٹی نہیں ملتی جتنی آزادی سے جیل میں ملتی ہے، اس لئے ایک دفعہ پھر چوری کروں تاکہ بڑے گھر میں پہنچ جاؤں، بے محنت روٹی ملے گی۔ اسلام چاہتا ہے کہ قلوب پاک کئے جائیں، قانون فقط بدن کو پاک کرے گا، قلب کو پاک نہیں کرے گا، دنیوی حکومتوں کا قانون بدن پر نافذ ہوتا ہے، لیکن اللہ کا قانون دلوں پر نافذ ہوتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ حکام کی حکومت فقط ظاہر پر ہوتی ہے۔ اللہ کی حکومت باطن کے اوپر بھی ہے، اس کا قانون جیسے ظاہر کو روکے گا، ویسے باطن کی برائی کو بھی روکے گا، تو شریعت تو یہی چاہے گی کہ فقط یہ نہ ہو کہ تم زنا سے بچ جاؤ، یہ ہو کہ زنا کا خیال بھی نہ لاؤ، بلکہ یہ ہو کہ تمہارے قلب میں زنا سے اس طرح نفرت ہو جائے جس طرح نجاست سے نفرت ہوتی ہے، شراب خوری سے تمہیں اس طرح نفرت ہو جیسے پیشاب پاخانے سے نفرت ہوتی

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة، باب تفسير البر والاثم، ص: ١١٢٦، رقم: ٢٥١٦.

ہے۔ یہ جب ہوگا۔ جب قلب پاک ہوگا۔

تربیت کا مرکزی نقطہ...... تو سب سے بڑی چیز اسلام میں ''تزکیۂ قلوب'' یعنی دلوں کو پاک بنا دینا ہے تا کہ جذبات صالح پیدا ہو جائیں، برے جذبات مغلوب ہو جائیں۔ مطمئن ہو کر رہیں، اس لئے فرماتے ہیں کہ ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ﴾ ① فلاح وہ پائے گا جو اپنے نفس کو پاک کرے گا۔ یہ نہیں کہا کہ فلاح وہ پائے گا جو برائی چھوڑ دے گا اور برے عمل سے بچ جائے گا، عمل چھوڑ دیا مگر دل میں کرنے کی تمنا ہے۔ جبری طور پر اس نے چھوڑ دیا، صلاح اور فلاح پانے والا وہ ہے جس کا قلب پاک ہو جائے، اس میں برائی سے نفرت بیٹھ جائے۔ اور قلب خود یوں کہے کہ اس برائی کو مت کرو۔ اسی کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہ شراب اور زنا نہیں بلکہ ماحاک فی صدرک، جب تمہارا دل یوں کہے کہ یہ برائی ہے تو اس برائی کو چھوڑ دو، وہی فی الحقیقت برائی ہے، تو انسان کی پاکی کا دارومدار اس کے قلب کے اوپر ہے، قلوب صحیح ہو گئے تو قالب بھی صحیح ہو گیا، قلب فاسد ہیں تو قالب بھی فاسد ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وَفِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ.'' ② انسان کے بدن میں گاجر کی شکل کا ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جو بائیں طرف لٹکا ہوا ہے، وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے۔ وہ فاسد ہے تو سارا انسان فاسد ہے۔ فرمایا: ''اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ'' آگاہ ہو جاؤ، وہ انسان کا قلب ہے، اگر آپ کا دل درست ہے تو بدن بھی درست ہے اور دل میں کھوٹ ہے تو سارے بدن میں کھوٹ ہے۔

اس لئے کہ دل ہی کے حکم سے آپ برا یا اچھا عمل کرتے ہیں۔ دل میں خیال آتا ہے، خیال سے ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ ارادے سے عمل ظاہر ہوتا ہے، اگر قلب میں فساد ہے تو خیالات بھی برے پیدا ہوں گے۔ برے خیالات سے برے ارادے پیدا ہوں گے۔ برے ارادوں سے اعمال بھی برے سرزد ہوں گے، اس لئے شریعت چاہتی ہے کہ بجائے اس کہ تم ہاتھ پیر کو مانجھو، دھوؤ اور صاف کرو، تم قلب کو کیوں نہیں دھوتے، اس کو اگر تم نے دھولیا اور پاک کرلیا، تو سارا بدن خود بخود پاک ہو جائے گا۔

تطہیر قلب...... اور قلب کی پاکی ذکر اللہ کی کثرت اور اللہ کے خوف کا مراقبہ کرنے سے ہے کہ آدمی سوچے، بہر حال ایک وقت مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اپنی زندگی کا جواب دینا ہے۔ میں کیا جواب دوں گا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کی حجت میں نے پہلے تلاش نہ کرلی ہو، تاکہ اللہ کے سامنے کہہ سکوں کہ فلاں بات فلاں حجت سے کی۔ محض نفسانی جذبہ سے نہیں کی تھی۔ تو قلب حجت تلاش کرلے کہ جو بھی کرو، اس کی کوئی ایسی قابل قبول وجہ ہو کہ اللہ کے سامنے عرض کرسکو، کہ یہ وجہ پیش آئی۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الشمس، الآیۃ: ۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب من استبرأ لدینہ، ج: ۱، ص: ۲۸، رقم: ۵۲.

تو اللہ سے زیادہ عذر کا سننے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا عذر لے کر پہنچیں گے، یقیناً آپ کی بات مانی جائے گی۔

کسی بھی گناہ کے کرنے پر یہ نہیں کیا جائے گا کہ ایک دم سزا دے دی جائے، اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔ پوچھا جائے گا، اس کو کیوں کیا۔؟ کوئی عذر تمہارے پاس ہے۔؟ اگر کوئی معقول عذر بیان کیا، معاف کیا جائے گا، کوئی عذر آدمی بیان نہ کر سکا، اور واضح ہو گیا کہ محض شقاوتِ نفس سے کیا ہے، اس وقت سزا جاری کریں گے، اس لئے آپ جو چیز کریں پہلے اس کی حجت تلاش کریں، اور حجت جب تلاش کریں گے جب قلب میں صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ① اصلاح اور فلاح وہ پائے گا جس نے اپنے قلب کو پاک کر لیا''۔ بدن کی پاکی کافی نہیں ہے۔ کپڑوں کی پاکی کافی نہیں ہے۔ اصل پاکی دل کی ہے۔ وہ پاک ہے تو آپ بدن کو بھی پاک کریں گے کپڑوں کو بھی پاک کریں گے۔

درجاتِ معصیت ...... بہر حال فرمایا گیا: ''اِيَّاكُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ. '' گناہوں سے تو بچو، مگر چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہ نسبت بڑے گناہوں کے بہت زیادہ بچو، یہی بڑے گناہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس واسطے شریعتِ اسلام نے گناہ کے دو درجے رکھے ہیں۔ ایک صغیرہ، ایک کبیرہ، مقصود کا درجہ وہ تو کبیرہ ہے اور وسائل کا درجہ صغیرہ کا ہے۔ زنا کا فعل یہ تو کبیرہ گناہ ہے، اور عورت پر نگاہ ڈالنا، تاک جھانک کرنا، اور اس کے پیچھے چلنا یہ صغائر ہیں۔

درجاتِ توبہ ...... اگر کبیرہ سے بچ گیا، تو صغیرہ گناہ نیکیوں سے خود بخود معاف ہو جاتے ہیں: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ② نیکیاں بدیوں کو خود مٹا دیتی ہیں۔ انسان جب نیکی کرے گا، جتنے صغیرہ گناہ ہیں، کبیرہ سے بچنے کی وجہ سے وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ مگر کبیرہ معاف نہیں ہوگا جب تک آدمی توبہ نہ کرے، بلا توبہ کے اس کی گرد انسان کے قلب سے نہیں دھل سکتی۔

اور اس میں بھی اگر کبیرہ گناہ کیا اور اس میں مخلوق کی حق تلفی کی، وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوگا۔ جب تک وہ خود صاحبِ حق معاف نہ کرے۔ اللہ کی آپ چوری کریں گے تو انسان ہے، توبہ سے معاف ہو جائے گی۔ لیکن بندوں کی چوری کریں ہزار بار آپ توبہ کریں معاف نہیں ہوگی، جب تک اس کا مال اس کو واپس نہ دے دیں جس کا مال چرایا ہے۔ اگر کسی کو گالی دی ہے ہزار توبہ کریں معاف نہیں، جب تک وہ معاف نہ کر دے جس کو آپ نے ناحق گالی دی ہے۔ تو گناہ دو ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ تو صغیرہ معاف ہو جاتا ہے جب آدمی کبیرہ سے بچ جائے، اور کبیرہ توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ اور وہ کبیرہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جس کا تعلق مخلوق سے ہو۔ جب تک اس کو صاحبِ حق سے معاف نہ کرائے۔

قانونی سزا ...... مثلاً زنا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس میں آدمی تین گناہ کرتا ہے اور تین کی حق تلفی کرتا ہے، چناں چہ زنا کرنے والے نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کی، اس نے حکم دیا تھا کہ زنا مت کرو، اس نے کیا تو

① پارہ: ۳۰، سورۃ الشمس، الآیۃ: ۹، ۱۰۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۱۴۔

خلاف ورزی کی۔ایک گناہ تو یہ ہوا کہ اس نے قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی۔دوسرا اس نے پبلک کا گناہ کیا کہ امن اٹھادیا اور ایسا راستہ پیدا کر دیا کہ لوگ زنا کرتے پھریں۔تو یہ پبلک کا گناہ کیا۔

تیسرا گناہ اپنے نفس کا کیا کہ لازم تھا کہ نفس کو اس برائی سے پاک بناتا۔اس نے زنا کر کے اپنے قلب کو، نفس کو، بدن کو، سب کو آلودہ کیا اور ملوث کیا۔تو ایک خدا کی حق تلفی کی۔ایک عوام کی حق تلفی کی۔اور اپنے نفس کی حق تلفی کی، توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے حق کو اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے۔لیکن یہ جو نفس میں گندگی بیٹھی ہوئی ہے اور یہ جو پبلک کا نقصان کیا ہے، یہ توبہ سے ختم نہیں ہوں گے، جب تک سنگسار نہ کیا جائے اور رجم نہ کیا جائے، اس کے بعد حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر توبہ کرنی ضروری ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو کہتے ہیں کہ حدِ زنا جاری کر دی گئی، سنگسار کر دیا گیا، گناہ معاف ہو گیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ معاف نہیں ہوا۔سنگسار کر دینے سے جو پبلک کی حق تلفی کی تھی وہ ختم ہوگئی، لیکن اللہ کی جو حق تلفی کی تھی وہ ابھی باقی ہے۔وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوگی۔اور نفس کی جو حق تلفی کی تھی وہ اس کے بغیر معاف نہیں ہوگی، کہ آدمی آئندہ کے لئے عہد کرے کہ میں پھر اس حرکت بد سے بچوں گا۔

بہر حال حدودِ شرعیہ کی قانونی سزا بھی جاری ہوگی اور ساتھ ساتھ توبہ بھی ضروری ہے۔اس قسم کے جرائم میں ایک انسان بہت سی حق تلفیاں کرتا ہے، خدا کی حق تلفی الگ، عوام کی حق تلفی الگ، ملک کی الگ، اور اپنے نفس کی الگ۔تو توبہ سے خدا کا گناہ معاف ہوگا، حد جاری کرنے سے وہ گناہ معاف ہوگا جو پبلک کا ہے۔وہ جو اس نے بدامنی کا راستہ ڈال دیا تھا، حد جاری کرنے سے امن قائم ہوگا۔

نسخۂ تطہیر......مگر دیکھا جائے تو تینوں کا تعلق قلب ہی سے ہے۔اگر قلب میں پاکی نہیں ہے۔تو انسان نہیں بچے گا، اگر قلب میں پاکی ہے تو بے شک بچ جائے گا۔اس واسطے سب سے زیادہ ضروری قلب کو صالح بنانا ہے، اس کے لئے شریعت نے ذکر اللہ کا نسخہ تجویز کیا ہے کہ یادِ خداوندی ہمہ وقت تمہارے سامنے رہے، جتنا اللہ کی یاد سامنے ہوگی، اتنا ہی خوفِ خدا دل میں بیٹھے گا، اتنا ہی آدمی جرائم سے بچنے کی کوشش کرے گا اور ذکر کی بجائے جتنی غفلت پیدا ہوگی، اتنی ہی معاصی اور گناہوں کی کثرت ہوگی۔اس لئے بنیادی چیز یہ بتلائی گئی: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (1) یادِ خداوندی اپنے اندر پیدا کرو۔"

ذکرِ معاشرت......اور ہمہ وقت یاد ہو۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ: "كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ." (2) ہر دم اور ہر لحہ آپ ذکر اللہ کرتے تھے۔امت کو بھی ایسا ہونا چاہئے۔لیکن آپ یہ کہیں گے کہ ہر وقت کس طرح ذکر کریں۔دکان پر بھی جانا ہے، تجارت بھی کرنی ہے، زراعت بھی کرنی ہے، بال بچوں میں بھی رہنا

(1) پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

(2) السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب فی الرجل یذکر اللہ علی غیر طهر ص: ۱۲۲۴، رقم: ۱۸.

ہے۔ ہروقت ذکر کرتے رہیں، یہ بظاہر محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ سارے کام کریں پھر بھی آپ ہروقت ذکراللہ کرسکتے ہیں۔ ایک تو ذکراللہ عرفاً ذکر ہے جیسے صبح وشام ایک ایک تسبیح پڑھی، یا نمازیں پڑھیں، یہ تو ذکر ہی ہے دوسرے اوقات میں، بال بچوں میں، دکان پہ جانا ہو، اس میں ذکر کی صورت یہ ہے کہ آپ دوکان پر جائیں، یہ نیت کرکے جائیں کہ میں اس لئے جارہا ہوں کہ چار پیسے ہاتھ لگیں تاکہ بال بچوں کی پرورش کروں، یہ حکم خداوندی ہے، تو میں تعمیل حکم کے لئے جارہا ہوں، اپنے نفس کے حظ کے لئے نہیں جارہا، اطاعتِ خداوندی کے لئے جارہا ہوں۔ زراعت کرنے والا زراعت کرے اور یہ نیت کرے کہ چار دانے پیدا ہوں گے، بچوں کو بھی کھلاوں گا مخلوق کی بھی خدمت کروں گا، خدا کی مخلوق کی پرورش کروں گا یہ سب ذکراللہ میں داخل ہو جائے گا، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ بازار اور کھیت چھوڑ کے مسجد میں آکے تسبیح لے کر بیٹھیں، اسی بازار اور کھیت میں نیت کرلیں۔ اسی طرح سے ہر معاشرت کی چیز عبادت بن جاتی ہے اور اجر وہی ملتا ہے جو عبادت پہ ملتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا ہے، ابتداء میں بسم اللہ کہے اور اخیر میں الحمد اللہ کثیرا۔ فرماتے ہیں جب اس طرح سے اول وآخر میں ذکر کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ ''غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِه.'' اس کے اگلے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔

تو یہ کھانا، کھانا ایک معاشرتی فعل ہے۔ مگر مغفرت گناہوں کی ہورہی ہے جیسے نماز پر ہوتی ہے، ذرا سی نیت اور فکر کے بدلنے سے مغفرت مرتب ہوگئی۔ حدیث میں ہے کہ: ''مَنْ قَادَ اَعْمٰی غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِه.''① جس نے اندھے کو راستہ دکھادیا، جتنے اس کے صغیرہ گناہ ہیں، بخش دیئے گئے''۔

اندھے کو راستہ دکھایا بظاہر کوئی نماز، روزہ نہیں کیا، لیکن ثمرہ وہی مرتب ہوا جو عبادت پر مرتب ہوتا تھا، اس لئے کہ نیت صحیح تھی۔ اسی طرح سے بہت سے اعمال فرمائے گئے ہیں جو معاشرتی ہیں لیکن اجر وثواب ان پر طاعت وعبادت کا ملتا ہے، چوں کہ وہ ذکر بن جاتے ہیں، اس لئے کہ نیت صحیح ہوتی ہے۔

ذکر دائمی...... آپ سے یہ نہیں کہا جارہا کہ نماز روزہ سے فارغ ہوکر آپ مسجد ہی کے اندر بقیہ سارے اوقات بیٹھے رہیں، یا ہمہ وقت ذکر کرتے رہیں۔ یہ نہیں۔ بلکہ دنیا کا جو کام ہو، نیت درست کرلو، اتباعِ سنت کرو، وہ سب ذکر میں شامل ہوتا جائے گا، تو آپ بھی ہمہ وقت ذکراللہ کرنے والے بن گئے، جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت ذکر فرماتے تھے، تمہیں بھی یہ مقام میسر آسکتا ہے۔

اسی طرح شریعت نے مختلف اوقات کی کچھ دعائیں بتلائی ہیں۔ انہیں یاد کرلو اور پڑھ لو تو پورے اوقات ذکر میں مشغول سمجھے جائیں گے، سورج نکلتے وقت یہ دعاء، لباس پہنتے ہوئے یہ دعا پڑھ لی، استنجاء کو گئے تو یہ دعا پڑھ

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الحطيب عن ابن عمرؓ قال المناوی: وفيه عبدالباقی بن قانع، اورده الذهبی فی الضعفاء دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۶۹.

لی، بھائیوں سے مصافحہ کیا تو یہ دو جملے پڑھ لئے، یہ سب اذکار ہیں، ان کی عادت ڈالی جائے تو پوری زندگی ذکر اللہ میں گزر جائے گی۔ غرض ذکر اللہ ہمہ وقت ہونا چاہئے، اور ہمہ وقت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سب کھانے پینے کو چھوڑ دے، سب کاروبار چھوڑ دے، اس کھانے پینے ہی کو ذرا سی نیت کی تبدیلی سے ذکر بنائے تو پورے اوقات ذکر میں صرف ہو جائیں گے، اس سے قلب میں صفائی پیدا ہوگی، قلب میں جلا پیدا ہوگی۔

تمرینِ ذکر...... اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ آپ اس کی مشق کر کے عادت ڈالیں کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان پر رہے، اوپر چڑھنے لگیں تو "اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہنا شروع کر دیا، نیچے اترنے لگیں تو "سُبْحَانَ اللّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ" کہنا شروع کر دیا۔ کوئی تعجب کی بات پیش آئی، آپ کہنے لگے "سُبْحَانَ اللّٰہِ" کیسی عجیب بات ہے، آپ نے کسی چیز کی قدر بڑھائی تو کہا "مَاشَاءَ اللّٰہُ." اس کی اگر آپ عادت ڈالیں تو ابتداء میں تو ذرا تکلّف ہوگا اور آپ کو تکلیف ہوگی۔ لیکن جب عادت پڑ جائے گی تو بے ارادہ بھی زبان پر ہر وقت اللہ کا نام جاری ہو جائے گا، عارفین اسی کی مشق کراتے ہیں، ابتداء میں ذرا سا تکلّف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ چیز بے ساختہ جاری ہو جاتی ہے۔

دوامِ ذکر کا ثمرہ...... اور اس کا ثمرہ کیا نکلتا ہے۔؟ پوری زندگی میں جب ذکر کی عادت پڑ گئی اور بلا اختیار زبان پر جاری ہوا تو مرتے وقت بھی اللہ ہی کا نام زبان پر جاری ہوگا، خاتمہ صحیح ہو جائے گا، اس خاتمے کے صحیح کرنے کے لئے یہ ساری جدوجہد اور محنت ہے کہ وہ آخری دم درست ہو جائے۔ "مَنْ کَانَ اَوَّلُ کَلَامِہٖ وَ اٰخِرُ کَلَامِہٖ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ." ① تو جیسے حدیث میں ہے کہ: اوّل کلام اور آخر کلام جس کا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" بن گیا ہے، وہ شخص جنتی ہے۔ یہ آخر کلام "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کب ہوگا؟ جب زندگی میں خدا کا نام لینے کی مشق ہوگی۔

چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا: "تُحْشَرُوْنَ کَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ کَمَا تَحْیَوْنَ." ② تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئے گی، اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر تم نے زندگی گزاری ہے۔

غرض زندگی جس حالت میں گزاری ہے، موت [illegible] حالت پر آئے گی، اور جس حالت پر موت آئے گی میدانِ محشر میں اسی حالت پر آپ اٹھیں گے، اگر کسی نے زندگی میں یادِ خداوندی کی مشق کی ہے، یقیناً مرتے وقت قلب میں اللہ کی یاد ہوگی، اور زبان پر اللہ کا نام جاری ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا۔ تو وہی کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا جو کلمہ پڑھتے ہوئے انتقال کر گیا تھا۔ حدیث میں ہے کہ اگر ایک حاجی لبیک لبیک کہتے ہوئے مر گیا ہے، جب قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک جاری ہوگا اور یہ سمجھتے ہوئے اٹھے گا کہ میں میدانِ عرفات میں ہوں۔ مگر زبان پر لبیک جاری ہوگا۔ اسی طرح سے جو کلمہ آدمی زبان پر جاری کر لے اور اللہ کے نام کی مشق کرتا رہے، اللہ کا وہی نام

① السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی التلقین، ج:۸ ص:۳۷۶. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج:۷ ص:۱۱۶ رقم: ۳۱۱۶. ② مرقاۃ، کتاب الرؤیاء، الفصل الاول ج:۱۳ ص:۳۷۷.

خاتمہ کے وقت بھی نکلے گا، اور وہی نام لیتا ہوا آدمی میدانِ محشر میں اٹھے گا۔

قبر وحشر میں ذکر کا محافظتی کردار...... یہی اذکار یہی کلمات اس کے لئے سنتری اور محافظ بنیں گے۔ حدیث میں ہے کہ: جب آدمی قبر سے اٹھے گا تو "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اس کے آگے آگے ہوگا۔ "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" سر کے اوپر ہوگا، "سُبْحَانَ اللّٰهِ" اس کے دائیں طرف ہوگا۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" اس کی بائیں جانب ہوگا "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" اس کی پشت کی جانب ہوگا، اور یہ کلمات چاروں طرف سے گھیر کر آدمی کو اپنی حفاظت میں لے کر میدانِ محشر میں لے چلیں گے، ہر طرف سے عذاب سے بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے، اگر سر میں قرآنی آیات محفوظ ہیں جنہیں وہ یاد کرتا رہا تھا، وہ آیتیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار ادھر سے مت آنا۔ دائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں فرمایا گیا: "اَلصَّلٰوةُ بُرْهَانٌ." ① نماز انسان کی دستاویز ہے، وہ دائیں جانب سے عذاب کو روک دیتی ہے۔ بائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ: "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ" ② روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے، بائیں جانب ڈھال کر کے ہی وار کو روکتے ہیں اور اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔ پیروں کی جانب سے عذاب بڑھے گا تو حدیث میں ہے کہ صدقات اور زکوٰۃ عذاب کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے، کیوں کہ یہ انسان کی چلت پھرت کی کمائی ہے، اس لئے پیروں کی طرف سے عذاب کو روکتی ہے۔ غرض قبر میں بھی اگر عذاب کو روکنے والی کوئی چیز ہوگی تو وہ ذکر اللہ ہوگا۔ میدانِ محشر میں بھی اگر آبرو کے ساتھ انسان کو کوئی چیز لے جائے گی اور بڑھائے گی، وہ بھی ذکر اللہ ہوگا اور اللہ کا نام ہوگا۔ جو خاتمہ اچھا کرے گی وہ بھی انسان کا ذکر اور یادِ خداوندی ہوگی۔ ③

مدارِ محافظت...... مگر سب کچھ جب ہی ہوگا جب زندگی میں ذکر اللہ کی مشق کی ہوگی، اگر زندگی میں غفلت رہی ہوگی، تو موت کے وقت بھی قانوناً غفلت ہی ہوگی۔ ویسے اللہ جانتا ہے کس کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ مگر حشر میں وہ چیزیں سامنے آئیں گی جن کو جزوِ نفس بنالیا تھا۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: میت کو جب قبر میں لٹاتے ہیں اور منکر نکیر سوال وجواب کے لئے آتے ہیں اور اس میں روح ڈالی جاتی ہے اسے یوں نظر آتا ہے کہ آفتاب نکلا ہوا ہے مگر غروب ہونے کے قریب ہے۔

"يَتَمَثَّلُ لَهُ الشَّمْسُ" آفتاب کی صورتِ مثالی سامنے ہوتی ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے اور مغرب کا وقت بالکل قریب ہے۔ ملائکہ سوال کرتے ہیں۔

---

① ② السنن للترمذی، کتاب الجمعة، باب ماذکر فی فضل الصلوة، ج: ۳، ص: ۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج: ۲ ص: ۱۱۴ رقم: ۶۱۴.

③ السنن للترمذی، ابواب الجمعة، باب ما ذکر فی فضل الصلوة، ص: ۱۷۶ رقم: ۶۱۴.

”مَنْ رَّبُّکَ“؟ تیرا رب کون ہے؟ تو میت جواب دیتی ہے۔”دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ۔“ ① میاں، پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو، میرا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ نماز قضاء ہو جائے گی۔۔ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے، اس سے رب کا کیا سوال کرنا ہے جو رب میں اتنا فنا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے، اس سے کیا پوچھتے ہو کہ تیرا رب کون ہے۔

دوسرا کہتا ہے کہ ہمیں تو ڈیوٹی انجام دینی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جواب سچا دے گا، مگر پوچھنا ہمارا فرض ہے۔ تو یہ جواب دینا کہ ”دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ“ پرے کو ہٹو، مجھے نماز پڑھنے دو۔ یہ کون کہے گا۔ جو دنیا میں مشق کر چکا ہوگا کہ میری نماز قضا ہونے نہ پائے وقت پہ ادا ہو۔ اور اگر دنیا میں وقت گزارتے جاتے ہیں۔ وہ ادا چھوڑ قضا چھوڑ سرے سے پڑھتا ہی نہیں، وہ وہاں ”دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ“ نہیں کہے گا، اس لئے کہ اسے نماز کی عادت ہی نہیں۔ غرض زندگی میں جو عادت ڈالی جائے گی، وہی عالمِ قبر اور عالمِ حشر میں قائم رہے گی اور وہی ذریعہ نجات بنے گی۔

ذکر اللہ کے دو اجزاء...... اس واسطے اتباعِ شریعت، ذکر اللہ، اور یادِ خداوندی اس زندگی میں رکھی جائے اور اس کے دو جز ہیں۔ ایک منکرات سے بچنا اور ایک معروفات پر عمل کرنا، ایک امر پر عمل کرنا، ایک نہی پر عمل کرنا، اس میں مقدّم یہ ہے کہ منکرات سے بچا جائے، جن چیزوں کو شریعت نے گناہ قرار دیا ہے اور جن چیزوں کو کبیرہ اور صغیرہ کہا ہے ان چیزوں سے بچنے کی کوشش کی جائے، تو یہ مامورات پر عمل کرنے کا ذریعہ بنیں گی، احکامِ شرعیہ کے اتباع کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔ اور جو منکرات سے نہیں بچتا اسے نیکی کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اگر توفیق ہوتی ہے تو نیکی اپنا اثر نہیں دکھلاتی، اس لئے کہ مضر چیزیں، استعمال میں آ رہی ہیں۔ اس مجموعے کو کہ نیکی کو کرنے لگے اور بدی سے بچنے لگے، اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں ”تزکیہ“ ہے کہ اس نے اپنے نفس کو پاک بنا لیا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ② اس انسان نے جس نے بدی چھوڑ دی، نیکی اختیار کی، اتباعِ شریعت اختیار کیا اور محرّمات، مکروہات اور ممنوعات کو چھوڑ دیا، تو اس نے اپنے نفس کو پاک بنا لیا۔ وہ صلاح و فلاح کی منزل تک پہنچ گیا۔ ان آیات کے شروع میں فرمایا گیا ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ ③ ”اس ذات کی قسم جس نے نفس کو صحیح صحیح بنایا، اس میں الہام کیا فجور کا بھی اور تقویٰ کا بھی“۔

نیکی کا بھی جذبہ ڈالا اور بدی کا بھی جذبہ ڈالا تا کہ دونوں کے ٹکراؤ سے انسان ترقی کرے۔ یہی چیز میں نے ابتداء میں عرض کی تھی کہ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی دونوں کے مادّے ہیں۔ بدی بچنے کے لئے ہے، نیکی کرنے کے لئے ہے۔ دونوں کو ملا کر انسان میں ترقی کا مادّہ پیدا ہوتا ہے اور صلاح و فلاح کی منزل سامنے آ جاتی ہے۔ یہ گویا آیات کا اجمالی خلاصہ ہے، تفصیلات بہت ہیں مگر اس کے لیے

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر القبر والبلى ۱۲/۳۲۵ رقم: ۴۲۶۲. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجه ج: ۹ ص: ۲۷۲ رقم: ۴۲۷۲. ② پاره: ۳۰، سورة الشمس، الآية: ۹، ۱۰.

③ پاره: ۳۰، سورة الشمس، الآية: ۷، ۸.

وقت نہیں ہے، اس لئے اجمالی طور پر اصول عرض کر دیا۔ اور اس اصول کی قدرے تشریح عرض کر دی۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کے امتثال کی اور بدیوں سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ (آمین)

دعاء......"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً. اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ. وَ اخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ. اَللّٰهُمَّ نَسْئَلُكَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ وَنَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَخَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ."

تنبیہ......ایک مسئلہ سن لیجئے۔ بعض لوگوں کو عادت ہوتی کہ وہ وعظ میں بیٹھتے ہیں مگر کچھ وظیفہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ مکروہ ہے۔ آداب درس اور وعظ کے خلاف ہے۔ وعظ سننا یہ خود مستقل طاعت وعبادت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نماز بھی پڑھے اور ساتھ میں دوسروں کو پیسے بھی تقسیم کرے، تو نہ نماز ہوگی نہ پیسے ہی صحیح تقسیم ہوں گے، تو آداب مجلس وعظ کے یہ چیز خلاف ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے جو مجلس میں بیٹھے وہ استماع کرے اور سننے کی طرف توجہ کرے اور ان چیزوں کو قلب میں اتارنے کی فکر کرے جو کہی جارہی ہیں۔ اور اگر وظیفے کا ضروری وقت ہے تو دوسرے مقام پر جا کر اپنا وظیفہ پڑھے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔"وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ."

(محررہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ بروز جمعۃ المبارک)

جواہرِانسانیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَـرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَـدُ أَنَّ سَیِّـدَ نَـاوَسَـنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـابَعْـدُ!.فَـقَـدْقَـالَ الـنَّـبِـیُّ صَـلَّـی اللّٰہُ عَـلَـیْـہِ وَسَـلَّمَ اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ، وَالْـعَـالِـمُوْنَ کُـلُّھُـمْ ھَـالِـکُوْنَ اِلَّاالْـعَـامِـلُوْنَ ،وَالْـعَـامِـلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ ، وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ اَوْکَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت...... بزرگانِ محترم! یہ جلسہ سیرت کے نام پر منعقد کیا گیا ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ بیان کی جائے اوراس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے تا کہ سیرت کے مختلف گوشوں سے لوگ آشنا ہوسکیں۔ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ درحقیقت ایک ذات یا ایک شخصیّت کی سیرت نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم انسانیت اور پورے عالم بشریت کی مقدس سیرت ہے۔دنیا میں بہت سی ذوات ایسی گزری ہیں جوایک ایک جماعت کے قائم مقام ہوتی ہیں یعنی پوری جماعت مل کر جن کمالات کا سبب بنتی ہے۔بعض دفعہ حق تعالیٰ وہ سارے کمالات کسی ایک شخصیّت میں جمع کر دیتے ہیں۔بعض شخصیتیں وہ ہیں کہ جماعتوں کی نہیں بلکہ پوری پوری اقوام کے قائم مقام ایک شخصیّت ہوتی ہے۔ اور بعض شخصیتیں پوری ملّت اورامّت کے قائم مقام ہوتی ہیں۔یعنی پوری ایک امت میں جوکمالاتِ علم وعمل کے جمع ہوں وہ ایک ذات میں جمع کردیئے جاتے ہیں۔جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اِبْـرٰھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا﴾ ① ابراہیم علیہ السلام پوری ایک امت ہیں۔یعنی ایک عظیم ترین امت میں جواخلاق وکمالات جمع ہوسکتے ہیں وہ ایک ذاتِ واحد میں اللہ نے جمع کردیئے۔توآپ اندازہ کیجئے کہ جوذاتِ بابرکات ملّتِ ابراہیمی کی تکمیل کرنے کے لئے آئے،وہ ذاتِ بابرکات کتنی عظیم ہوگی۔وہ ایک امت نہیں بلکہ دنیا کی ساری امتوں کی جگہ وہ ایک ذاتِ واحد ہوگی اور جوساری امتوں اوراقوام میں مل کرکمالات

① پارہ:۱۴،سورۃ النحل،الآیۃ:۱۲۰۔

جمع ہیں وہ تنہا ایک ذاتِ واحد میں ہوں گے اور وہ ذات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

سیرتِ انسانیت...... تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت درحقیقت مکمل انسانیت کی سیرت ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سیرتِ مقدسہ کے بیان کرنے سے پہلے انسانیت کی سیرت پر گفتگو کروں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی سیرت کے اجزاءِ ترکیبی کیا ہیں؟ اگر وہ سمجھ میں آ گئے تو جو ذاتِ بابرکات پورے عالمِ انسانیت کی عظیم اور متوازی ہے۔ اس کی سیرت خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔ اس لئے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث تلاوت کی ہے جس میں خود اجزائے ترکیبی بیان کئے گئے ہیں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ انسان کے معنی کیا ہیں؟

مادّۂ انسان کے تخلیقی مراحل...... اسے آپ اس طرح سمجھیں کہ انسانیّت کو یا انسان کو جو کچھ فوقیت یا عظمت یا شرف حاصل ہے۔ وہ انسانی مادّے کی وجہ سے حاصل نہیں ہے۔ انسان کی تمام کائنات پر جو کچھ بزرگی، بلندی اور برتری ہے وہ اس کے مادّے کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسانی خلقت کے مادّے جہاں بھی قرآنِ کریم نے ذکر کئے ہیں وہ نہایت ہی گندے اور نجس مادّے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کو کوئی فوقیت یا فضلیت حاصل ہو۔ یہ نہیں۔

کہیں انسان کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ ① ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اور کہیں فرماتے ہیں ﴿خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا، کہیں فرماتے ہیں ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ ② کیا ہم نے تمہیں ایک ذلیل پانی سے پیدا نہیں کیا؟ اور کہیں فرماتے ہیں. ﴿خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ ③ ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا"۔

تو کہیں مٹی، کہیں نطفہ، کہیں سڑا ہوا ہو گارا اور کہیں ذلیل پانی۔ یہ انسان کی پیدائش کے ذلیل مادّے ذکر کئے ہیں، تو جن میں خود ذلت اور خود گندگی موجود ہے۔ ان مادّوں کی وجہ سے انسان کو کیا شرافت اور فضیلت حاصل ہو سکتی تھی۔ ایک موقع پر قرآنِ عظیم نے ان سب مادّوں کو یکجا طور پر جمع کر کے ذکر فرمایا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ، ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ④ "ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اس کو نطفے کی شکل دے کر رحمِ مادر میں پہنچایا، پھر ہم نے نطفے کو خون کی شکل میں تبدیل کر دیا، پھر خون کی ہم نے ایک منجمد پھٹک بنا دی۔ پھر اس کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنا دیا پھر اس میں ہم نے ہڈیاں پیدا کیں اور کھال بھر دی۔ اور پھر اس کی ایک اور خلقت تیار کی"۔

تخلیقِ انسان کا پہلا مرحلہ...... تو یہاں ترتیب وار چند مادّوں کا ذکر کیا گیا مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ ظاہر

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲. ② پارہ: ۲۹، سورۃ المرسلات، الآیۃ: ۲۰
③ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۲۶. ④ پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲، ۱۴.

بات ہے کہ مٹی کے اندر کون سی چمک دمک ہوتی ہے مٹی تو وہ ہے جس کو ذلول کہا گیا۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا﴾ ① اس مٹی کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل کر دیا، پست بنا دیا۔ تو بیچاری پامال ہوتی ہے جوتیوں سے آپ اس کو روندتے ہیں لیکن یہ اف نہیں کر سکتی تو اس کے عجز اور درماندگی کا یہ عالم ہے کہ اس میں کوئی چمک اور نورانیت نہیں۔ کوئی خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ گویا انسان کی پیدائش کا ابتدائی مادہ ہے۔

تخلیقِ انسان کا دوسرا مرحلہ...... اس کے بعد آگے ترقی کر کے فرمایا ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ﴾ ② پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر رحمِ مادر میں ٹھہرایا۔ تو یہ اور زیادہ گندگی کے اندر ترقی ہوئی۔ اس لئے کہ مٹی ناپاک تو نہیں تھی۔ بہت سے بہت کوڑا کباڑ کی کثافت تھی۔ کپڑے پر لگ جاتی تھی تو دھوتے تھے، بدن پر پڑ جاتی تھی تو آدمی غسل کر کے بدن صاف کر لیتا تھا۔ تو کثافت تھی مگر نجاست نہیں تھی۔ بلکہ ایک حد تک مطہّر بھی ہے۔ یعنی دوسروں کو پاک کرنے والی بھی ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمّم کی اجازت ہے، مٹی، پانی کے قائم مقام ہو جاتی تھی۔ غرض خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو پاک بنا دیتی ہے صرف اتنی بات تھی کہ ایک کرکٹ اور کوڑا تھا جو بدن پر پڑ جائے یا کپڑوں پر تو دھونے کی صورت پیش آتی تھی۔

تخلیقِ انسان کا تیسرا مرحلہ...... لیکن جب اس کو نطفے کی شکل میں منتقل کیا تو ناپاکی پیدا ہو گئی۔ غلاظت اور کثافت کے ساتھ ساتھ نجاست بھی پیدا ہو گئی۔ اور اس درجے کی کہ اگر یہ قطرہ خارج ہو تو قرآن کریم پڑھنے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ مسجد میں جانے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ نماز آپ نہیں پڑھ سکتے۔ اس درجہ گویا گندگی ہے، اسی لئے ایک موقع پر فرمایا ﴿اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ﴾ ③ ”اس انسان کی جرات تو دیکھو کہ ہم نے اس کو ایک گندے قطرے سے پیدا کیا اور ہمارے ہی مقابلہ پر جھگڑالو دشمن بن کر آتا ہے“۔ گویا اب تک تو مادّے میں کثافت تھی اب نجاست بھی پیدا ہو گئی۔

تخلیقِ انسان کا چوتھا مرحلہ...... اور آگے ارشاد فرمایا ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ ④ تو نطفے کے اندر کم سے کم حضرت آئمہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف تو تھا۔ بعض حضرت آئمہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو پاک کہتے تھے۔ کم سے کم اس کی نجاست متفق علیہ نہ تھی، مختلف فیہ تھی۔ لیکن نطفہ جب خون کی شکل میں تبدیل ہوا تو خون کی پاکی کا کوئی بھی قائل نہیں، تو متفق علیہ نجاست بن گئی۔ گویا نجاست کے اندر اور زیادہ ترقی ہوئی۔ مٹی کا خلاصہ ناپاک نہیں تھا۔ کثیف تھا۔ نطفہ کثیف بھی تھا اور ناپاک بھی تھا۔ مگر مختلف فیہ تھا۔ اور خون بنا تو متفق علیہ ناپاکی ہو گئی۔ اس کے بعد میں لوتھڑا بنا کے ہڈیاں پہنائی گئیں۔ ان تمام چیزوں کے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔ کوئی پاکیزگی اور کوئی چمک دمک بھی نہیں۔ معنوی چمک تو کیا ہوتی، مادّی چمک بھی نہیں کہ ظاہری طور پر کوئی شعاع تو نظر آ جائے۔ یہ انسان کی

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون الآیۃ: ۱۳۔

③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰسٓ، الآیۃ: ۷۷۔ ④ پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۴۔

پیدائش کے مادّے ہیں۔

تخلیق انسان کا پہلا ظلماتی مکان...... اور پھر ان مادّوں کے ساتھ انسان کو کہاں پیدا کیا گیا۔ وہ بھی گندی جگہ ہے، جس میں تخلیق عمل میں آئی۔ بلکہ گندی اور ظلماتی جگہ بھی ہے۔ قرآن کریم میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ ① اللہ تعالیٰ تم کو پیدا کرتے ہیں، تمہاری پیدائش پر مختلف دور آتے ہیں۔ کہاں پیدا کرتے ہیں؟ ﴿فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾۔ تین اندھیری کوٹھڑیوں اور تین ظلمتوں کے اندر پیدا کرتے ہیں۔ سب سے پہلی ظلمت ماں کا پیٹ ہے جس کے اندر کوئی چاند تا نہیں۔ جس کے اندر کوئی آفتاب کی شعاع نہیں پہنچتی۔ اور اندر سے بھی کوئی شعاع نہیں اٹھتی۔

تخلیق انسان کا دوسرا ظلماتی مکان...... اس ماں کے پیٹ میں پھر جو اندر کوٹھڑی ہے وہ رحمِ مادر ہے۔ جس کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اور زیادہ اندھیری۔ ماں کے پیٹ میں ممکن تھا کہ مسامات کے ذریعہ ہی کوئی چیز پہنچ جائے۔ مگر رحمِ مادر تو پیٹ کے اندر ایک اور بند کوٹھڑی ہے۔ وہاں نہ باہر سے کوئی چیز پہنچے نہ اندر سے باہر آئے۔

تخلیق انسان کا تیسرا ظلماتی مکان...... پھر اس کے اندر ایک اور تیسری کوٹھڑی ہے۔ وہ جھلی ہے جس کے اندر بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دایا اس کو کاٹ کر بچے کو باہر نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ خود اندھیری کوٹھڑی، رحمِ مادر اس کے اندر ایک اور اندھیری کوٹھڑی اور اس کے اندر جھلی ایک اور اندھیری کوٹھڑی۔

فضیلت یا ندامت...... تین ظلمتیں ہیں اور تاریک گھرانے ہیں جس میں انسان کو تربیت دی جاتی ہے اور تخلیق کی جاتی ہے۔ ان تینوں اندھیری کوٹھڑیوں میں سوائے غلاظت کے اور کیا ہے؟ حیض کا خون غذا بنتا ہے۔ گندے پانی میں انسان تیر تا رہتا ہے۔ تو پیدائش کے مادّے بھی نجس، مکان بھی گندا پھر جس راستے سے اندر پہنچتا ہے وہ راستہ بھی گندا، جس راستے سے نکالا جاتا ہے وہ راستہ بھی گندا۔ تو راستے بھی گندے، مادّے بھی گندے، مکان بھی گندا اور جوہر بھی گندا۔ ان گندی چیزوں سے ان گندے مکانوں میں بن کر آپ اندازہ کیجئے کہ انسان میں کوئی فضیلت پیدا ہوسکتی ہے۔ انسان کی فضیلت تو بجائے خود ہے اگر وہ ان مادوں کی طرف دھیان کرے تو ندامت سے اس کا سر نیچا ہو جانا چاہئے۔ یہ غلاظتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے لیے کوئی فخر اور غرور کا موقع باقی نہیں رہتا۔ کوئی موقع باقی نہیں رہتا کہ وہ شیخی کرے یا اترائے۔ کیا گندگی پر اترایا جاتا ہے؟ کیا نجاست کے اوپر انسان فخر کرے گا؟

انسان کی خود فریبی...... کوئی بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کے سامنے ایک شخص جو بہت بڑا مالدار تھا۔ اور دنیا کی اصطلاح میں بڑا آدمی تھا۔ وہ چلا آ رہا تھا اور اپنی بڑائی کی وجہ سے اتراہٹ کی چال چل رہا تھا۔ پیر ڈالتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا، چھاتی ابھارے ہوئے، منہ اُبھرا ہوا۔ غرض متکبرانہ چال سے چل رہا تھا۔ ادھر سے کوئی بیچارہ اللہ والا، سادہ زندگی والا درویش انسان آ رہا تھا۔ اس نے خیر خواہی کے طور پر اسے نصیحت کی اور کہا کہ ”اے عزیز!

① پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر الآیۃ: ۶۔

خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چل۔ ﴿لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ ① اللہ کی زمین پر اینٹھ کر مت چل، اکڑ کر مت چل۔ یہ جو تو اینٹھ کر چل رہا ہے، چھاتی ابھار کر چل رہا ہے۔ ﴿إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ ② تو اینٹھ کر زمین کو نہیں پھاڑ ڈالے گا۔ آسمان کو چیر نہیں ڈالے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا۔ جتنی جگہ میں ہے۔ خواہ مخواہ یہ مصیبت برداشت کر رہا ہے۔ یہ انسانیت کا کام نہیں ہے"۔ اس شخص کو بہت ناگوار گزرا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے ٹوکے، میں تو سب سے بڑا آدمی ہوں۔ اس نے بہت ہی تمک کر اور بہت ہی غصّے سے کہا کہ او جاہل درویش! تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ اور میرے سامنے ایسا گستاخانہ کلام؟ تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ یہ درویش بھی بگڑے ہوئے دل کا آدمی تھا۔ اگر یہ اپنے مال میں مست تو وہ اپنی کھال میں مست۔

انسان کا حقیقی تعارف...... وہ بھی آگے بڑھا اور اس نے کہا جی ہاں میں جانتا ہوں آپ کون ہیں، اور اگر آپ اجازت دیں تو میں بتلاؤں آپ کون ہیں۔ یہ بھی سسک کر کھڑا ہو گیا کہ بھئی! یہ بھی عجیب درویش ہے۔ آخر آپ کیا بتلائیں گے کہ میں کون ہوں؟" اس نے کہا میں جانتا ہوں آپ کون ہیں؟ آپ ذرا سن لیجئے"۔ "أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ قَذِرَةٌ وَ اٰخِرُكَ جِيفَةٌ مَّذِرَةٌ وَاَنْتَ بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ" آپ کی ابتداء ایک گندے قطرے سے ہوتی ہے جو بدن سے نکل آئے تو غسل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو دھونا واجب۔ آدمی نہ نماز کا رہتا ہے نہ تلاوت کا۔ یہ تو آپ کی ابتداء ہے۔ انتہاء آپ کی یہ ہے کہ قبر میں پہنچ کر یہی بدن پانی ہو کر بہے گا۔ کیڑے اس میں پڑیں گے۔ نجاست یہ بنے گا۔ یہ آپ کی انتہاء ہے۔ اور درمیان میں حالت یہ ہے کہ سیروں گندگی اور نجاست آپ کے پیٹ میں بھری ہوئی ہے، پاخانہ بھی ہے، پیشاب بھی ہے، اور خون بھی ہے یعنی دم مسفوح بھی ہے۔ تو ابتداء گندی، انتہاء گندی اور درمیانی حالت میں گند در گند۔ یہ ہے آپ کی حقیقت۔ اب فرمایئے آپ اپنی حقیقت سمجھ گئے کہ آپ کون ہیں؟ اس کی آنکھ کھلی۔ چونکہ کہنے والا اتقائی آدمی تھا۔ دل سے ایک بات کہی تھی تو

از دل خیزد بر دل ریزد ــــ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

دل پر اثر کیا اور اس شخص نے کہا کہ

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ــــ مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

خدا تجھے جزائے خیر دے، تو نے میری آنکھ کھول دی، میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ حقیقت ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنے مادّے کے لحاظ سے اتنا گندہ اور نجس واقع ہوا ہے۔ اگر وہ اپنے مادّوں پر دھیان کرے تو اس کے لئے منہ اٹھانے کی جگہ نہیں ہے۔ آنکھ اونچی کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ شرمندگی کی وجہ سے آنکھ نیچی رکھے گا۔

ستار العیوب کا احسان...... یہ تو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہماری گندگیوں کو چھپا دیا ہے اور

① پارہ: ۱۵، سورة اسرائيل، الآية: ۳۷. ② پارہ: ۱۵، سورة اسرائيل، الآية: ۳۷.

نہایت خوبصورت کھال کا پردہ ڈال دیا ہے جس سے یہ چیزیں چھپادی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کھل جائیں تو انسان، انسان کو دیکھ کر نفرت کھانے لگے۔ اسی گندگی کے اگر خدانخواستہ معدے سے بخارات اٹھنے لگیں اور منہ میں بدبو پیدا ہو جائے تو انسان کو انسان سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پاس کھڑے ہوتے ہوئے نفرت آتی ہے۔ وہ معدے کے بخارات ہوتے ہیں جو گندہ ذہنی کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ تو جب وہ اجاگر ہوتے ہیں تو آدمی سے آدمی گھبرانے لگتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے گندگیوں کو چھپا رکھا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ انسان کو موقع نہیں ہے کہ ان چیزوں پر فخر کرے یا شیخی بگھارے یا اتراہٹ کی چال چلے۔ گویا بتلا دیا گیا کہ انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے گندہ واقع ہوا ہے۔

یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس میں کوئی کمال ڈال دے۔ مگر انسان کی ذات کا کوئی کمال نہیں۔ ذات تو انسان کی وہ ہے جو ہم نے پیش کردی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان مادّوں کے ہوتے ہوئے نہ انسانی سیرت بن سکتی ہے نہ انسان کو کوئی فوقیت اور فضیلت حاصل ہوسکتی ہے۔ کم سے کم ان مادّوں کے لحاظ سے انسان کے اندر کوئی بھی خوبی نہیں۔

ظاہری خوشنمائی کی حقیقت...... اب آپ یوں کہیں گے۔ یہ تو چھپی ہوئی چیزیں ہیں لیکن ان کے اوپر شکل تو خوشنما پڑی ہوئی ہے۔ کسی جاندار کو وہ خوبصورتی عنایت نہیں کی گئی جو انسان کو کی گئی ہے۔ تو انسان اپنی صورت زیبا کے اعتبار سے افضل اور اونچا ہے اور جتنا بھی وہ دعویٰ کرے کم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ صورت درحقیقت ایک عارضی چیز ہے، جلدی سے ختم ہو جاتی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا کہ تین دن آ جاتا ہے تو ساری شکل بگڑ جاتی ہے۔ سارا حلیہ خراب ہو جاتا ہے، نہ رنگ باقی رہتا ہے، نہ روغن باقی رہتا ہے۔ اگر انسان کی شرافت کے یہ معنی ہیں کہ وہ خوشنما ہے تو تین دن بخار آنے کے بعد شرافت چھن جاتی ہے، وہ رذیل بن جاتا ہے۔ تو یہ شرافت کیسی ہوئی کہ تین دن پہلے شریف اور تین دن بعد رذیل۔ پہلے اشرف المخلوقات اور اڑھائی دن گذرنے کے بعد ارذل المخلوقات۔ یہ شرافت کس کام کی ہے؟ یہ صورت کی زیبائی اور رعنائی۔ یہ ایک عارضی چیز ہے۔ بخار آ جائے تو ختم ہو جائے، انسان کو کوئی غم لگ جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ کوئی فکر پیدا ہو جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ تو جس چیز کو آنے والی کیفیت زائل کر دے۔ وہ شرافت کی بناء نہیں ہوسکتی۔ شرافت تو وہ ہے کہ جوہر میں پڑی ہوئی ہو، تو جوہر گندہ ہے تو شرافت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

اور اگر فرض کیجئے کہ کوئی بیماری بھی نہ ہو تو بڑھاپا تو کہیں نہیں گیا؟ بڑھاپا آتا ہے تو وہی صورت جو زیبا تھی، وہ بھیانک نظر آنے لگتی ہے۔ چہرہ شومو ہو جاتا ہے۔ صورت اور ہیئت بگڑ جاتی ہے اور بدل جاتی ہے اور مان لیجئے بڑھاپا بھی نہ آئے، موت تو ہر صورت میں آئے گی؟ وہ بالکل ہی صورت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

عقل کی گمراہی...... یہ عقل کی گمراہی ہے کہ وہ اس صورت پر فخر کرنے لگے جو رات دن تغیر کے اندر ہے۔ ہم رات دن اس صورت کو سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کنگھی اور چوٹی۔ یہ اور وہ۔ اسے آپ کہاں تک سنواریں

گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، جس چیز کو ہر چیز بگاڑ دے آپ اسے کہاں تک سنواریں گے؟ بیماری اسے بگاڑ دے، بڑھاپا اسے بگاڑ دے، فکر اور غم اسے گھلا دے، موت اس کا حلیہ بگاڑ دے، تو آپ ناحق سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بگڑنے کے لئے بنی ہے، اسے سنوارنا کوئی دانائی کا کام نہیں ہے۔ اگر آدمی سنوارنے کی کوشش کرے تو اپنی سیرت کو سنوارنے کی کوشش کرے نہ کہ صورت کو۔ پائیدار چیز انسان کی سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو آپ کتنا ہی سجائیں گے، کتنا ہی زیبا بنائیں گے، کتنا ہی آپ آراستہ کریں گے، بالآخر وہ ختم ہوگی۔ اس کی زیبائش بھی ختم ہوگی۔ اگر پائیدار چیز ہے تو وہ انسان کی سیرت ہے۔

نجاست کا عشق...... کسی بزرگ کا واقعہ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ ان کی خانقاہ میں لوگ اپنی تربیت کے لئے اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے، شیخ لوگوں کی تربیت کرتے تھے۔ اور شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ بیس بیس اور پچاس پچاس مرید اور متوسلین جمع ہوگئے، کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا، ایک باندی اس کام کے لئے متعین تھی، وہ کھانا تقسیم کر جاتی تھی، ایک نئے مرید آکر بیعت ہوئے، مقصد تو یہ تھا کہ اللہ اللہ کر کے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ باندی جب کھانا لے کر آئی تو وہ اتفاق سے کچھ ذرا قبول صورت تھی۔ ان مرید صاحب کی اس سے آنکھ لڑ گئی، اس پر کچھ فریفتہ ہوگئے۔ اب جب وہ کھانا لے کر آتی ہے تو بیٹھ کر اسے گھورتے ہیں نہیں آتی تو منتظر رہتے کہ کب آئے گی۔ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب وہ آئی تو اسے گھورنا شروع کیا۔ شیخ کو اس حالت کی اطلاع ہوگئی۔ تو اہل اللہ علاج کرتے ہیں، وہ زبان سے نہیں ہوتا، طریق عمل سے علاج ہوتا ہے کہ مرض کا استیصال ہو جائے۔ شیخ نے چاہا کہ ان کا یہ مرض دور ہو۔ اگر زبانی نصیحت کر دیتے، فہمائش کر دیتے، بے شک تھوڑا بہت اثر ہوتا مگر جب طبیعت مائل تھی تو طبیعت کا بدلنا مشکل تھا، شیخ نے ارادہ کیا کہ طبیعت ہی کو بدل دیا جائے تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو۔

تو ایک عجیب وغریب ترکیب استعمال کی۔ اس باندی کو جو کھانا لے کر آتی تھی۔ اسے دستوں کی دوا کھلا دی، صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آ گئے، ایک جگہ متعین کر دی کہ اسی جگہ جانا، وہاں قدمچہ رکھ دیا۔ غرض شام تک اسے بہت دست آ گئے۔ اور شام کو حالت یہ ہوئی کہ نہ وہ رنگ باقی رہا نہ وہ روغن باقی رہا۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ اس باندی کی صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ عجیب بھیانک شکل بن گئی اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ: اس مرید کے پاس کھانا لے کر جا۔ اور جو کچھ وہ کہے اس کی مجھے آکر اطلاع کرنا۔

وہ کھانا لے کر بے چاری پہنچی، ناک پکڑو تو دم نکلے، قدم اس کا لرز رہا ہے۔ ضعف کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جاتا اور صورت بھی بھیانک ہوگئی۔ یا تو مرید صاحب اس کے انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اب جو آئی اور انہوں نے اس کی شکل دیکھی تو انہیں بڑی نفرت سی پیدا ہوئی اور بجائے اس کے اسے گھورتے، منہ پھیر کر کہا کہ کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے۔ وہ بے چاری کھانا رکھ کر چلی گئی۔ اور شیخ کو جا کر اطلاع کر دی کہ آج اس نے مجھے بجائے گھورنے کے نفرت سے کہا کہ چلی جا یہاں سے دور ہو جا۔ میں چلی آئی۔

شیخ نے کہا۔ الحمدللہ علاج ہوگیا۔ مگر ابھی علاج کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ ایک جز تھوڑا سا باقی تھا۔ شیخ مرید کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ ذرا میرے ساتھ چلیں۔ وہ قدمچہ جہاں باندی نے بڑی تعداد میں دستوں کا ملبہ جمع کیا تھا۔ مرید کو وہاں لے کر پہنچے اور فرمایا۔ ''یہ آپ کا معشوق ہے۔ یہ جو نجاست ہے اسے احتیاط سے لے جا کر اپنے حجرے میں صندوق میں رکھئے، اس لئے کہ جب تک یہ باندی کے اندر تھا، آپ کو محبت تھی۔ جب یہ نکل گیا۔ آپ کو نفرت پیدا ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے آپ کو محبت تھی۔ اس لئے اسے اٹھا کر لے جایئے۔ یہ آپ کا محبوب ہے۔'' حقیقت میں شیخ نے بتلایا کہ صورتوں کا عشق درحقیقت گندگی کا عشق ہے۔

عشقِ سیرت...... اصل عشق، سیرت کا عشق ہے جو پائیدار عشق ہے، وہ وہی ہے جس سے محبت کرنی سکھلائی گئی ہے۔ آج ہمیں اور آپ کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے محبت ہے، حضرت امام شافعی سے، حضرت امام احمد بن حنبل سے، حضرت امام بخاری اور حضرت امام ترمذی سے، حضرت جنید اور حضرت شبلی سے اور تمام اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے، ان کی محبت کو جزوِ ایمان جانتے ہیں، ان سے محبت کرنے کو اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ کیا یہ محبت ان کی صورتوں سے ہے؟ ہم نے تو آج تک ان کی صورت دیکھی بھی نہیں۔ یہ کاہے سے محبت ہے۔ ان کی سیرت اور ان کے کمالات سے محبت ہے۔ اور اتنی پائیدار محبت ہے کہ نہ آج تک ہم نے ان کی شکل دیکھی۔ مگر دل میں قائم ہے۔ اور اتنی شدید محبت کہ اگر ان بزرگوں کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کرے تو ہم اس کا منہ توڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ برداشت نہیں کرتے۔ یہ ان کی سیرت کی محبت ہے، ان کی صورت کی محبت نہیں ہے۔

سیرت کی سرداری...... حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت جو جلیل القدر تابعی ہیں فرماتے ہیں کہ: ''مَارَأَیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَآءِ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ'' ① ''میں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے زیادہ عالم اور افضل شخصیت نہیں دیکھی''۔

یعنی حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں بڑی زبردست شخصیت، بڑی علم والی شخصیت ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص جس کی تعریف کرے تو اندازہ کیجئے کہ وہ کس پائے کی شخصیت ہو گی؟ تو حضرت عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ گویا اپنے زمانے میں اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کی وجہ سے سب سے زیادہ افضل ہیں۔

اور خود حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کیسے ہیں؟ ایک حبشی غلام ہیں۔ کالی صورت ہے۔ موٹے موٹے ہونٹ ہیں، کرنجی آنکھیں ہیں۔ کوئی زیبا صورت نہیں۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ افضل دنیا میں نہیں دیکھا۔ یہ افضلیت صورت کے لحاظ سے نہیں تھی سیرت کے لحاظ سے تھی، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کی صورت کو نہیں سراہ رہے تھے، ان کی سیرت کو پیش کر رہے تھے، آج

① السنن للترمذی، کتاب العلل الصغیر، ص: ۲۰۵۶.

اگر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نام آ جائے تو رضی اللہ عنہ کہہ کر آپ عقیدت اور نیازمندی سے گردن جھکا دیتے ہیں، حالاں کہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی صورت کالے رنگ کی تھی موٹے موٹے ہونٹ تھے، جیسے حبشیوں کی صورت ہوتی ہے۔ مگر صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "یَا سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا" بلال (رضی اللہ عنہ) ہمارے سردار اور ہمارے آقا ہیں۔ یہ کاہے کی آقائی اور سرداری تھی۔ یہ صورت کی سرداری نہیں تھی بلکہ سیرت کی سرداری تھی۔

صورت سببِ فتنہ اور سیرت ذریعۂ نجات ہے...... اگر غور کیا جائے تو فتنوں میں مبتلا کرنے والی چیز انسان کی صورت ہے۔ سیرت فتنے میں مبتلا نہیں کرتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی صورت اور ان کے حسن و جمال میں آپ کو کلام تو نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی ہے۔ اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی۔ فرمایا گیا کہ: "جب اللہ نے حسن پیدا کیا۔ آدھا حسن دنیا کو تقسیم کیا، آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو عطاء کیا"۔

اتنی زبردست حسین و جمیل شخصیت کہ قرآن و حدیث نے شہادت دی لیکن جہاں بھی فتنوں میں مبتلا ہوئے، صورت نے مبتلا کیا۔ کنعان کے کنویں میں گرائے گئے تو صورت نے مبتلا کیا۔ مصر کے بازار میں غلام بنا کر بیچے گئے تو صورت نے مبتلا کیا، اور مصر کے جیل خانے میں رہے تو صورت کی وجہ سے قید رہے، تو صورتِ زیبا نے ہر جگہ آفات میں مبتلا کیا۔ لیکن مصری کی حکومت لینے کا وقت آیا، مصر کے بادشاہ بنے اور سلطنت مانگی تو فرماتے ہیں: ﴿اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ① مجھے یہ خزانے سپرد کر دو۔ میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ کیوں؟ دلیل میں یہ نہیں کہا کہ انی حسینٌ جمیلٌ اس واسطے کہ میں بڑا خوبصورت ہوں، ملک کا انتظام کروں گا۔ یہ فرمایا کہ انی حفیظ علیم میرے اندر ملک کی نگہداشت کا مادہ موجود ہے، میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو حسنِ صورت نے کام نہیں دیا، حسنِ سیرت سامنے آیا اور جب فتنے میں مبتلا ہوئے تو حسنِ صورت سامنے آیا، حسنِ سیرت سامنے نہیں آیا۔

معیارِ شرافت...... آدمی اگر مبتلا ہوتا ہے تو صورت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ سیرت کی وجہ سے کوئی مبتلا نہیں ہوتا، سیرت تو عظمت والی چیز ہوتی ہے۔ بہر حال انسان کے لئے وجہِ شرافت نہ اس کا مادّہ بن سکتا ہے نہ اس کی صورت بن سکتی ہے۔ اور بھلا لباس تو کیا ہی بنتا؟ لباس صورت سے بھی زائد چیز ہے۔ جب انسان کے جوہر میں کوئی کمال نہیں۔ انسان کی صورت میں کوئی خاص کمال شرافت کا نہیں ہے اور ہے تو وہ زائل ہونے والی چیز ہے تو لباس تو اس سے بھی عارضی چیز ہے۔ اگر کوئی لباس پر فخر کرنے لگے اور اپنی شرافت اس سے بیان کرے تو اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ اس لئے کہ لباس تو وہ خود ہی رات کو اتار کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کو شریف اور رات کو رذیل۔ یہ

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

شرافت کس قسم کی ہوئی کہ اسے اپنے ہاتھ سے آدمی کھودے؟ جو لوگ اپنی شرافت کو لباس سے ثابت کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت سمجھے ہی نہیں کہ شرافت کسے کہتے ہیں۔ غرض انسانی شرافت کا تعلق لباس سے نہیں ہے۔

معیارِ کمال......سُقراط کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا یونانی حکیم بھی ہے، اور مجرّب بھی ہے۔ فنِ طب کا موجد اور بڑا حضرت حضرت امام سمجھا جاتا ہے، اس نے بڑے بڑے تجربات کئے ہیں، رات دن جنگلوں اور پہاڑوں میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرتے ہوئے مارا مارا پھرتا تھا۔ اس طرح سے اس نے جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں کتابوں کے اندر مدوّن اور مرتب کیں۔ ایک دن جڑی بوٹیوں کے امتحان میں جنگلوں اور پہاڑوں میں تمام دن لگ گیا اور شام کے وقت شہر میں آیا، تھک کے چور ہو گیا تھا۔ ایک سڑک کے قریب کسی بنچ پر بیٹھا تو نیند نے غلبہ کیا، نیند آ گئی۔ پیر اس کے سڑک پر لٹک گئے، اتفاق سے بادشاہِ وقت کی سواری نکلی، نقیب اور چوبدار ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے ہوئے آ رہے تھے، مگر یہ سقراط بے چارہ کب کا تھکا ہوا تھا، نہ اس کے کان میں ہٹو بچو کی آواز آئی، نہ کسی نقیب کی آواز نے اس کے کانوں کو کھٹکھٹایا، پڑا ہوا سوتا رہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آ گئی۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا کہ میں سواری پر سوار جا رہا ہوں اور اس کی ٹانگیں سڑک کے اوپر پڑی ہوئی ہیں۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر سواری سے اتر کر اسے لات سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ ''او احمق۔ اٹھتا نہیں ہے؟

وہ بے چارہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور بادشاہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ بادشاہ نے کہا۔ ''احمق! تو جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! میں اسی پر تو غور کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اور اب تک میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکا ہوں کہ شاید آپ جنگل کے کوئی درندے معلوم ہوتے ہیں۔

اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ وہ زمین پر پیر مارتے ہوئے دھول اڑاتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ آپ نے چوں کہ ٹھوکر ماری تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید جنگل کا کوئی درندہ آ گیا ہے۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور کہا کہ ''جاہل! احمق! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہِ وقت ہوں، اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ قباءِ شاہی میرے ہاتھ میں، تاجِ شاہی میرے سر پر ہے اتنے خزانوں کا میں مالک ہوں''۔ اور اس نے اپنی نعمتیں شمار کروائیں۔ سقراط نے کہا کہ: او احمق! تو نے جتنی چیزیں اپنی بڑائی اور بزرگی میں پیش کیں قلعوں کو پیش کیا، دولت کو پیش کیا، تاج کو پیش کیا، قباءِ شاہی کو پیش کیا یہ ساری چیزیں تو تجھ سے باہر باہر کی ہیں۔ تیرے اندر کون سا کمال ہے جس پر تو فخر کرے۔ یہ باہر کی چیزیں ہیں۔ تاج اگر اچھا ہے تو اپنی ذات سے اچھا ہے۔ تجھے اس سے کیا شرف ملا اور قبا اگر خوشنما لگ رہی ہے تو یہ کپڑے کی خوبی ہے۔ تیری ذات کی اس میں کیا خوبی ہے۔ تو نے اپنی ذات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے باہر کی چیزیں پیش کیں۔ جن کا تیری ذات میں کوئی دخل نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیری شرافت باہر باہر کی ہے۔ تیری ذات کے اندر کچھ نہیں۔''

وہ جو مثل مشہور ہے، اور نحوی لکھا کرتے ہیں کہ حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ طالب علمی میں جب

پڑھتا تھا تو اس نے بہت سی یادداشتیں مرتب کر رکھیں تھی، استاد سے سنی ہوئی تقریریں اور اپنے مطالعے کی یادداشتیں اور کچھ سوالات وغیرہ۔ غرض بہت سے کاغذات کا ایک پلندہ لکھ رکھا تھا جسے یاد کرتا تھا۔

جب کھانے کا وقت آیا تو اس نے وہ پلندہ لپیٹ کر دستر خوان میں باندھ لیا۔ اس میں ایک آدھ روٹی بھی تھی۔ اتفاق سے کتا آیا اور وہ سارا دستر خوان بندھا ہوا لے کر چلتا بنا۔ یہ حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے، ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔ اور کتا بھی کم بخت کچھ ایسا سرکش تھا کہ وہ آگے ہی کو چلا جا رہا ہے، پیچھے کو دیکھتا ہی نہیں۔ اور یہ اس کے پیچھے۔

لوگوں نے کہا کہ بڑا احمق ہے کہ روٹی دو روٹی ہوگی۔ کتا لے گیا تو لے جانے دے۔ اب لاٹھی لے کر پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اپنی طاقت خرچ کر رہا ہے، تو روٹی کھانے سے اتنی طاقت آئے گی نہیں جتنی پیچھے بھاگنے میں خرچ کر ڈالی۔ لوگوں نے کہا کہ بے وقوف واقع ہوا ہے۔

حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ ''بے وقوف تو تم ہو۔ میں روٹی کی وجہ سے نہیں دوڑ رہا۔ بلکہ دستر خوان میں میرا سارا علم تھا جو کتا لے بھاگا۔ میں جاہل کا جاہل رہ گیا''۔ ''لوگوں نے کہا احمق! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا ساتھ لے جائے''۔ تو حقیقت میں بادشاہ نے اپنی فضیلت تاج اور قبا میں بیان کی۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ اگر کوئی دشمن یا غنیم آئے، تاج چھین لے، قلعے چھین لے، تو بادشاہ کی شرافت ختم ہوگئی، شرافت تو وہ ہے کہ آدمی زمین کے اوپر رہے جب بھی باکمال ہو اور اگر زمین کی تہہ میں اتار دو جب بھی باکمال ہو۔ کمال اسے کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ ادھر جاؤ تو با کمال اور اُدھر کا رخ کر لو تو بے کمال۔ یہ کمال نہیں کہلاتا۔ کمال اپنی ذات کے اندر ہونا چاہئے۔ اپنے اندر جوہر ہونا چاہئے۔ یہ فی الحقیقت کمال ہے۔

مرکزِ محنت...... حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ نے ایک تمثیلی حکایت نقل کی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ واقعہ بھی ہو۔ تمثیل نہ ہو۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم جھگڑا ہوا۔ دونوں آپس میں لڑے، چینیوں نے کہا ہم زیادہ باکمال ہیں، زیادہ صناع ہیں، زیادہ دستکار ہیں۔ رومیوں نے کہا کہ ہم زیادہ صناع ہیں۔ ہم زیادہ دست کار ہیں۔ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ دونوں میں جھگڑا ہوا، دعوے دونوں طرف سے تھے، یہاں تک قریب تھا کہ جنگ ہو جائے۔ لوگوں نے کہا کہ بھائی! باہم لڑتے کیوں ہو؟ کسی کو ثالث اور حکم بنا لو، تو مقدمہ بادشاہِ وقت کے پاس گیا کہ دو قومیں لڑ رہی ہیں۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔ ایک قوم کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔ دوسری کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔ چینیوں نے کہا کہ حکمت ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ اور رومیوں نے کہا کہ ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ بادشاہ نے کہا، دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ دونوں اپنی اپنی صنعت کے نمونے دکھلائیں۔ اسے دیکھ کر ہم فیصلہ کریں گے کہ کون زیادہ باکمال ہے۔ اور تجویز یہ دی کہ ایک ہال بنایا گیا اور اس میں پارٹیشن کر دیا گیا۔ تقسیم کر کے ایک پردے کی دیوار کر دی گئی اور دونوں قوموں سے کہا گیا کہ آدھے مکان میں تم اپنی صناعت دکھاؤ۔ آدھے مکان

میں تم دستکاری دکھلاؤ۔ بیچ میں سے پردہ ہٹا کر پھر ہم موازنہ کریں گے کہ کس کی صناعی اور دستکاری بڑھی ہوئی ہے۔

چناں چہ دونوں قوموں نے اپنی کاریگری کا کام شروع کیا تو چینیوں نے دیوار پر پلاستر کر کے دیوار پر نقش و نگار بنانے شروع کئے اور رنگ برنگ کے پھول اور بوٹے بنائے۔ تو دیوار کو باغ و بہار بنا دیا۔ کوئی بوٹا نہیں چھوڑا جو اس میں بنایا نہ گیا ہو۔ کوئی پھول اور پتی نہیں چھوڑی جو اس میں نہ بنائی گئی ہو۔ کوئی رنگ نہیں چھوڑا جو دیوار میں لگایا نہ ہو۔ تو پوری دیوار کو گلزار بنا دیا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دیوار میں اثر کرنا چاہتی ہے۔ مگر آدمی کی نگاہ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں ہٹ سکتی۔ یہ کاریگری تو چینیوں نے دکھلائی۔

اور رومیوں نے کیا کاریگری دکھلائی؟ انہوں نے آدھے کمرے میں پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا اور مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکدار بنا دیا کہ دیواریں آئینہ بن گئیں کہ اس میں صورت نظر آنے لگی۔ بالکل چمکا کر آئینہ کر دیا۔ نہ ایک نقش بنایا، نہ ایک بوٹا بنایا، نہ ایک پھول بلکہ صیقل کر کے آئینہ کر دیا۔ جو سامنے کھڑا ہوتا۔ اس کی تصویر نظر آتی ہے۔

جب دونوں اپنی کاریگری سے فارغ ہو گئے تو بادشاہ کو اطلاع دی گئی، بادشاہ نے حکم دیا کہ پردے کی دیوار ہٹا دی جائے تا کہ موازنہ کریں۔ پردہ کی دیوار کا ہٹنا تھا کہ چینیوں نے جتنے نقش و نگار بنائے تھے، دوسری طرف نظر آنے لگے، اس لئے کہ دیواریں تو آئینہ ہو گئی تھیں۔ وہ سارے پھول ادھر نظر آ رہے ہیں۔ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو بیل بوٹا، ادھر ہے وہی اُدھر ہے۔ جو رنگ اُدھر ہے وہی اِدھر ہے۔ جو نقش و نگار اِدھر ہیں وہی اُدھر ہیں، اب وہ حیران ہے کہ فیصلہ کس کے موافق دوں اور کس کے خلاف دوں؟

آخر رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ رومی اپنی صنعت میں بڑھ گئے، کیوں کہ انہوں نے اپنی صنعت تو دکھلائی تھی، دوسروں کی صنعت بھی چھین لی۔ یہاں بیل بوٹے ہیں اور چمک کے ساتھ ہیں۔ وہاں فقط نقش و نگار ہیں۔ چمک دمک کچھ نہیں۔ تو اپنی صنعت دکھلائی اور دوسروں کی صنعت چھین لی۔ گویا رومیوں نے ڈبل صنعت دکھلائی اس لئے رومی بڑھ گئے۔

یہ حکایت نقل کر کے حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ لکھتے ہیں کہ ''اے عزیز! تو اپنے قلب میں چینیوں کی صنعت مت کر کہ دنیا بھر کے پھولوں اور بوٹوں کو دیکھتا پھرے۔ رومیوں کی صنعت کر کہ اپنے دل کو مانجھ کر آئینہ بنا لے کہ ساری دنیا کی صنعتیں تجھے گھر بیٹھے نظر آنے لگیں، تو دنیا کے اندر نقش و نگار اور پھول پتیوں کو ٹٹولتا ہوا کہاں مصیبت کے اندر پھر رہا ہے۔؟ تیرے اندر تو وہ کائنات موجود ہے کہ ساری دنیا کے پھول اور پتیاں تیرے اندر موجود ہیں۔ تو دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت کی طرح دل کو صیقل بنا لے۔ دنیا تو تجھے وہیں بیٹھے ہوئے نظر آنے لگے گی۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ ـــــ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل بکشا بچمن درآ

تیرے پاس تو دل موجود ہے۔ اس میں اگر تو ایک دروازہ نیچے کا کھولے گا تو ساری دنیا اس میں سے تجھے

نظر آئے گی اور اگر اوپر کا دریچہ کھول دے تو عالمِ غیب تجھے نظر آئے گا۔ دنیا کے مشاہدات قلب میں آئیں گے اور اوپر کے علوم قلب کے اندر آئیں گے۔ تو قلب عجیب کیمیا ہے کہ اس میں دو۲ دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک عالم غیب کی طرف اور ایک عالمِ شاہد کی طرف۔ محسوسات کی صورتیں بھی قلب میں ہیں مغیبات کے علوم بھی قلب کے اندر ہیں۔ تو جس انسان کو یہ چیز دی جائے وہ ان پھول پتیوں میں مبتلا ہو کے رہ جائے؟ اسے تو یہ چاہئے کہ ان دریچوں کھول دے تا کہ اسے ساری صورتیں نظر آئیں۔ نہ صرف یہاں کی بلکہ عالمِ غیب کی چیزیں بھی اس پر منکشف ہوں اور نظر آنے لگیں۔

مدارِ علوم...... حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ بیمار ہوئے اور کمر میں پھوڑا نکلا اور اتنا شدید کہ بتیس برس تک وہ پھوڑا رہا۔ اور کیفیت یہ تھی کہ کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی کھا رہے ہیں تو چت لیٹ کر اور استنجاء بھی کر رہے ہیں تو چت لیٹ کر۔ نماز بھی پڑھتے ہیں تو اشاروں سے چت لیٹ کر پڑھتے ہیں۔ نہ اٹھ سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں۔ نہ کروٹ بدل سکتے ہیں اور بتیس ۳۲ برس کامل اس حالت میں گزر رہے ہیں۔ اندازہ کیجئے کتنی عظیم تکلیف ہوگی؟ کتنی عظیم اذیّت ہوگی؟ مگر اس تکلیف کے باوجود چہرہ دیکھا جاتا تھا تو نہایت بشاش کہ تندرستوں کے چہروں پر وہ رونق نہ ہو۔ جو حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ کے چہرۂ مبارک پر تھی۔ نہایت ہشاش بشاش اور کھلا ہوا چہرہ۔

لوگوں نے عرض کیا کہ ”حضرت! بیماری تو اتنی شدید کہ اذیّت کی کوئی انتہا نہیں، بیٹھ نہیں سکتے، اٹھ نہیں سکتے۔ اور آپ کی بشاشت کی کیفیت یہ کہ کسی تندرست کا چہرہ بھی اتنا شاداب نہیں ہو سکتا جتنا آپ کا ہے؟“ فرمایا، ہاں!“ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ نے مجھے یہ تکلیف دی تو میں نے بجائے جزع فزع کرنے کے اور بجائے اللہ کا شکوہ کرنے کے صبر اور تحمل سے کام لیا اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، جس حالت میں تو رکھے میں اس حالت پر راضی ہوں۔ تو میں نے اس تکلیف پر رضا اور تسلیم کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور صبر سے کام لیا۔ نہ صرف صبر بلکہ شکر بھی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بتیس ۳۲ برس سے روزانہ اس بستر کے اوپر ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں۔ عالمِ غیب میرے اوپر منکشف ہے۔ رجالِ غیب میرے سامنے آتے ہیں۔ ملائکہ کی آمد و رفت میرے سامنے ہے۔ اگر چہ میں نے ارادے سے مجاہدہ نہیں کیا، یہ تقدیری مجاہدہ ہے جو اللہ نے مجھے دیا، تو یہ ہے اضطراری مجاہدہ مگر میں نے اس مجاہدے کو قبول کر کے صبر کیا۔ اس مجاہدے کی برکت سے اللہ نے میرے قلب کے دروازے کھل دیئے، مجھ پر عالمِ غیب منکشف ہوا، اور میں ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں“۔

جس انسان کو یہ کائنات دی جائے، اگر وہ ارادی مجاہدے کرے۔ سبحان اللہ! اور اگر اضطراری مجاہدہ ہو تو اس پر صبر اور تسلیم اختیار کرے۔ تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ تو جس کے اندر ایسی آنکھ دی گئی ہے کہ دنیا ہی میں بیٹھے بیٹھے وہ آخرت کی چیزیں دیکھے، اس کے لئے کیا مصیبت ہے کہ وہ پھول پتیوں میں الجھا ہوا

پھرے۔ یہ ساری پھول پتیاں اس کے اندر موجود ہیں۔

معیتِ اہلِ حق سے انکشافِ حقائق...... نیز اہل اللہ اور کاملین جب اپنے کمالات، اپنے مجاہدات اور ریاضت سے اونچے مقامات پر پہنچتے ہیں تو ان کے قلب کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ تو وہ۔ جوان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں ان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہ فائز المرام بن جاتے ہیں۔

میں نے اپنے بزرگوں سے ایک واقعہ سنا اور اس کے روایت کرنے والے حضرت مولانا منصور علی خان صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ مراد آباد کے علماء میں سے ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جو دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے بانی ہیں۔ جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا۔ تو حضرت مولانا منصور علی خان صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے خود مجھے اپنا واقعہ سنایا۔ کوئی راوی بھی بیچ میں نہیں۔ فرمایا کہ

"جب میں دارالعلوم میں طالب علمی کے زمانے میں مقیم تھا اور دارالعلوم کی بالکل ابتداء تھی۔ ابھی قائم ہی ہوا تھا اور حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ سے میں پڑھتا تھا۔ فرماتے تھے کہ: طلباء میں ایک نوجوان لڑکا بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا، اس سے ان کی آنکھ لڑ گئی۔ اور اس کا عشق ان کے قلب میں پیدا ہو گیا۔ مگر چوں کہ پاک دامن اور عفیف تھے۔ اس لئے برے جذبات سے تو قلب خالی رہا مگر عشق و محبت کی وجہ سے اس میں ایک سوختگی اور ایک اضطراب اور بے چینی ہر وقت ٹھہر گئی۔ ہر وقت ایک کوفت اور ایک سوزش رہنے لگی۔ اس لڑکے کا دھیان اور تصور رہتا"۔

فرماتے تھے کہ: اس کیفیت کا اتنا غلبہ ہوا کہ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سجدے میں بجائے "سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡاَعۡلٰی" کے اس لڑکے کا نام میری زبان سے نکلا، اس درجہ قلب پر اس کی محبت کا غلبہ ہو گیا۔ فرماتے تھے کہ میرے دل پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس محبت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میری دنیا گئی تھی تو گئی تھی۔ اب تو میرا دین بھی چلا۔ جب میری نمازیں ایسی ہو گئیں کہ اللہ کے نام کے بجائے غیر اللہ کا نام نکلے تو میرا دین ہی کیا باقی رہا؟

اس کی شکایت لے کر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت! یہ واقعہ ہے۔ حضرت کو پہلے سے معلوم تھا مگر فرماتے نہیں تھے۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو میرا دین بھی ضائع ہونے لگا۔ اب میری دستگیری فرمایئے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا۔ یہ اصل میں پٹھان تھے۔ اے جی! مولوی منصور علی! تم تو پٹھان آدمی ہو۔ اتنے ہی میں تم گھبرا گئے۔ اور یہ دھاڑیں مار کر رو پڑے اور کہا حضرت! یہ مذاق کا وقت نہیں۔ میرا تو دین بھی چلا اور میری دنیا بھی گئی۔ آپ خدا کے لئے میرا علاج کریں۔

حضرت نے فرمایا۔ کل صبح کی نماز کے بعد جب میں مسجد سے نکلوں اور حجرے میں جانے لگوں تو میرے ساتھ میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بولنا مت۔ میرے پاس آ کر بیٹھ جانا۔ چناں چہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ چھتے کی مسجد میں: جو دارالعلوم سے بالکل ملی ہوئی ہے اور وہیں سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح بھی ہوا ہے۔ اسی چھتے کی مسجد میں انار کا ایک درخت ہے۔ جو اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اسی کے نیچے سے دارالعلوم

دیوبند شروع ہوا۔ ایک استاد اور ایک شاگرد سے دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ہوئی ہے۔ استاذ کا نام مُلّا محمود رحمۃ اللہ علیہ تھا اور شاگرد کا نام حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ تو چھتّے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دو محمودوں کے نام سے دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ہوئی۔ اسی چھتّے کی مسجد میں ان تمام اکابر اہل اللہ کا اجتماع رہتا تھا۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اوّل ہوئے ہیں اور نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں۔ یہ چشتی تھے۔ اور ہماری پوری جماعت پر چشتیت ہی کا غلبہ ہے اور سلسلہ ہمارا چشتیہ ہے۔ گو ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں اور چاروں سلسلوں میں تربیت بھی کرتے ہیں۔ جس کو جس سلسلے سے مناسبت ہو، اسی میں بیعت و تلقین کی جاتی ہے۔ تو جامع الطرق ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔ اور اصل سلسلہ ہم لوگوں کا چشتی ہے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان سے لے کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

غرض، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ چشتیہ خاندان کے اکابر میں سے ہیں۔ تو حضرت مولانا منصور علی خان رحمۃ اللہ علیہ کو فرمایا کہ کل جب میں صبح کی نماز پڑھ کر حجرے میں جانے لگوں تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ مگر بولنا کچھ نہیں۔ چناں چہ حضرت جب نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے، یہ ساتھ ہو لئے۔ اور حضرت مولانا منصور علی خان مجھ سے کہتے تھے، میں نے اس دن حضرت کی آنکھوں میں سرخی اور کچھ غیر معمولی ہیئت دیکھی جس سے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجرے میں گئے اور میں بھی حجرے میں چلا گیا اور میں نے کواڑ بند کر دیئے، فرماتے تھے جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ جا کر بیٹھ گئے۔ اور میں سامنے مودّب بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑا۔ فرماتے تھے میں نے اپنا داہنا ہاتھ حضرت کے ہاتھ میں دیا تو حضرت نے میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں کے اوپر رکھ دیا اور اپنا داہنا ہاتھ میرے داہنے ہاتھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا جیسے کوئی رسی یا بان بٹا کرتا ہے۔

حضرت مولانا منصور علی خان رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے فرماتے تھے میں تم سے حلفِ شرعی کر کے اور اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جب تک حضرت میرے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پورے آسمان اور زمین کی چیزیں مجھ پر روشن تھیں۔ ملائکہ کی آمد و رفت مجھے نظر آ رہی تھی۔ چڑھ رہے ہیں اور اتر رہے ہیں۔ گویا پورا عالمِ غیب مجھ پر منکشف تھا۔ یہ میری کیفیت تھی۔ اخیر میں زور سے ہاتھ پھیر کر مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اٹھ جاؤ یہاں سے فرماتے تھے میں باہر آیا، باہر آ کر جب مسجد سے باہر نکلا تو یہ سوچتا ہوں کہ کوئی چیز میرے قلب کے اندر تھی جو نکل گئی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ چیز کیا تھی۔

یہ اس لڑکے کی محبت تھی مگر یہ بھی بھول گئے کہ وہ کیا چیز تھی اور سوچتے ہوئے جا رہے ہیں کہ کوئی چیز میرے

قلب سے نکلی ہے جو میرے قلب میں جمی ہوئی تھی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ فرماتے تھے کہ: جب دارالعلوم کے قریب پہنچا ہوں جو سڑک پر ہے تو وہ لڑکا نظر آیا اسے دیکھ کر یاد آیا کہ اچھا اس کی محبت تھی جو قلب میں گھسی ہوئی تھی، وہ ایسی نکلی کہ یہ بھی یاد نہیں آرہا کہ وہ قلب کے اندر تھی بھی یا نہیں۔ تو میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول کے صحابی رضی اللہ عنہم تو بہت اونچی شخصیتیں ہیں۔ بہت بالاتر ہیں۔ ان کے غلاموں اور خدام کو یہ کیفیت دی گئی ہے کہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیں تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہونے لگتی ہیں۔ اللہ نے انسان کو دل ایک ایسی کائنات عطاء کی ہے کہ اگر انسان دل کو سنوار لے تو شاہد ہی نہیں بلکہ غیوب کی چیزیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ بڑے بڑے علوم اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

مرکزِ تجلیّاتِ ربّانی...... اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ قلب فی الحقیقت 'عَرْشُ الرَّحْمٰنِ'' ہے۔ دنیا کے اندر عرشِ عظیم کی کوئی تمثال موجود ہے، اور عرش کا کوئی نمونہ موجود ہے تو وہ انسان کا قلب ہے۔ جس میں تجلیاتِ ربّانی اترتی ہیں۔ انسان کے ہاتھ پر تجلیات نہیں اترتیں، انسان کے دماغ پر تجلیات نہیں اترتیں۔ تجلیّاتِ ربّانی کا اگر مرکز ہے تو وہ قلب ہے۔ اس لئے کہ ''عرش الرحمٰن'' ہے، تو کائناتِ آفاق میں عرشِ عظیم وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت مستوی ہے۔ جس کو فرمایا گیا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ① اور کائناتِ انفس میں عرشِ عظیم انسان کا قلب ہے جس پر رحمٰن کی تجلیات آتی ہیں۔ تو جس انسان کو قلب جیسی دولت دی جائے جس کے اندر غائب وشاہد کے سارے نقش ونگار ہوں، اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ دنیا کے نقش ونگار میں گھومتا پھرے کہ۔

تو طفلی و خانہ رنگین است

اس کو ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ موقع نہیں ہے۔ اس کا تو کام یہ ہے کہ رومیوں کی صنعت انجام دے۔ اور اپنے دل کو صیقل کرے۔ ساری چیزیں خود بخود نظر آئیں گی۔

سیرتِ انسانی کا جوہرِ اوّل...... اور پھر جب اس میں چیزیں منکشف ہو جائیں گی، اور علم ومعرفت کا کمال پیدا ہو جائے گا تو کہا جائے گا کہ اب اس میں انسانیت آئی ہے۔ اب اس کے لئے شرافت کا راستہ کھلے گا۔ تو انسان نہ اپنے مادّے سے افضل بنتا ہے نہ اپنی صورت سے افضل بنتا ہے، نہ اپنے لباس سے افضل بنتا ہے۔ بنتا ہے تو اپنے دل سے افضل بنتا ہے۔ اور دل کب افضل بنتا ہے۔ اس وقت افضل بنتا ہے۔ جب عرش الرحمٰن بن جائے، اور اللہ تعالیٰ کی علمی تجلیّات اس پر آنے لگیں۔ اللہ کی معرفت اس کے اندر اتر جائے۔ تب کہا جائے گا کہ اب انسان حقیقی معنی میں انسان بنا ہے۔

تو صورت سے آدمی، آدمی نہیں بنتا۔ سیرت سے بنتا ہے اور سیرت کا پہلا رکن علم ہے۔ اگر علم نہیں بلکہ قلب میں جہالت پڑی ہوئی ہے تو سیرت کا ابتدائی زینہ طے نہیں ہوا۔ غرض سیرتِ انسانی کا پہلا رکن یہ ہے کہ اس کے

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۔

اندر علم ہو۔ جہالت سے سیرت نہیں بنتی، علم سے سیرت بنتی ہے۔ بے بصیرتی سے سیرت نہیں بنتی ہے۔ بصیرت سے بنتی ہے اور بصیرت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ علم و معرفت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ تو جب آدمی رومیوں کی صنعت جاری کرتا ہے تو یہ انسان کی سیرت کا ابتدائی زینہ ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں۔ سارے انسان تباہ و برباد ہیں۔ اگر بچنے والے ہیں تو اہلِ علم ہیں جو بچیں گے۔

تو انسان کے معنی کیا ہیں؟ مادّے کے لحاظ سے انسان، صورت کے لحاظ سے انسان، لباس کے لحاظ سے انسان؟ فرماتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز نجات دینے والی نہیں ہے۔ خوبصورتی نجات نہیں دلائے گی۔ یہ گندے مادّے نجات نہیں دلائیں گے، یہ فاخرہ لباس نجات نہیں دلائیں گے، اگر نجات دلانے والی چیز ہے تو علم ہے۔ جس سے انسان حق و باطل کو پہچانے، صحیح غیر صحیح میں فرق کرے، جائز و ناجائز کا امتیاز کرے۔ اگر اس میں یہ امتیاز نہیں اور حلال و حرام کی تمیز نہیں۔ کھانا جانتا ہے مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا، پہننا جانتا ہے مگر حرام و حلال کو نہیں جانتا، پھر بیل میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟

بیل بھی کھانا جانتا ہے مگر جائز و ناجائز کو نہیں جانتا۔ بیل بھی تو مکان چاہتا ہے کہ جس میں رہے، مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا۔ غیر کا مکان ہو جب بھی آ جائے گا۔ اپنے مالک کا مکان ہو جب بھی کھڑا ہو جائے گا۔ اپنے مالک کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اور غیر کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اسے جائز و ناجائز کی تمیز نہیں۔ آخر بیل ہی تو ٹھہرا۔ اگر انسان میں بھی جائز و ناجائز کی تمیز نہ ہو، حلال و حرام کا امتیاز نہ ہو، تو بیل اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ حیوانیت محضہ ہے۔ تو انسان، انسان جب بنتا ہے کہ جب اس کے اندر علم آ جائے۔

علمِ ضروری کی مقدار...... اور علم بھی وہ کہ وہ محض دانستن کا نام علم نہیں، محض جان لینے کا نام علم نہیں۔ اس لئے کہ تھوڑا بہت علم تو بیل کو بھی ہے۔ وہ بھی تو جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے۔ یہ نہیں، یہ مجھے گھاس دانہ ڈالتا ہے، یہ نہیں ڈالتا ہے۔ اس کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ دوسرے کے آگے نہیں۔ اتنا علم تو کتا بھی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے، اس کے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔ اور غیر آ جائے اس پر حملہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تو وہ فرق محسوس کرتا ہے کہ یہ مکان کا مالک ہے اور یہ نہیں۔ اسے مکان میں آنے کا حق ہے اور اجنبی کو نہیں۔ ہاں اگر مالک کتے کو ڈانٹ دے، تو چپکا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مالک نے اجازت دے دی تو اس کے آنے کا حق پیدا ہو گیا۔

ہمارے حاجی محمد شفیع صاحب جن کی کوٹھی پر ہم ٹھہرے ہوئے ہیں، انہوں نے بڑا زبردست قسم کا جنگلی کتا پال رکھا ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیں تو صرف حملہ نہیں کرتا بلکہ وہ تو ایک دم گلا دبا دیتا ہے۔ کوئی بھی آئے اس نے بھونکنا شروع کیا لیکن حاجی صاحب جب ایک ڈانٹ لگاتے ہیں تو چاہے دس آدمیوں کے ساتھ آئیں، چپکا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ مکان ان کا نہیں، مالک کا ہے۔ مالک اجازت دے گا تو آنے کا حق

حاصل ہے۔ نہیں اجازت دے گا تو آنے کا حق حاصل نہیں۔ غرض اتنا تھوڑا بہت علم تو کتا بھی رکھتا ہے۔ اتنا علم اگر انسان میں آئے تو اتنا علم حیوانیت کے لئے بھی ہے۔ حقیقی علم وہ ہے جس سے انسان حلال وحرام کو پہچانے، حق ناحق کو پہچانے، جائز وناجائز میں فرق کرے۔ یہ کام انسانی قلب کا ہے، ہاتھ پیر کا نہیں۔

قلب کا امتیازی ادراک...... امام رافعی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کے اندر سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ صرف ایک قلب ہے جو آخرت کا عضو ہے۔ اور حق وباطل میں امتیاز کرتا ہے۔ ہاتھ اگر مال لے تو جائز مال بھی ہاتھ اٹھائے گا۔ ناجائز مال کو ہاتھ ڈالیں وہ بھی ہاتھ پکڑ لے گا۔ یہ نہیں ہے کہ رشوت کا مال ہو تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگیں اور جائز مال ہو تو آپ لپے چلے آئیں۔ نہیں۔ جس طرح سے خوشگواری کے ساتھ پچاس ساٹھ روپے جائز ہاتھ اٹھائے گا، اگر ساٹھ ستر رشوت کے آ گئے، وہ بھی اٹھالے گا۔ چوری کے آ گئے وہ بھی اٹھالے گا۔ تو جائز و ناجائز میں ہاتھ کو کوئی امتیاز اور تمیز نہیں۔ یہ بیچارہ محض مالیت دینے اور پکڑنے کا عادی ہے۔ حلال ہو یا حرام۔ اگر آدمی ناجائز مال کھائے تب بھی زبان کو وہی لذت آئے گی جو زبان کو جائز مال کھانے سے آئے گی۔ کیوں کہ زبان کو یہ تمیز نہیں ہے کہ یہ جائز اور یہ ناجائز ہے۔ یہ حلال اور یہ حرام ہے۔

اگر آپ چلیں تو جس طرح سے آپ مسجد کی طرف چلتے ہیں۔ یہی پاؤں آپ کو شراب کی بھٹی کی طرف بھی لے جا سکتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ شراب کی بھٹی کی طرف جائیں تو پاؤں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی، اور مسجد کی طرف جانے میں قدم ذرا جلدی اٹھیں گے۔ بلکہ مسجد کی طرف جانے میں ذرا کم اٹھتے ہیں، شراب کی بھٹی کی طرف جانے میں زیادہ اٹھتے ہیں۔ مگر تمیز کی وجہ سے نہیں، عادت کی وجہ سے۔ تو پیر کو کوئی جائز وناجائز کی تمیز نہیں لیکن قلب کے اندر احساس موجود ہے، جب چور چوری کا مال لے کر آئے گا تو ضمیر اس کو ملامت کرے گا کہ کم بخت! تو نے بری حرکت کی، اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے مگر قلب اسے صحیح مشورہ ہی دے گا، تو انسان کا قلب آخرت کا عضو ہے۔ وہ حق اور ناحق میں تمیز چاہتا ہے۔ وہ اچھے اور برے میں امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اگر اس قلب کو صاف کر لیا جائے تو پھر اللہ کی مرضی کیا ہے اور نامرضی کیا ہے؟ اس کو پہچاننے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کس چیز کو پسند کرتے ہیں اور کس چیز کو ناپسند کرتے ہیں۔ تو علم کا ابتدائی درجہ تمیز ہے کہ آدمی حق وباطل اور جائز وناجائز میں امتیاز کرے۔

حقیقتِ علم...... علم کی حقیقت ہی درحقیقت تمیز ہے۔ یعنی دو چیزوں کو ممتاز کئے رکھنا۔ اور دو چیزیں رل مل جائیں اور مشتبہ ہو جائیں تو کہیں گے کہ اس شخص کو علم نہیں ہے۔ اگر علم ہوتا تو دونوں چیزوں کو الگ الگ دیکھتا، اور دونوں چیزوں کو الگ الگ سمجھتا، تو امتیاز پیدا کر دینا یہ علم کا مرتبہ ہے۔

علم الفرقان...... اور یہ علم جب اونچا بنتا ہے تو اور زیادہ تمیز پیدا ہوتا ہے۔ اور علم میں کمال تقویٰ سے آتا ہے۔ جتنا تقویٰ وطہارت ہوگا، علم میں کمال پیدا ہوتا جائے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ

تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ① اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگو اور متقی بن جاؤ تو اللہ تم میں فرقان پیدا کر دے گا''۔ فرقان: کے معنی اس اندرونی قوت کے ہیں جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کر دے۔ جائز کو ناجائز سے علیحدہ کر دے۔ جب یہ تمیز پیدا ہو جائے تو کہا جائے گا تقویٰ کامل ہو گیا۔ تقویٰ کا اثر یہ ہے کہ انسان کا دل خود بھلائی اور برائی میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔

ترتیبِ استفتاء...... اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَاِنْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ'' ② جب کوئی معاملہ پیش آئے پہلے اپنے دل سے فتویٰ لو''۔ دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے، یہ بات غلط ہے، مفتیوں کے پاس تو بعد میں لے جاؤ، پہلے دل سے فتویٰ لو۔ ایک آدمی بعض اوقات چاہتا ہے کہ فتویٰ میرے مطابق ہو جائے، فتویٰ وہ ہو جس کو میرا نفس چاہتا ہے۔ تو الٹے سیدھے سوال بنا بنا کر مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب مفتی تو جواب وہی دے گا جیسی سوال کی صورت ہو گی۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق جواب حاصل کر لیا اور اس پر عمل کیا۔ ظاہری طور پر آپ کہیں گے کہ بھائی! مفتی کے فتوے پر عمل کر رہا ہے۔ بے چارہ معذور ہے، مگر دیانۃً معذور نہیں ہے، اللہ جانتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر سوال غلط بنایا تھا کہ دنیا کو دکھلانے کے لئے کہہ سکے کہ فتویٰ پر عمل کر رہا ہوں۔ یہ تو اپنے نفس کے تقاضوں پر عمل کر رہا ہے۔ اور جب انسان سب سے پہلے اپنے نفس سے فتویٰ لے۔ پھر مفتیوں سے فتویٰ لے، دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا: ''اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَاِنْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ.'' بہرحال انسان کے قلب کے اندر جب علم کی طاقت آتی ہے تو امتیاز پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، تو کہا جائے گا کہ انسانی سیرت کا پہلا جوہر قلب کے اندر آ گیا، ابتدائی درجہ یہ ہے کہ انسان میں حق ناحق کا علم اور امتیاز ہو جو جانوروں کو میسر نہیں ہے۔ اس واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ.'' لوگ سب کے سب برباد ہیں۔ نہ ان کا مادہ ان کو بچا سکے گا، نہ ان کی صورت ان کو بچا سکے گی، نہ ان کا لباس ان کو بچا سکے گا۔ غرض لوگ ہلاکت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اہلِ علم بچنے والے ہیں۔ جن کے اندر جائز و ناجائز کا امتیاز ہے۔

سیرتِ انسانی کا دوسرا جوہر...... لیکن اگر آپ غور کریں تو علم محض بھی نجات دلانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ جتنا علم زیادہ ہو گا زیادہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ علم سے مقصد فی الحقیقت عمل ہے۔ اگر علم پر عمل مرتب نہ ہو تو کہا جائے گا کہ یہ علم لغو، بیکار اور فضول ہے۔ علم کی غرض و غایت اس کا استعمال میں لانا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہے۔ ''اَلشَّیْءُ اِذَا خَلَا عَنِ الْغَایَةِ لَغَا'' جب شے اپنی غرض و غایت سے خالی ہو جاتی ہے، تو وہ لغو اور بیکار ہو جاتی ہے۔ گھوڑے کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس پر سواری ہو، جب وہ سوار ہونے نہ دے اور بدکنا

---

① پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۲۹۔ ② مسند احمد، حدیث وابصۃ بن معبد الاسدی ج: ۳۶ ص: ۴۳۸۔ السنن للامام الدارمی، کتاب البیوع، باب دع مایریبک الی مالا یریبک، ج: ۸، ص: ۲۸، رقم: ۲۵۸۸۔ مشکاۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال، ج: ۲، ص: ۱۲۶، رقم: ۲۷۷۴۔

شروع کرے، کھانے کو سینکڑوں روپے روز کھا جائے اور جب مالک سواری کے لئے آئے تو دولتیاں مارنا شروع کردے، تو کہا جائے گا کہ گھوڑے کی غرض وغایت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ گھوڑا گولی ماردینے کے قابل ہے۔ حالاں کہ گھوڑا موجود ہے۔ اور عمدہ شکل میں ہے۔ مگر جتنی اچھی شکل ہوگی، آقا کو اور بری معلوم ہوگی۔ جب غرض پوری نہیں ہوگی۔ غرض اس سے یہ ہے کہ سواری کا کام دے، تو جب شے اپنی غرض سے خالی ہو جاتی ہے، وہ لغو بن جاتی ہے اور گولی ماردینے کے قابل ہوتی ہے۔

اگر انسان بیوی کرتا ہے، اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ وہ گھر کی مالکہ بنے، گھر ستی کا کام کرے، اس کی نسل بڑھے۔ اگر وہ اتنی پھوہڑ ہو کہ گھر کو بھی تباہ کردے۔ نسل اس سے نہیں چلتی۔ تو سوائے اس کے کہ خاوند اسے طلاق دے یا اس کو ایک طرف بٹھا کے کوئی دوسرا نکاح کرے، اس کے سوا اور کیا کرے گا۔ جو اس کے نکاح کی غرض وغایت تھی، جب حاصل نہ ہوئی تو وہ لغو اور بیکار ہوگئی، کسی نے اگر بہت زیادہ دلداری کی اور ہمدردی کی تو طلاق نہیں دے گا، کچھ روزینہ مقرر کرے گا اور کہے گا چوکی پر بیٹھ کر "اَللّٰہُ اَللّٰہُ" کرتی رہ، اس کے سوا تو کسی کام کی نہیں ہے اور دوسرا نکاح کرے گا۔ غرض جب شے اپنی غرض وغایت سے خالی ہو جاتی ہے تو لغو اور بیکار بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے علم اگر عمل کا فائدہ نہ دے تو وہ علم لغو اور بیکار ہے۔ وہ وبالِ جان بن جائے گا، اور فضول ہو جائے گا، تو جب تک علم پر عمل کی غایت مرتّب نہ ہو، علم بیکار ہے۔ اس سے معلوم ہوا علم محض انسان کو نجات نہیں دلا سکتا۔ نجات دلانے والی چیز انسان کا عمل ہے جو اس علم کے مطابق ہو۔ یہ اصل میں نجات دینے والی چیز ہے۔ اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' انسان سب کے سب تباہ و برباد ہیں بچیں گے کون؟ صرف علم والے اور پھر فرماتے ہیں: ''وَالْعَالِمُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ'' علماء بھی سب کے سب وہ بچیں گے جو اپنے علم پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ تو عمل نجات کا ذریعہ ہے۔ محض کورا علم نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔

تجمّل علم کا فتنہ...... کورا علم تو تجمّل ہے۔ اور ایک ترفّع ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: اخیر زمانے میں علم تجمّل کا ذریعہ بن جائے گا، جیسے انسان اپنے کپڑوں سے زینت حاصل کرے گا، اپنی رنگت سے زینت حاصل کرے گا، اسی طرح اپنے علم سے بھی زینت حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہوگا۔ علم کو استعمال میں لا کر انسان نجات کی طرف نہیں چلے گا۔ بلکہ فخر و مباہات کا ذریعہ بنالے گا۔ تو ایسا علم انسان کے اوپر وبالِ جان ہے۔ اس لئے فرمایا کہ علماء بھی سب کے سب تباہ و برباد ہیں۔ اگر اپنے علم پر عمل کرنے والے نہ ہوں۔ گویا انسانیّت کی غرض وغایت علم ہے اور علم کی غرض وغایت عمل ہے، اگر علم نہیں تو انسانیت لغو ہے۔ اگر علم ہے اور عمل نہیں تو علم لغو اور بیکار ہو گیا۔ غرض علم پر عمل نجات کا ذریعہ ہے۔

سیرتِ انسانی کا تیسرا جوہر...... لیکن اگر آپ غور کریں تو عمل بھی نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ عمل ایک ڈھانچہ ہے، جب تک اس کے اندر روح نہ ہو، وہ محض ایک لاش ہے اور لاش کار آمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی ڈھانچے میں روح موجود نہ ہو تو وہ اس قابل ہے کہ اسے جلد از جلد زمین میں دفن کر دیا جائے۔ اگر وہ لاش یوں ہی پڑی رہے گی

تو پھولے گی، پھٹے گی، بدبو پیدا ہوگی دماغ خراب ہوں گے، تو لاش کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اسے جلد سے جلد خاک میں ملا دیا جائے، جلد سے جلد اسے دریا برد کر دیا جائے۔ ورنہ دنیا کا دماغ صحیح سالم نہیں رہے گا۔

اسی طرح سے عمل ایک لاش اور ایک ڈھانچہ ہے۔ اگر اس کے اندر روح موجود ہے تو وہ اخلاص اللہ کی ہے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو، اس میں شرک کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اگر اس میں شرک کا شائبہ ہے وہ عمل غیر اللہ کے لئے ہے یا وہ عمل مشترک ہے کہ کچھ اللہ کے لئے ہے کچھ غیر اللہ کے لئے ہے تو درحقیقت وہ عمل بے روح کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اور وہ عمل سوائے اس کے کہ پھولے، پھٹے، سڑے اور گلے، آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔ تو عمل کی روح اخلاص ہے کہ خالص اللہ کے لئے ہو، اس میں غیر کی رضا کی آمیزش نہ ہو۔

رضائے خلق کا طریق...... بلکہ غیر بھی جب ہی راضی ہوگا، جب اس کی رضا پیشِ نظر ہو۔ کیوں کہ جب اللہ کی رضا پیشِ نظر ہوگی، اغیار بھی راضی ہوں گے۔ اور اگر صرف غیروں کے راضی کرنے کی فکر کرو گے تو نہ وہ راضی ہوں گے نہ اللہ راضی ہوگا۔ تو کوئی بھی راضی نہ ہوا اور خدا کو راضی کرنے کی فکر کی تو غیر بھی راضی ہو جائے گا، انسان بھی راضی ہو جائے گا۔ انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی راضی ہو جائے گا، نباتات بھی راضی ہوں گے۔ جمادات بھی راضی ہو جائیں گے۔ ''مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ'' ① جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ جس کا اللہ ہو جائے ساری کائنات اس کی ہو جاتی ہے، اس سے سرتابی نہیں کر سکتی تو۔

تو از حکمِ داور گردن مپیچ　　　　که گردن نه پیچد ز حکمِ تو ہیچ

تیرا کام یہ ہے کہ مالک کے حکم سے گردن مت پھیر، اگر تو نہ پھرا تو ساری گردنیں تیرے آگے جھک جائیں گی۔ اور اگر تو نے مالک سے گردن پھیر لی تو ساری گردنیں تیرے سے الگ ہو جائیں گی اور اکڑ جائیں گی۔ بہر حال اللہ کو راضی کرے گا تو مخلوق خود بخود راضی ہو جائے گی، اور وہ راضی نہ ہوئے تو کوئی بھی راضی نہیں ہوگا۔ اس ''ایک'' کو آدمی پکڑ لے۔

مالک کی نگاہ کی عظمت...... ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے دربار میں ایک دفعہ جوش میں آ کر اعلان کیا کہ آج جو شخص جو کچھ مجھ سے مانگے گا، میں اس کو دوں گا۔ لوگوں نے مانگنا شروع کیا۔ کسی نے کہا مجھے گورنری دے دیجئے، اس نے کہا۔ دے دی۔ کسی نے کہا مجھے فلاں قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا میں نے دے دیا، کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دیجئے، اس نے کہا میں نے دے دیا، ہر ایک نے اپنی اپنی مراد پیش کرنی شروع کی اور بادشاہ نے پوری کرنی شروع کر دی۔

ہارون الرشید کی پشت پر ایک باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے کہا تو نے اب تک کچھ نہیں مانگا؟ اس نے کہا ان احمقوں کو نمٹنے دو، اس کے بعد مانگوں گی، ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ اچھا۔ یہ میری

① احياء علوم الدين، بيان توكل المعيل ج: ۴ ص: ۲۷۴.

دولت کے امراء، وزراء سب کے سب احمق ہیں۔ اس نے کہا سب پاگل اور بے وقوف ہیں۔ انہیں مانگنا ہی نہیں آتا۔ ہارون سمجھا کہ ناقص العقل تو ہے ہی، کون اس کے منہ لگے، خاموش ہو گئے، لوگ مانگنے پر کھڑے ہوئے تھے، کسی نے کچھ مانگا، کسی نے کچھ مانگا، وہ دیتے رہے، جب سب نمٹ گئے تو ہارون الرشید نے کہا، اب تو مانگ کیا مانگتی ہے۔ اس نے کہا سارے بے وقوف تو نمٹ چکے ہیں۔ اب میرے مانگنے کا موقع ہے، کیا آپ مجھے دیں گے۔؟ ہارون الرشید نے کہا۔ میں تو اعلان کر چکا ہوں کہ جو کوئی آج مجھ سے جو مانگے گا میں اس کو دوں گا، اس نے جا کر ہارون الرشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ "میں تو آپ کو مانگتی ہوں، آپ میرے ہو جائیے"۔

اس واسطے کہ جب آپ میرے ہیں تو قلعے بھی میرے ہیں، خزانے بھی میرے ہیں، رعایا بھی میری، ملک بھی میرا، اگر آپ میرے نہیں ہیں تو خزانہ آئے گا نہیں، اگر آئے گا تو پھر چھن جائے گا۔ اس لئے میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا جتنے مانگنے والے تھے ان میں سے جس نے دس لاکھ مانگے، اسے دس لاکھ مل گئے، آگے کچھ نہیں ملا، کسی نے قلعہ مانگا آپ نے قلعہ دے دیا، آگے اس کی کوئی چیز نہ ہوئی، میں نے جو چیز مانگی، وہ مل گئی۔ تو ساری چیزیں میری ہیں۔ اور میں نے ان کو بے وقوف اس لئے کہا کہ اگر دس لاکھ مل گئے تو دس لاکھ ہی ہوئے، زائد تو نہ ہوئے، اور وہ دس لاکھ بھی معرضِ خطر میں ہیں۔ اس لئے کہ اگر ہارون الرشید کی نگاہ پھر گئی اور اس نے کہہ دیا کہ ان سے یہ چھین لو، اور قلعہ دیا تھا، بعد میں نگاہ پھر گئی تو قلعہ چھین جائے گا، اگر وزارت دی تھی، بعد میں نگاہ پھر گئی تو بادشاہ کہہ دیں گے کہ اس سے عہدہ چھین لو۔ تو اصل میں تو بادشاہ اور صدر کی نگاہ ہوتی ہے۔ اس کو دیکھا جاتا ہے، اگر یہ قائم ہے تو یہ سب چیزیں ہیں۔ اگر وہ نہیں ہے تو کسی چیز کے آپ مالک نہیں بن سکتے۔

تسخیرِ خلائق...... یہی حالت ہے اللہ والوں کی اور دنیا والوں کی کہ دنیا والے کوئی قلعہ مانگتا ہے، کوئی لاکھ مانگتا ہے، کوئی کروڑ مانگتا ہے اور اللہ والے کہتے ہیں کہ "یا اللہ! ہمیں تو آپ درکار ہیں، اور کوئی چیز درکار نہیں، جب آپ مل گئے تو ساری دنیا ہماری، سارے قلعے ہمارے، سارے ملک ہمارے ساری مخلوق ہماری، جانور بھی ہمارے سامنے سر جھکائیں گے، اور انسان بھی"۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اگر جمادات کو حکم کرتے ہیں، وہ فرماں برداری کرنا اپنا فخر جانتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء کی ضرورت محسوس ہوئی اور ریگستان چٹیل میدان تھا، درخت اور سایہ دور دور تک میلوں پر تھا۔ آپ نے دو درختوں کو اشارہ فرمایا، تو ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہے، ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ دونوں نے مل کر اپنی شاخیں ملا دیں اور اس طرح سے ملا دیں کہ ہر طرف سے بالکل پردہ سا ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضروریات سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد اشارہ فرمایا۔ وہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔ یہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔ حکومت تو یہ ہے کہ ساری کائنات پر حکمرانی ہے اور کیوں ہے؟ اس لئے کہ جو کائنات کا مالک ہے اسے اپنا لیا تو ساری چیزیں اپنے قبضے میں آ گئیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان اور بڑے رتبے ہیں۔ ان کے خدام وغلام اوران اولیاءِ کرام کی بھی بڑی شان ہے کہ جب وہ اپنے کو حق تعالٰی کے سپرد کردیتے ہیں تو ساری کائنات ان کی تعمیل حکم کرنا اپنا فخر جانتی ہے، اپنے لئے سعادت جانتی ہے، جمادات بھی حاضر نباتات بھی حاضر اور انسان بھی حاضر۔ سب چیزیں سامنے حاضر رہتی ہیں۔ یہ اخلاص للہ کی برکت ہوتی ہے کہ اپنے کو خالص اللہ کے سپرد کردے، جس میں غیر کا شائبہ نہ ہو۔

قلبِ مشرک کا تذبذب...... اس لئے کہ جب غیر کا شائبہ ہوگا تو حضرت عیسٰی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: دو۲ آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔ جو چند آقاؤں کا غلام ہوگا تو ایک کی خدمت کی طرف جائے گا تو اسے ڈر ہوگا کہ دوسرا ناراض نہ ہوجائے۔ اس کی خدمت کی طرف جائے گا تو فکر پڑے گی کہ تیسرا ناراض نہ ہو جائے، اور سب کو ایک وقت میں راضی رکھنا مشکل ہے۔ تو نتیجہ یہ کہ چار آقاؤں کا غلام کسی ایک آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔ خادم وہی ہوگا جو ایک کا غلام ہو۔ سب سے کٹ کر ایک کا ہوجائے گا کہ مرتا ہوں تو اس کے لئے، جیتا ہوں تو اس کے لئے، اس کے قلب میں قوّت ہوگی۔ اس واسطے کہ قوت کا مرکز اخلاص ہے اور قوت یقین سے پیدا ہوتی ہے، تردّد اور تذبذب سے قلب میں ضعف پیدا ہوتا ہے، تو مشرک کے دل میں کبھی جان نہیں ہوسکتی اور موحّد کبھی ضعیف القلب نہیں ہوسکتا، موحّد کے قلب میں اس کی توحید کی وجہ سے قوت ہوتی ہے اور مشرک کے دل میں جان نہیں ہوسکتی، جس کے کروڑوں خدا ہوں، وہ کسی ایک طرف جھکے گا تو دوسرے کی فکر پڑے گی، اس کے دل میں جان نہیں رہے گی، ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔

قلبِ موحد کا یقین...... اور موحّد کے قلب کے اندر قوّت ہوتی ہے۔ تو موحّد اس کو ہی کہتے ہیں جو ایک کا ہوکر بقیہ سے قطع نظر کرے۔

موحّد چہ برپائے ریزی زرش   کہ فولادِ ہندی نہی برسرش

امید وہراسش نباشد ز کس   ہمیں است بنیادِ توحید وبس

موحّد کسے کہتے ہیں؟ کہ اس کے قدموں پر لاکھوں روپیہ ڈال دو، یا اس کے سر پر فولادِ ہندی کی تلوار لے کر کھڑے ہوجاؤ۔ اسے نہ کسی کا ڈر ہوگا نہ کسی سے امید ہوگی وہ تو ایک کا ہوچکا ہے نہ طمع مائل کرسکے گی، نہ خوف مائل کرسکے گا۔

روحِ عمل...... تو "ایک کا ہوجانا" اسی کے معنی ہیں "اخلاص"۔ اور عمل کے اندر اخلاص سے روح پیدا ہوتی ہے۔ جس عمل کے اندر شرک کا شائبہ بھی ہو، وہ عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا، اس میں روح ہی نہیں ہے۔

اور شرک فقط یہی نہیں ہے کہ آدمی دو۲ خدا مانے، خدا کو ایک مانے، صفات میں شرک اختیار کرے یہ بھی شرک ہے، صفات میں ایک مانے افعال میں شرک اختیار کرے۔ یہ بھی شرک ہے۔ افعال میں بھی ایک مانے، تو ذات بھی ایک، صفات بھی ایک، صفات میں بھی وحدانیت اور افعال میں بھی، لیکن عبادت میں شرک کرنے لگے

کہ دو کے سامنے سجدہ کرے، یہ بھی شرک ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ظاہر میں سجدہ بھی ایک ہی کے سامنے کرے تب بھی شرک کا ایک مقام ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اللہ کی عبادت کر رہا ہے مگر دل میں یہ خیال ہے کہ لوگ مجھے سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ریاء سب سے بڑا شرک ہے۔ دیکھنے میں شرک معلوم نہیں ہوتا مگر حقیقت میں شرک ہے۔ اور حدیث میں ارشاد ہے: ''اَلشِّرْکُ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ'' ① بعض شرک ایسا دقیق ہوتا ہے جیسا کہ چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چلے تو اس کی کھسکھساہٹ اتنی دقیق ہوتی ہے کہ کان نہیں سن سکتے۔ تو جیسے اس کا ادراک نہیں ہوتا، اس شرک کا بھی ادراک نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہ آدمی ایک اللہ کی عبادت کرے، اس کو یکتا جانے، صفات میں بھی یکتا جانے، ریا دکھلاوا بھی نہ ہو، مگر پھر بھی ایک درجہ کا شرک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے اندر عجب موجود ہو۔ یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال موجود ہو کہ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں، کون ہے جو میرے برابر عبادت کر سکے۔ یہ جو عجب اور خود بینی پیدا ہوئی۔ یہ بھی اس سے زیادہ دقیق قسم کا شرک ہے، جو عمل کو ضائع کر دے گا، اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کا ضائع ہونا شرک سے ہے اور عمل کی بقاء اخلاص سے ہے۔ تو جس چیز سے شے کی بقا ہوتی ہے اسی کو تو روح کہا جاتا ہے، بدن روح سے باقی رہتا ہے اور اگر عمل اخلاص سے باقی ہو تو اخلاص عمل کی روح ہے، جب تک اخلاص نہیں ہوگا عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا، اسی کو فرماتے ہیں کہ: ''وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلاَّ الْمُخْلِصُوْنَ''

عمل کرنے والے بھی سب کے سب ہلاک و برباد ہیں۔ اخلاص سے عمل کرنے والے بچیں گے، جن کے اندر خلوص نیت اور اخلاص موجود ہوگا۔ تو انسان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں، نجات کا اوّلین درجہ علم ہے۔ علم بھی کارآمد اور کافی نہیں ہے۔ دوسرا درجہ عمل ہے، عمل بھی کارآمد نہیں۔ تیسرا درجہ اخلاص کا ہے۔ جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو جائیں۔ علم بھی ہو۔ عمل بھی ہو۔ خلوص بھی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ اب انسانیت کے جوہر اس کے اندر متحقق ہو گئے، اب اس میں انسانیت اور کمالِ انسانیت آ گئی۔

سیرتِ انسانی کا چوتھا جوہر...... لیکن اگر غور کیا جائے تو اب بھی ایک چیز باقی رہ گئی، اگر وہ نہ ہو تو پھر یہ تینوں چیزیں اکارت بن جاتی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ نہ علم نجات دلائے گا نہ عمل، نہ اخلاص للہ جب تک وہ چوتھا جوہر موجود نہ ہو۔ اور وہ کیا ہے۔ ایک آدمی علم رکھتا ہے۔ بڑا اچھا عالم ہے، عمل بھی کر رہا ہے اور مخلصانہ عمل کر رہا ہے، لیکن اس عمل کرنے کے بعد مطمئن ہو بیٹھا کہ نجات تو میرے گھر کی باندی ہے۔ تو وہ ملے گی، اللہ سے بے فکر ہو بیٹھا۔ یہ نہیں جانتا کہ جس نے اخلاص دیا ہے اگر وہ کل کو ناخوش ہو جائے اور یہ چھین لے تو میری کیا گت بنے گی۔ جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ جو علم دے سکتا ہے وہ لے بھی سکتا ہے۔ جو اخلاص کا عطیہ بخشنے والا ہے اور وہ اسے چھین بھی سکتا ہے، اس لئے مخلص کا کام یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے مودبانہ کھڑا رہے کہ کہیں

① مسند احمد، حدیث ابی موسیٰ الاشعریؓ ج: ۴۲ ص: ۴۳۳ رقم: ۲۰۱۳۳.

مالک کی نگاہ نہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے سلب ہو جائیں۔تو جب تک انسان کے اندر مالک کے راضی رکھنے کی فکر نہ ، ہو وہ اطمینان سے نہ بیٹھے۔فکر میں رہے کہ معلوم نہیں کل کو کیا بات پیش آئے، اپنے علم کے اوپر غرّہ نہ کرے، اپنے عمل کے اوپر غرّہ نہ کرے، اپنے اخلاص کے اوپر غرّہ نہ کرے۔اسے توفیق خداوندی سمجھے، اگر ذرہ غرّہ کرلیا اور یہ سمجھ لیا کہ علم میرا ہے اور یہ ہنر میرا ہے۔یہ عمل میرا ہے اور یہ اخلاص میرا ہے۔بس یہ اس نے عمل کو اکارت کیا، تو یہ سمجھنے کے بجائے یہ سمجھے کہ یہ توفیق خداوندی ہے۔یہ عطیہ الٰہی ہے اور جو دینا جانتا ہے وہ چھیننا بھی جانتا ہے۔میں چوبیس گھنٹے اس کی چوکھٹ پر حاضر ہوں۔ایسے نہ ہو کہ اس کی نگاہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے چھین لی جائیں۔اس کا نام ''فکر'' ہے، جب تک یہ فکر نہ ہو اور جب تک اس میں بے اطمینانی کی کیفیت یعنی ''تفکر'' کی کیفیت نہ، ہو اس وقت تک بقائے علم، بقائے عمل اور بقائے اخلاص کی کوئی صورت نہیں۔

مقرّبین بارگاہ کی گرفت کا اندازہ...... اور بالخصوص ؎

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو زیادہ علم والے، زیادہ عمل والے اور زیادہ اخلاص والے ہیں وہ زیادہ ہلاکت کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں کہ ذرا قدم گرے تو ادھر بھی جہنم، ادھر بھی جہنم، ان کے خطرات اور ان کے وسواس پر بھی ان کی گرفت ہوتی ہے۔حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: سابق زمانے میں بنی اسرائیل میں ایک عابد زاہد گزرا ہے۔ روایت میں جس کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بُدُوْرُ السَّافِرَۃِ فِیْ عُلُوْمِ الْاٰخِـرَۃِ'' میں یہ حدیث نقل کی ہے۔آخرت کے احوال کے بارے میں ایک کتاب اس نام سے لکھی ہے۔اس میں قبر کے حالات، برزخ کے حالات اور عالم حشر کے حالات ہیں۔اس میں اس واقعہ کی بھی روایت نقل کی ہے۔

پچھلی امتوں میں ایک عابد زاہد گزرا ہے جو ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتا تھا۔عبادت و زہادت کے سوا اسے دوسرا کام نہیں تھا۔اس نے یہ دیکھا کہ میں عبادت تو کرتا ہوں مگر دنیوی اشغال میں بیوی ہے، بچے بھی ہیں، عزیز بھی ہیں نیز کمانا اور کھانا، دنیا بھر کے دھندے ہیں اور مجھے عبادت سے یہ چیزیں غافل بناتی ہیں، کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ دھندے ختم ہو جائیں اور میں صرف عبادت کے لئے فارغ ہو جاؤں تو اس نے تمام عزیزوں، رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر سمندر کے بیچ میں ایک ٹیلے کو اختیار کیا اور وہاں جا کر ایک کٹیا ڈال دی کہ بس یہاں پر بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مشغول رہوں گا۔

پچھلے ادیان میں رہبانیت جائز تھی۔اس نے رہبانیت اور گوشہ گیری اختیار کی، عزلت اور انقطاع اختیار کیا اور جا کر بیٹھ گیا، جو چھپر یا ڈالی تھی، اس کے نیچے بیٹھ گیا۔حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کی غذا کا یہ سامان کیا کہ اسی ٹیلے پر ایک انار کا درخت اگا یا، اس میں بڑے بڑے انار لگے اور اس کڑوے سمندر میں اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑی پر ایک میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ چوبیس گھنٹے میں ایک انار کھالیا اور ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے اس طرح اللہ کی یاد میں مشغول کہ نہ سونا، نہ آرام کرنا، بس یہی اس کا کام تھا۔ پانچ سو برس اس طرح سے اس کی عمر کے گزرے، گویا خالص عبادت جس میں ریا اور دکھلاوے کا کوئی شائبہ نہیں، ظاہر ہے کہ پہاڑ کے ٹیلے پر کس کو دکھلائے گا؟ وہاں اس کو دیکھنے والا کون ہے؟ تو خالص عبادت کی جس میں علم بھی صحیح تھا، عمل بھی صحیح تھا، اور اخلاص بھی صحیح تھا۔ یہاں تک کہ اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ ''اے اللہ! یہاں کوئی اور تو نہیں ہے جو مجھے نہلائے، کفنائے اور دفن کرے، یہاں تو میں اور تیری ذاتِ بابرکات موجود ہے۔ اس لئے ایک درخواست میری یہ ہے کہ مجھے سجدہ کی حالت میں موت دے۔ تاکہ عین خالص عبادت میں میری موت آئے''۔ اور دوسری درخواست یہ ہے کہ میری لاش کو قیامت تک سجدہ کی حالت میں محفوظ رکھا جائے۔ تاکہ میں قیامت تک تیرا صورتاً سجدہ گذار بندہ سمجھا جاؤں۔ پانچ سو برس کی عبادت تو نے مجھے عطا کی۔ اب ہزاروں برس قیامت تک بقیہ رہ گئے ہیں۔ اس میں میری لاش سجدے میں پڑی رہے۔ بگڑنے نہ پائے۔ تاکہ قیامت تک اسی طرح سجدے میں پڑا رہوں۔ اور میرا جسم سجدہ گذار رہے''۔

حق تعالیٰ نے دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ سجدے کی حالت میں موت آئی اور اس کا بدن بھی محفوظ ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اس کا بدن آج تک محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ نے اس ٹیلے پر اتنے بڑے بڑے عظیم الشان درخت اگا دیئے، اتنی اندھیری ہوگئی کہ اول تو لوگوں کا وہاں پہنچنے کا موقع نہیں، اور کوئی پہنچ جائے تو ہیبت کی وجہ سے اندر نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر لوگوں کو موقع مل جاتا تو لوگ تو مردوں کو نہیں چھوڑتے، قبروں کو نہیں چھوڑتے، اس کے آگے جا کے جانے کیا کیا کرتے۔ حق تعالیٰ نے اس کو چھپا دیا کہ نہ وہاں پہنچیں گے، نہ خرافات ہوں گی۔ اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ ''اس عابد کو اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے بندے، میں نے اپنے فضل وکرم سے تجھے بخشا اور میں نے تجھے جنت عطاء کی''۔ اس عابد کے دل میں ایک وسوسہ گزرا کہ پانچ سو برس تو میں نے عبادت کی اور خالص عبادت کی، بیوی بچوں کو چھوڑا، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا، اتنی محنت اٹھائی، اب بھی اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا، کم سے کم میری دلداری ہی کے لئے فرماتے کہ: تیری عبادت کے بدلے میں تجھے جنت عطاء کی۔ ذرا میرا دل تو خوش ہو جاتا کہ میں نے کچھ کیا۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ محض اپنے فضل وکرم سے بخشا۔ یہ اس کا کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ نہ کوئی جما ہوا خیال تھا، ایک وسوسے کے درجے میں اس کے دل میں یہ بات گزری تو ؎

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو مقربانِ بارگاہ الٰہی ہوتے ہیں۔ ان کے افعال پر اور ان کے خیالات پر بھی گرفت ہوتی ہے، تم اپنے دل میں یہ خیال کیوں لائے؟ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا۔ اس بندے کو بجائے جنت کی طرف لے جانے کے جہنم

کی طرف لے جاؤ، مگر جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔ بس اتنی دور لے جاؤ کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کا راستہ ہو، مگر جہنم کی ہوا وہاں پہنچتی ہو۔ وہاں لے جا کر اسے کھڑا کر دو۔ تو حدیث میں ہے کہ: ملائکہ لے گئے۔ اتنی دور تک لے جا کر اسے کھڑا کیا۔ جہنم کی ایک لپٹ اور لو آئی تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہو گیا، اور اس نے پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ: غیب سے ایک ہاتھ نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا ایک کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا ہوا آیا کہ اے اللہ کے بندے! یہ پانی مجھے دے۔ جتنا یہ آگے بڑھا وہ ہاتھ اتنا پیچھے ہٹ گیا۔ یہ اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔ آواز یہ آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے مگر مفت نہیں ملے گا، قیمت سے ملے گا۔ اور قیمت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس پانچ سو برس کی خالص عبادت ہو اگر وہ دے تو یہ کٹورا پانی کا مل سکتا ہے۔ ورنہ نہیں مل سکتا۔

یہ عابد دوڑا اور کہا کہ یہ حاضر ہے۔ میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ یہ اس نے دی اور پانی کا کٹورا لے کر پیا۔ دم میں دم آیا اور جان میں جان آئی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کو ارشاد ہوا کہ اس عابد کو لوٹا کر لاؤ۔ وہ واپس لایا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ اے بندے! تیری پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اور وہ تو نے ہی تجویز کی تھی۔ یعنی ایک کٹورا پانی۔ تو تُو نے اپنی پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی تجویز کیا۔ وہ ہم نے تجھے دے دیا، معاملہ برابر سرابر ہو گیا، نہ ہمارے ذمے کچھ رہا۔ نہ تیرے پاس کچھ رہا۔ اب جو دنیا میں تو نے ہزاروں کٹورے ہمارے پئے اس کا حساب دے کہ ایک ایک قطرے کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا۔ اور جو اناروں کے لاکھوں دانے کھائے، ایک ایک دانے کا حساب دے۔ ایک ایک دانے کے بدلے کتنے سجدے کئے۔

اور یہ تو دانا اور پانی ہے۔ وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے روشنی بخشی تھی کہ ایک تارِ نگاہ سے سینکڑوں چیزیں دیکھ لیتا تھا، ایک ایک تارِ نگاہ کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو ہم نے ٹھنڈی ہوائیں دی تھی کہ تو سانس لیتا تھا اور تیری زندگی قائم تھی، ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے؟ اور فرمایا کہ: یہ تو اسباب ہیں۔ ان سب کے بعد جو ہم نے تجھے عبادت کی توفیق بخشی اور طاقت دی تھی، اس توفیق کے بدلے میں بتلا تو کیا لے کر آیا ہے؟ یہ عابد تھرّا گیا۔ اور اس نے کہا کہ

مدارِ نجات فضل ہے، عمل نہیں..... ”اے اللہ! کسی کو کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ تیرا فضل ہی نجات دلائے گا۔ ہر آدمی تیرے ہی فضل سے بخشا جائے گا“۔

اسی کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدَکُمْ عَمَلُہٗ.“ تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا، محض اللہ کا فضل نجات دلانے والا ہے۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سن کر عرض کیا: ”وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ“؟ یا رسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ جس عمل کی قیمت وہ ہے کہ سارے آسمان اور زمین تل جائیں: ک سجدے کی قیمت نہ پڑ سکے۔ وہ عمل بھی نجات

نہیں دلائے گا؟ فرمایا: ''لَا! اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ۔'' مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ کا فضل دستگیری نہ کرے تو جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنی کسی عبادت کے اوپر غرّہ کریں، تو اصل میں اس عابد کو یہ بتلانا تھا کہ عمل نجات دھندہ نہیں ہے، فضل خداوندی نجات دھندہ ہے۔ ①

توفیقِ عمل، علامتِ فضل ہے..... مگر بھائی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ لجیو کہ جب عمل سے نجات نہیں ہوتی تو لاؤ پھر آج سے عمل وغیرہ سب چھوڑ دو، نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکوۃ اس لئے کہ نجات تو عمل سے نہیں ہے، وہ فضل سے ہوگی۔ اور فضل کے بارے میں کیسے پتہ ہے کہ کس پر ہوگا۔ اس کے سہارے سے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟ جس کی نجات ہونی ہوگی فضل سے ہو جائے گی۔ نہیں ہونی ہوگی نہیں ہوگی۔ عمل تو کارآمد ہے نہیں۔ تو یہ نتیجہ مت نکال لینا۔

بے شک عمل نجات دلانے والا نہیں۔ عمل سے نجات نہیں ہوگی، فضل سے نجات ہوگی۔ مگر فضل کے پہچاننے کا طریقہ درحقیقت عمل ہے۔ اگر عمل کر رہا ہے تو یہ علامت ہے کہ اللہ کا فضل متوجہ ہے۔ اور جو عمل نہیں کر رہا تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کے اوپر اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے۔ اس واسطے عمل مت ترک کیجئے۔ یہ مت سمجھ لینا کہ جب عمل سے نجات نہیں تو عمل کو چھوڑ دو، بے شک عمل نجات دھندہ نہیں، فضل ہے، مگر فضل کی علامت عمل ہے۔ عمل ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہے۔

دنیا میں فضل کی علامت یہ ہے کہ توفیق مل رہی ہے اور آخرت میں فضل کی علامت یہ ہے کہ جنت مل رہی ہے اور نعمتیں مل رہی ہیں۔ دونوں جہانوں میں دستگیری کرنے والا فضل ہے۔ عمل بھی تو فضل ہی سے کرتے ہیں۔ فضل متوجہ نہ ہو تو آپ عمل کیسے کریں۔؟ اس لئے کہ عمل توفیق سے کرتے ہیں۔ توفیق دینے والے وہ ہیں تو فضل ان کی طرف متوجہ ہو گیا، اگر توفیق نہ دیں تو آدمی عمل نہیں کر سکتا۔ تو سب سے بڑی نعمت انسان کے حق میں توفیق ہے۔

روحِ شکر..... حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا تھا ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا﴾ ② اے داؤد ہمارا شکر ادا کرو۔ تو حضرات انبیاء علیہم السلام اللہ کے کلام کو پورا سمجھتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ بے شک میں شکر ادا کروں گا۔ میرا فرض ہے کہ میں ادا کروں۔ یوں بھی فرض تھا اور جب آپ حکم دے رہے ہیں تو بالکل ہی فرض ہو گیا۔ مگر سوچ رہا ہوں کہ شکر ادا کروں تو کس طرح سے ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر کو ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو وہ توفیق ایک نعمت ہو گئی، پھر اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، اس شکر کی توفیق پھر آپ دیں گے۔ تو پھر ایک نعمت بن گئی، تو اس سے پہلے اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا، وہ بھی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المداومة علی العمل، ج: ۵، ص: ۲۳۷۳، رقم: ۶۰۹۸.

② پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیة: ۱۳.

توفیق آپ دیں گے تو وہ نعمت ہوگی، تو اس سے پہلے ایک اور شکر نکلا تو ہر شکر سے پہلے ایک اور شکر نکلتا ہے، میں شکر کی ابتداء کروں تو کس طرح سے کروں؟ میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔

ادھر سے جواب آیا کہ "اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو اپنی ہار مان لینا، یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو نے شکر ادا کر دیا۔ کوئی بندہ اللہ کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ ہم تو فرض ادا نہیں کر سکتے حق تو کیا ادا کریں گے۔ عاجز ہیں۔ اس عجز کو سمجھ لینا کہ ہم عاجز ہیں۔ یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ اپنی ہار مان لے کہ میں عاجز ہوں" سندِ شکر...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سیّد الحامدین ہیں جن سے بڑھ کر اللہ کی حمد وثنا کرنے والا عالَم میں کوئی نہیں۔ اخیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں کہ: "اَللّٰهُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ "① اے اللہ! میں تیری حمد وثناء کا ایک شمہ بھی نہیں ادا کرسکتا میں تیری حمد وثناء کا احصاء ہی نہیں کرسکتا"۔ بس مختصر یہ ہے کہ تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے آپ کو فرما دیا۔ میں عاجز ہوں کہ تیری حمد اور تیری ثناء وصفت کو ادا کرسکوں۔ اس لئے کہ وہ لامحدود ہے اور بندہ محدود ہے۔ اس کا کمال محدود، اس کی عقل محدود، اور اس کی طاقت محدود، تو محدود سے لامحدود کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟ "اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ" یہ وہی عجز کا ہی اعتراف ہے کہ میں تیری ثناء ادا کرنے سے عاجز ہوں۔ اسی کو سب سے بڑی سند سمجھا گیا جس نے ہار مان لی اور عجز تسلیم کرلیا وہی سب سے بڑی ثناء کرنے والا ہے۔ میرا ہی ایک شعر ہے۔ لمبی نظم تھی وہ میں بھول گیا۔ اس میں کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ؎

خدا کی تو ثنا کامل یہی ہے ۔۔۔ کہ ہم سے کچھ ثناء ممکن نہیں ہے

ہم سے کوئی ثناء ممکن نہیں۔ بس ثناء کا ادا کرنا ہے۔ بہر حال حق تعالیٰ شانہ جب فضل فرماتے ہیں تو توفیق بھی دی جاتی ہے۔ جب توفیق آتی ہے تبھی انسان عمل کرتا ہے۔ تو عمل اُدھر سے ہوا۔ ہماری طرف سے نہ ہوا۔

نفیِ عمل سے اثباتِ عمل...... اس واسطے اس عمل کو زیادہ قبول کرتے ہیں جس میں آدمی سمجھ لے کہ میں نے کچھ نہیں کیا، اور جو خود کہے کہ میں نے سب کچھ کیا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے غرّہ اور غرور کرے اور یوں کہے کہ اے اللہ! دیکھ میں نے تیری نماز پڑھی، میں نے حج کیا، میں نے جہاد کیا، میں نے یہ کام کیا۔ تو جواب میں فرماتے ہیں کہ: "نالائق! تو نے کیا کیا۔ بدن کے اندر طاقت تو ہم نے دی تھی، توفیق تو ہم نے دی تھی، ارادہ تو ہم نے پیدا کیا۔ تو نے کیا کیا؟ اور اگر کوئی بندہ سب کچھ کر کے کہے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے سب کچھ ہوا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں۔ "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِکَ" کوئی حول اور طاقت میرے اندر نہیں، توفیق تیری، طاقت تیری، ارادہ وقتی تیرا، میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "نہیں۔ عمل تو تُو نے ہی کیا، حرکت تو تو نے ہی کی، مسجد تک قدم اٹھا کر تو ہی گیا تھا۔ تو نے ہی سب کچھ کیا ہے"۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب الدعاء فی الرکوع، ص: ۱۲۸۸، رقم: ۸۷۹.

غرض جو اپنے عمل کی نفی کرتا ہے اس کا اثبات کرتے ہیں۔ اور جو خود اثبات کرنے لگے، اس کی نفی کر دیتے ہیں، جو نیچا بنے اسے اونچا اٹھاتے ہیں۔ اور جو خود اونچا بننے لگے اسے زمین کے اوپر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا کہ ؎

پستی سے سربلند ہو اور سرکشی سے پست　　　　اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جو جتنا نیچا بنتا ہے۔ اسے اونچا بناتے ہیں اور جو خود اونچا بننے لگتا ہے اس زمین پر گرا دیتے ہیں۔ تو اونچا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی نیچا بنجائے۔ بلند و بالا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ پست بن جائے۔

طریقِ عزّت...... عزت والا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنی ذلت پیش کر دے، عزّت آ جائے گی۔ اور جو خود ہی اپنی عزت کو سراہنے لگے، تو پھر ادھر سے پھٹکار برسے گی۔ ذلت برسے گی، اس لئے کہ کوئی عزّت کا مستحق نہیں۔ عزّت تو اللہ کی ہے۔ جو اس کے آگے جھک جائے اس کے لئے عزت آتی ہے۔

﴿فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① تو عزت اللہ کی، اس کے رسول کی اور مومنین کی ہے۔ بہر حال طریقہ عزت کا یہ ہے کہ اپنی ذلت محسوس کرے۔ اگر کوئی مخدوم بننا چاہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ یوں کہے کہ دیکھو لوگو! میں مخدوم ہوں۔ تم سب میرے غلام ہو۔ لوگ کہیں گے۔ نامعقول! تجھے شرم نہیں آتی، ایسا کلام کر رہا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ پست بن جائے گا۔ مخدوم بننے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کا خادم بن جائے، لوگ سروں پر اٹھائیں گے، وہ خود ہی مخدوم بن جائے گا۔ تو مخدوم بننے کا طریقہ خادم بننا ہے نہ کہ مخدومی کا دعویٰ اور ادّعا کرنا۔ دعویٰ کرنے والے کو پٹخ دیا جاتا ہے۔ بہر حال فضلِ خداوندی ہوتا ہے تو توفیق بھی ملتی ہے، توفیق ملتی ہے تو عمل بھی ہوتا ہے اور جس کی اس حقیقت پر نظر ہے کہ پہلے فضل آیا، پھر توفیق آئی، پھر میرے اندر ارادہ پیدا کیا گیا، پھر میرے اندر طاقت پیدا کی گئی، تب جا کے عمل ظاہر ہوا۔ جو اس سلسلے کو جانتا ہے۔ وہ کبھی دعویٰ نہیں کرے گا کہ میں نے عمل کیا، وہ تو یہ کہے گا کہ یہ سب کچھ اوپر سے ہے۔ میرے اندر تو کچھ بھی نہیں۔

سلسلۂ عمل پر نگاہ کا ثمرہ...... اب اس کی ایسی ہی مثال ہوگئی کہ دو آدمی کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں آئیں، اور یہ ان دونوں کا دعویٰ ہو کہ یہ جو کھیتی کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا دانہ سب میرا ہے۔ وہ بھی کہے کہ میرا ہے اور یہ بھی کہے کہ میرا ہے۔ تو ایک شخص سے مجسٹریٹ پوچھتا ہے کہ یہ زمین تمہاری ملکیت ہے؟ کہ نہیں صاحب! زمین کا میں مالک نہیں ہوں۔ بیج تم نے ڈالا تھا؟ نہیں بیج بھی میں نے نہیں ڈالا۔ پانی تم نے دیا تھا؟ نہ صاحب! پانی بھی اسی نے دیا تھا۔ میں نے نہیں دیا تھا۔ چھ مہینے خون پسینہ تم نے ایک کیا تھا؟ نہیں صاحب! وہ بھی اسی نے کیا تھا۔ باقی دانہ میرا ہے۔

تو مجسٹریٹ کہے گا کہ اس پاگل کو کان سے پکڑ کر نکال دو، نہ اس کی زمین، نہ اس نے بیج ڈالا، نہ اس نے پانی دیا، نہ اس نے محنت کی۔ اور دانے کا دعوے دار ہے۔ یہ کدھر سے دعوے دار ہو گیا؟ جس کی زمین ہے، جس نے بیج

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۸۔

ڈالا ہے، جس نے محنت اٹھائی، دانہ بھی اسی کا ہوگا۔

ایک عمل کرنے والا دیکھتا ہے کہ میرے اندر طاقت نہیں ہے۔ وہ بھی خدا نے دی، عمل کرنے کا ارادہ بھی میرا اپنا نہیں تھا، وہ بھی خدا نے دیا، توفیق میں نے خود نہیں پیدا کی، وہ بھی اسی نے دی۔ باقی عمل کا مالک میں ہوں۔ تو خدا کہے گا کہ اس نامعقول کو کان سے پکڑ کر نکال دو۔ توفیق ہم نے دی، قوت ہم نے دی، ارادہ ہم نے دیا، یہ عمل کا کیسے مالک ہے؟

اور جس کی نگاہ پورے سلسلے پر ہے کہ آپ ہی فضل کرنے والے، آپ ہی توفیق دینے والے، آپ ہی قوت بخشنے والے، آپ ہی کرا دینے والے، میرا تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب آپ کا فضل ہے۔ تو پھر فرمائیں گے۔ نہیں، تو نے ہی عمل کیا تھا، تو نے ہی حرکت کی تھی، تو ہی چل کر گیا تھا۔ غرض جو اپنے کو خود سراہتا ہے۔ اسے مٹا دیتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو مٹاتا ہے، اسے باقی کر دیتے ہیں، اسے اونچا اٹھا دیتے ہیں۔

دولتِ تفکّر...... عرض کرنے کا مطلب یہ نکلا کہ نہ علم میں نجات ہے۔ نہ عمل محض میں نجات ہے، نہ اخلاص میں نجات ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ فکر شامل نہ ہو۔ کہ نہ غرور ہو، نہ اپنے اوپر اعتماد اور بھروسہ ہو، نہ اپنی عبادت اور عمل پر کوئی غرّہ ہو۔ بلکہ ہر حالت میں اللہ پر بھروسہ ہو کہ میں نے کچھ نہیں کیا، یہ انہیں کا دیا ہوا ہے، اگر وہ چھین لیں تو میں کیا کروں گا۔ یہ فکر جس کو دامن گیر ہوگی اس کا اخلاص بھی کارآمد ہوگا۔ اس کا عمل بھی کارآمد ہوگا۔ اور اس کا علم بھی کارآمد ہوگا۔

روحانیّت کے اربعہ عناصر...... اب انسانی سیرت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے۔ ایک علمِ صحیح وعلم نافع، ایک عملِ صحیح وعمل صالح، ایک اخلاص کامل اور ایک فکرِ سلیم۔ یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم کی بجائے جہالت ہو تو کہیں گے یہ حیوان ہے۔ علم ہو مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے۔ گردن زدنی ہے۔ عمل ہے مگر منافق ہے، مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے۔ مخلص بھی ہے مگر بے فکرا ہے تو کہیں گے نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو، عمل بھی ہو، اخلاص بھی ہو اور آخرت کی فکرِ صحیح بھی ہو، کہا جائے گا، یہ قابلِ اعتماد انسان ہے۔ یہ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جا سکے اور کہا جا سکے کہ "یہ انسان ہے"۔ یہ انسانیت کے چار اجزاء نکلے۔ جیسے اس کے بدن کے چار اجزاء تھے، آگ، پانی، ہوا، مٹی، ان چار سے مل کر بدن بنتا تھا۔ اسی طرح سے انسانیت کے چار جوہر ہیں۔ علم نافع، عمل صالح، اخلاصِ کامل، اور فکرِ صحیح۔ یہ چار چیزیں اگر ہیں تو کہا جائے گا، انسان ہے، ورنہ کہا جائے گا کہ حیوان ہے، یا انسان نما حیوان ہے۔

کمالِ علمِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... بس جب یہ چار چیزیں معلوم ہوگئیں اور یہ انسانیت کا معیار ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے جانچا جائے تو سب سے زیادہ کامل اس معیار سے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نکلتے ہیں کہ جن کا علم فقط علم نافع نہیں بلکہ علمِ قطعی ہے۔ جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کتابوں سے حاصل کیا ہوا علم نہیں بلکہ ان کے علم سے کتابیں بنتی ہیں، وہ براہ راست اللہ کے سرچشمے سے علم لیتے ہیں۔ وحی کا علم ان کے اوپر آتا ہے جو لازوال

دولت ہے۔ جو قطعی دولت ہے۔ جس میں نہ شک کی آمیزش ہے، نہ جہل وتردّد کی آمیزش ہے۔ نہ شبہات وخیالات کی آمیزش ہے۔ خالص علم جو چشمۂ وحی سے ہے۔ وہ علم کامل اور علمِ قطعی ان کے قلوبِ مبارکہ پر ڈالا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ ① یہ قرآن کریم؟ یہ اللہ کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ تمہاری بنائی ہوئی چیز نہیں ہے۔ انسانوں نے بیٹھ کر نہیں بنائی، یہ کسی پارلیمنٹ کا ریزولیشن نہیں ہے۔ یہ کسی کمیٹی کی تجویز اور مشروعات میں سے نہیں ہے۔

﴿لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے''۔ اور نازل کرنے والا اللہ۔ اور کس کے ذریعے سے؟ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ ③ روح الامین (علیہ السلام) اس کو لے کر آئے جس میں خیانت کا کوئی ادنیٰ جذبہ نہیں۔ بلکہ کامل امانت دار فرشتہ جس کی شان ہی امین ہے۔ وہ اس کو لے کر آیا ہے ''عَلٰى قَلْبِكَ'' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر لاکر اتارا۔ جس قلب کے اندر غیر اللہ کے لئے گنجائش ہی نہیں تھی، فقط ایک اللہ کے لئے وہ قلب مستعد تھا، تو اس قلبِ صافی کے اوپر جبریل امین لے کر آئے، اور نازل کرنے والا اللہ ہے۔ اور کیا لے کر آئے؟ کلامِ خداوندی اور صفتِ خداوندی لے کر آئے، اللہ کی ایک صفت لے کر آئے جو اس ''عبدِ پاک'' کے قلب پر ڈال دی گئی۔ وہ صفتِ خداوندی سے متصف ہو گیا۔ اور وہ کمالِ خداوندی سے مکمل بن گیا اور وصفِ الٰہی سے موصوف بنا، اس پاک قلب کے اوپر یہ پاک چیز نازل کی گئی کہ اس علم کے اندر نہ شبہ کی گنجائش، نہ شک کی گنجائش۔ نہ وہم کی آمیزش، نہ خیالات کی آمیزش، تو علم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قطعی اور اس کی کثرت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ''اُوْتِيْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ'' ④ اگلے اور پچھلے سارے علوم ایک قلبِ مبارک میں جمع کر دیئے گئے۔ تو کمیت دیکھیں تو اتنی بڑی کہ عالم کے تمام علوم کا سرچشمہ قلبِ مبارک کو بنایا گیا۔ کیفیت کو دیکھا جائے تو اتنی قطعی کہ شبہ کی آمیزش کی گنجائش نہیں۔ تو جس کا علم اتنا کامل ہو کہ نہ کیفاً اس میں نقص کی گنجائش نہ کماً اس میں نقص کی گنجائش، نہ عدد کے لحاظ سے کمی، نہ کیفیت کے لحاظ سے کمی تو اس سے بڑھ کر عالم کون ہوگا۔

اس واسطے اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ مخلوقات کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عالم کوئی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الخلائق اور اعلم البشر ہیں۔ سارے انسانوں میں، سارے ملائکہ میں سب

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۲ تا ۱۹۴۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء الآیۃ ۱۹۲۔

③ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۳۔ ④ حدیث کی متداول کتب میں یہ حدیث نہیں ملی البتہ علامہ تقی الدین نے اپنی کتاب ''امتاع الاسماع'' میں یہ ذکر کیا ہے: واعطی صلی اللہ علیہ وسلم علم الاولین والآخرین. ولهذا اشار صلی الله علیه وسلم بقوله: علمت علم الاولين، فصل فى ذكر الفضائل الى خص الله تعالى بها نية ج: ۳ ص: ۱۷۷، ۱۷۸۔

سے زیادہ علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، آپ کے علم کے مقابلہ میں ساری کائنات کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اللہ کے علم کے مقابلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ، اس لئے کہ جو فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔ وہی فرق خالق اور مخلوق کی صفت میں ہوسکتا ہے۔ وہی فرق خالق و مخلوق کے علم میں ہوسکتا ہے۔ لیکن مخلوق، مخلوق کو جب نسبت دی جائے تو نہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں، نہ ملائکہ میں، نہ اولیاء میں، کسی کے اندر کوئی اتنا بڑا عالم نہیں۔ سب کے علوم کو جمع کیا جائے تو ایک ذاتِ واحد امین بنی ہوئی ہے۔ تو جو اتنا بڑا عالم ہو۔ تو ظاہر بات ہے کہ "اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ"

سارے انسان تباہ و برباد ہیں اور علماء بچیں گے۔ تو علماء کے اندر اتنا بڑا عالم ہو کہ کائنات میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہ ہو۔ تو اس سے زیادہ درجہ نجات کا اور کسے مل سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر کمالات اور فوز و فلاح کا درجہ اور کس کے لئے ہوسکتا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر کس کی سیرت اور مقدس ہوسکتی ہے، تو سیرت کا ابتدائی جز جو علم کامل تھا، وہ اتنا ہے کہ عالم میں اس کی نظیر کوئی نہیں۔ سیرت بھی ایسی ہوگی کہ عالم میں اس سیرت کی نظیر کوئی نہیں۔ سارے حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو دیکھو تو سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی، سارے حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات اولیاء رحمہم اللہ علیہ کے اخلاق دیکھو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کے سامنے کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی۔

کمالِ عملِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... سارے کاملین کے اعمالِ صالحہ کو دیکھو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ صالح کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں معلوم ہوگی۔ امت کا عقیدہ یہ ہے اور صحیح عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سجدہ ساری امت کی لاکھوں برس کی عبادات سے زیادہ ہے۔

وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی صورت کو نہیں دیکھتے عمل کی حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ جس عمل کے اندر اخلاص کامل اور معرفت کامل ہو، وہی عمل وزن دار ہوتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اخلاص والا کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عارف باللہ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسنِ نیت رکھنے والا کون ہے؟ کہ جن کی جوتیوں کی نسبت سے لاکھوں مخلص بن گئے، کروڑوں اخلاص والے بن گئے، جن کی جوتیوں کے طفیل سے حسنِ نیت کے پہچاننے والے پیدا ہوئے کہ نیت کہتے کسے ہیں؟ حسنِ نیت کے معنی کیا ہیں؟ تو جس ذاتِ بابرکات میں اخلاص وہ ہو جس کی نظیر نہ ہو، اس کے عمل میں جتنا وزن ہوگا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ اس کے ایک سجدے میں اتنا وزن ہوگا کہ عالم کے سارے سجدوں میں اتنا وزن نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے ایک سجدہ عالم کے سجدوں سے بڑھ کر ہوگا، تو سب سے بڑا علم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات میں ہے۔ تو یہ سیرت کا ایک عنصر ہوا۔

معیارِ اعمال...... دوسرا عنصر؟ وہ عملِ صالح ہے ظاہر بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ صالح سے بڑھ کر

کس کا عمل صالح ہوسکتا ہے۔ جو عمل کا معیار ہے، اور اسوہ اور کسوٹی ہے۔ عامل کے عمل کو پہچاننے کی کسوٹی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ اس کے مطابق ہے تو عمل مقبول ورنہ مردود۔ غرض جس کا عمل معیار اور کسوٹی ہو، جس سے عمل کو پرکھ پرکھ کر عمل کو ناقص اور کامل کہہ سکیں، تو جس عمل کی حقیقت یہ ہے تو حقیقی معنی میں عمل وہی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی عمل، عمل نہیں، اس لئے کہ وہ عمل دوسرے اعمال کو بنانے والا ہے۔ وہ عمل نہ ہوتو دوسروں کے عمل ہی نہ بنیں۔ تو جو عملوں کا سرچشمہ اور تخم ہو کہ جس سے اعمال سرزد ہور ہے ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ اس عمل کی عظمت اور قدر و قیمت کتنی ہوگی۔ تو علم تو یہ کہ اولین و آخرین کے جامع ہوں اور عمل یہ کہ سب کے اعمال کا سرچشمہ ہوں۔ اگر اس عمل پر منطبق ہیں تو وہ عمل ہیں۔ ورنہ نہیں۔ اس لئے سیرت کا دوسرا جو ہر وہ عمل پاک ہے۔ اس عمل کے بارے میں یہی کہا جائے گا اور یہی عقیدہ رکھا جائے گا اور یہ عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑا سا بھی عمل کریں تو امت کے لاکھوں برس کے عملوں سے بھی وہ عمل اونچا ہے۔

امرِ حقیقت...... اور ''عِیَاذًا بِاللّٰہِ''!۔ یہ محض کوئی شاعریت نہیں ہے۔ یا معاذ اللہ! محض حسنِ عقیدت سے نہیں کہا جارہا ہے۔ بلکہ یہ امر حقیقت ہے۔ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے جانچنے کا ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟ تو تین آدمی آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیتِ نبوت میں موجود نہیں تھے۔ بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے انہوں نے پوچھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟ ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ گھر میں آپ ہر وقت تسبیح و تہلیل اور نماز میں مشغول رہتے ہوں گے۔ تو پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟

تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: جواب میں یہ کہا گیا کہ جیسے گھر ہستیوں کی زندگی ہوتی ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔ موقع اور ضرورت ہوتی ہے تو گھر میں جھاڑو بھی دے لیتے ہیں، برتنوں کو مانجھ بھی لیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا بھی گانٹھ لیتے ہیں، کپڑا پھٹ جاتا ہے تو بیٹھ کر سی بھی لیتے ہیں۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مزاح بھی فرمالیتے ہیں۔ کبھی ازواج مطہرات سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی کہانی سنادو، کوئی قصہ سنادو۔ تو جیسے گھر ہستیوں کی حالت ہوتی ہے۔ ویسی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ہے۔

تو سن کر ''کَاَنَّھُمْ اتَقَالُوْھَا......'' ان تینوں صاحبوں نے اس عمل کو کم سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل کم ہے۔ مگر اپنی طرف سے عذر یہ بیان کیا کہ حضور کی ذاتِ مبارک تو وہ ہے کہ اللہ نے آپ کی اگلی اور پچھلی زلتیں پہلے ہی معاف کردی ہیں۔ اس لئے اگر آپ بالکل ہی عمل نہ کریں تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقامات میں سب سے اونچے ہیں اور جنتوں میں سب سے اونچے ہیں۔ مگر یہ عمل کم ہے۔ یہ وہ سمجھے، گویا عذر یہ بیان کردیا، اگر آپ اتنا بھی عمل نہ کریں تب بھی آپ کے مراتب میں فرق نہیں آسکتا۔ اس کے بعد تینوں نے باہم ایک

دوسرے کے سامنے عہد کیا۔ اور کہا کہ یہ عمل تو کم ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اب ہم اپنی گھریلو زندگی کیسے بنائیں، تو ایک نے کہا کہ "اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا." "میں عہد کرتا ہوں کہ اب عمر بھر کبھی نہیں سوؤں گا۔ اور پوری رات نماز کے اندر مشغول رہوں گا۔ دوسرے نے کہا "اَنَا اَصُوْمُ النَّهَارَ اَبَدًا وَلَا اُفْطِرُ" "میں عہد کرتا ہوں کہ ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، کبھی بھی افطار نہیں کروں گا"۔ تیسرے نے کہا "اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا" "میں عہد کرتا ہوں کہ عورتوں سے دور رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا"۔

تو یہ ان تینوں نے باہمی عہد و پیمان کیا۔ ہمیشہ قیام وصیام اس شخص کی نسبت جو رات کو سوتا بھی ہو اور قیام بھی کرتا ہو، دن کو روزہ بھی رکھتا ہو اور افطار بھی کرتا ہو، بظاہر اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے بعد جو ذمہ داریاں اور بیوی بچوں کے مشاغل بڑھ جاتے ہیں اور عبادت کے لئے موانع پیش آتے ہیں تو اس جذبے سے ترکِ نکاح کرنا کہ ہمیشہ عبادت کرتا رہوں اور بیوی بچے مخل نہ ہوں، اس شخص کی نسبت جو بیوی بچوں کے مشاغل کے ساتھ عبادت کرتا ہو۔ اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ گویا مخلوق کے ساتھ تعلق کا کوئی درجہ نہیں حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ہی تعلق محض ہے۔

تو ترکِ تعلقات اور عدد کے لحاظ سے یہ عبادات گویا اونچے درجے کی معلوم ہوتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور استفسار فرمایا: "اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا اَمَا وَاللهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاكُمْ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ." تم لوگوں نے ایسی ایسی گفتگو کی ہے۔ خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ متقی ہوں، تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، تم میں سب سے زیادہ خوف وخشیت والا ہوں۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ تم لوگوں نے عبادت کے معنی غلط سمجھے، رات بھر نماز پڑھو تو یہ عبادت ہے، دن بھر روزے رکھے جائیں تو یہ عبادت ہے، بیوی اور نکاح چھوڑ دیں تو یہ عبادت ہے۔ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی اللہ کے احکام کے نیچے گزرے، یہ عبادت ہے۔ دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے، گھر میں بیوی سے معاملہ کرنا بھی عبادت ہے۔ تہجد پڑھنا بھی عبادت ہے۔ یہ تمام چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ جو حق تعالیٰ شانہٗ نے زندگی بنائی ہے اس زندگی کو اللہ کے احکام کے نیچے جاری رکھنا یہ فی الحقیقت حقیقی عبادت ہے اس لئے فرمایا کہ: "فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَیْكَ حَقًّا. وَاِنَّ لِعَیْنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا فَصُمْ وَنَمْ وَقُمْ." ①

تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے، تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ تم پر تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تو تم جاگ کر اللہ کی عبادت کرو کہ اللہ کا حق ادا ہو، اور تم رات کو سو بھی جاؤ تا کہ نفس کا حق ادا ہو، تم جہاد بھی کرو، تا کہ اللہ کا حق ادا ہو۔ اور تھوڑی دیر اس سے ہٹ کر اہل وعیال میں رہو تا کہ بیوی بچوں کا بھی حق ادا ہو۔ تو تم سوؤ بھی، جاگو بھی، روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو۔ یہ سارے کام کرو تو کہا جائے گا کہ تم نے عبادت کی۔ تو عبادت کو تم نے فقط نماز

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم ص ۱۵۴، رقم: ۱۲۷۵.

اور روزے میں محدود کر دیا۔ اپنی پوری زندگی کو اللہ کی رضا کے تحت گزارنے کو عبادت کہتے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرت سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ اس زندگی کو گزارنے والا کوئی اور نہیں۔

کمالِ اخلاصِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ نمازیں پڑھنے والا ہوں، اس لئے میرا اجر زیادہ ہے اور میں تم سب سے زیادہ روزے رکھنے والا ہوں۔ بلکہ اگر گنا جائے اور شمار کیا جائے تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تعداد سے امتیوں کی تعداد بڑھ جائے۔ وہ دن بھر رات بھر یہی کرتے رہے۔ تو ''عبادت کا عدد'' نہیں پیش کیا۔ فرمایا ''اِنِّیْ اَخْشَاکُمْ بِاللّٰهِ وَ اَتْقَاكُمْ لِلّٰهِ '' میرے اندر اللہ کا خوف تم سب سے زیادہ ہے، تقوی تم سب سے زیادہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی روح پیش کی کہ اس کامل تقوی اور خوف و خشیت کے ساتھ ایک سجدہ بھی ہوگا تو وہ تم سب کی ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ بڑی عبادت شمار ہوگا، گویا عبادت کی اصل بنیاد وہ اخلاص للہ ہے۔ وہ خشیت للہ ہے۔ وہ تقوی باطن ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ سے ڈرے۔ اس تقویٰ باطن کے ساتھ جو عبادت ہوگی وہ اکمل ترین عبادت ہوگی۔ غرض جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کامل اور جامع ہے کہ اولین و آخرین کے علم کا مجموعہ ہے اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کامل ہے۔ وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تقوی اور اخلاص بھی اتنا کامل ہے کہ ساری امتوں کا اخلاص مل کر بھی وہ اخلاص نہیں ہوسکتا جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاص عطاء کیا ہے۔ اس لئے کہ جو قلبِ مبارک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا وہ قلب کسی اور کو عطاء نہیں کیا گیا، جو جسد مبارک اور روح پرفتوح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی وہ روح اور جسم کسی اور دوسرے کو نہیں دیا گیا، تو اس ظرف میں جو چیزیں بھریں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ظرف میں بھر سکتی تھیں۔ دوسرے ظروف میں نہیں آ سکتی تھیں۔ غرض علم و عمل بھی انتہائی کامل، اخلاص للہ بھی انتہائی کامل۔

کمالِ فکرِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... اور آگے رہ گئی۔ فکر۔ کہ آخرت سے ڈرنا اور مطمئن نہ ہونا۔ اس کا عالم یہ ہے کہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''نماز پڑھ کر جب میں ایک سلام پھیرتا ہوں تو مجھے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دوسرے سلام کا مجھے موقع ملے گا یا نہیں ملے گا''۔ اس درجہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطرہ اور خوف آخرت محسوس فرماتے تھے اور اپنی موت کی یادگاری اور تذکر، یہ اس درجہ پر ہے کہ فرماتے ہیں۔ ایک سلام پھیر کر دوسرے کی توقع نہیں ہوتی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فکرِ آخرت کی حالت ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ''كَانَ دَائِمَ الْفِكْرَةِ حَزِيْنًا '' ① آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات دائم الفکر رہتے، جیسے کوئی فکر مند بیٹھا ہو، کوئی غمگین بیٹھا ہو اور حزن و غم میں ہو، وہ فکر آخرت تھی، ہمہ وقت آخرت پیش نظر تھی، تو یہ انبیاء علیہم السلام ہی کو کمال دیا گیا ہے کہ ساری دنیا والوں کے حقوق ادا کریں اور فکرِ آخرت بدستور قائم

① الشمائل للترمذی، ج: ۱، ص: ۲۵۵۔

رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے ہیں، بیوی بچوں سے بھی معاملہ ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی معاملہ ہے، حکومت کے فیصلے بھی آپ انجام دے رہے ہیں، فصل خصومات اور جہاد بھی ہو رہے ہیں، غنائم بھی تقسیم ہو رہی ہیں۔ مگر ''فکرِ آخرت'' ہمہ وقت بدستور ہے، بلکہ سارے اعمال کا وہی منشاء ہے، اسی سے یہ سارے اعمال انجام پا رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ متفکر کون ہے؟

روحِ ایمان...... اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان درحقیقت ''خوف اور رجاء'' کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی نہ محض ڈرنے کا نام ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے۔ بلکہ یہ دونوں کیفیتیں جمع رہیں۔ امید بھی بندھی ہوئی ہو اور خطرہ بھی لگا ہوا ہو، تو فکر پیدا ہو جائے گی۔ یہی فی الحقیقت ایمان کی روح ہے۔

قرآن کریم میں دو لفظ فرمائے گئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ﴿لَاتَـايْـئَسُـوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَايَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ① ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے والے کفار ہیں''۔ اس میں امید بتلائی گئی اگر کہ تم میں اللہ سے امید نہیں ہوگی۔ تو تم میں ایمان موجود نہیں۔ یہ کفار کا کام ہے کہ اللہ سے ناامید ہو جائیں، غرض اس میں رجا بتلائی گئی۔ اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا ﴿فَلَايَـاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ② اللہ کی خفیہ تدبیر سے مطمئن بیٹھنے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہیں گے''۔

تو مطلب یہ کہ مطمئن ہو کر مت بیٹھو، خوف اور فکر لگا رہے، تو اس میں گویا خوف بتلایا گیا۔ غرض پہلی آیت سے امید بتلائی گئی۔ دوسری آیت سے خوف بتلایا گیا اور خوف اور امید کے بیچ میں ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے اور نہ محض ڈرتے رہنے کا نام ایمان ہے۔

فکرِ عظیم...... عمل جب بھی کرے گا وہی کرے گا، جسے امید بھی لگی ہوئی ہو۔ خطرہ بھی لگا ہوا ہو۔ جو محض امید میں غرق ہے وہ خادم کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ محض خوف زدہ خادم ہو وہ کبھی عمل نہیں کر سکتا، جس کو ہر وقت آقا سے امید ہے کہ چاہے برا کروں چاہے بھلا کروں، چاہے ہزار دم گناہ کر لوں مگر بخشش ہی ہو جائے گی۔ آخر میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ سوچے گا کہ پھر عمل کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آقا اتنا کریم ہے کہ بخش ہی دے گا، پھر میں خواہ مخواہ کیوں محنت اٹھاؤں، بخشا تو جاؤں گا۔ تو وہ عمل سے معطل ہو جائے گا، جس نے فقط امید باندھی۔

اور جسے ہر وقت خوف ہی خوف لگا ہوا ہو کہ کچھ ہی محنت کر لوں مگر جوتیاں ہی پڑیں گی، کچھ ہی محنت کر لو مگر پٹائی ہوگی، وہ کہے گا پھر عمل کی کیا مصیبت؟ جب اوّل بھی جہنم اور آخر بھی جہنم تو کیوں خواہ مخواہ محنت اٹھائی۔ وہ بھی عمل سے معطل ہو جائے گا، تو خوف محض میں رہنے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ اور امیدِ محض میں غرق ہونے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ عمل کون کرے گا؟

ایک طرف امید لگی ہوئی ہے کہ نیک کام کئے تو اجر ملے گا، اور ثواب ملے گا۔ ایک طرف خوف لگا ہوا ہے کہ

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷. ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۹۹.

اگر ذرا معصیت کی تو جہنم بھی تیار ہے۔ تو ''امید وبیم'' کے مجموعے سے انسان کے عمل کی گاڑی چلتی ہے۔ یہ دو بازو ہیں۔ ان دو بازوؤں سے عمل اڑتا ہے۔ تو ایمان خوف اور رجا کے مجموعے کا نام ہے کہ اللہ سے امید بھی بندھی ہوئی ہو اور ڈر بھی لگا ہوا ہو۔ اس لئے محض ڈر بھی ایمان نہیں اور محض امید باندھنا بھی ایمان نہیں۔ ان دونوں کے بیچ میں رہنا یہی ''تفکر'' کہلاتا ہے۔ یہی فکرِ عظیم کہلاتا ہے کہ ممکن ہے کہ میرا عمل صحیح نہ ہو، گرفت ہو جائے اور ممکن ہے کہ یہ گناہ بخشا جائے۔ میں توبہ کیوں نہ کرلوں، مالک میرا رحیم و کریم ہے، تو اللہ کی رحمت پر بھی نظر ہو اور اس کے جبر و قہر پر بھی نظر ہو۔ اس پر بھی نظر ہو کہ ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ ① اور اس پر بھی نظر ہو کہ ﴿وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾ ②

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے بندوں کو اطلاع کردو کہ میں بہت بڑا غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب بھی بہت بڑا سخت عذاب ہے۔ ایسا عذاب کوئی دوسرا نہیں دے سکتا جیسا میں دے سکتا ہوں۔ تو دونوں شانیں بتلائی گئیں کہ رحمت کا طالب بنایا اور عذاب سے ڈرنے والا بنایا۔ تو دونوں باتیں ایک حالت میں انسان میں مطلوب ہیں۔ اسی کا نام ایمان رکھا گیا ہے تو فکر کامل ہوگی تو ایمان کامل ہوگا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر کو دیکھا جائے۔ تو فرمایا گیا کہ: ''کَانَ دَآئِمَ الْفِكْرَةِ حَزِيْنًا'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوامی طور پر، ہمیشہ چوبیس گھنٹے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فکر میں غرق اور مستغرق ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سید المتفکرین ہیں، سید المفکرین ہیں۔ عالم میں اتنی فکر کسی کو نہیں دی گئی جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ اتنا بڑا اخلاص کسی میں نہیں تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، اتنا بڑا عمل صالح کسی میں نہیں تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ اتنا بڑا علم نافع اور کامل کسی میں نہیں تھا جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

جب انسانیت کی سیرت ان چار جزوں سے بنتی ہے تو جس انسان میں یہ چار جز علی وجہِ الاتم موجود ہوں گے، اس کی سیرت بھی ''اکمل السیر'' ہوگی، اس کی سیرت سب سے اونچے درجے کی سیرت ہوگی کہ کوئی سیرت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، کوئی سیرت اس کے پاس نہیں پھٹک سکے گی۔

دستورِ زندگی...... اس سیرت کے جو لوگ مخاطب بنائے گئے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں، وہ دنیا کے سارے انسان ہیں جن کے سامنے یہ سیرت پیش کی گئی ہے اور اس لئے پیش کی گئی کہ اس سیرت کو کسوٹی بنا کر ہم اپنی سیرتوں کو اس کے اوپر پرکھیں کہ اس سیرتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کس حد تک ہماری عادات اور خصائل مطابقت کھاتی ہیں۔ اور کس حد تک ہم اس سے ہٹے ہوئے ہیں اور منحرف ہیں۔

غرض سیرت کا بیان اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ کوئی کہانی ہے کہ اسے سنا دیا جائے، یہ کوئی قصہ ہے کہ اسے پڑھ کر پیش کر دیا جائے، یہ تو ایک معیار اور دستورِ زندگی ہے۔ اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ گھر جا کر ہر شخص اپنی زندگی کو اس

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۴۹، ۵۰۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۵۱۔

سیرت کے اوپر پیش کرے۔ آیا میرے اندر علم نافع ہے یا نہیں؟ جس سے میں حق و باطل میں امتیاز کر سکوں، آیا میرے اندر عمل صالح ہے یا نہیں؟ جو میرے لئے نجات کا ذریعہ بنے۔ آیا میرے اندر اخلاص ہے؟ نفاق تو نہیں ہے کہ میرا عمل قابل قبول ہو سکے اور آیا میرے اندر فکر موجود ہے؟ یا میں بے فکری سے زندگی گزار رہا ہوں، میری کیفیت کیا ہے؟ انہی کیفیات کو جانچنے کے لئے سیرتِ مقدسہ صلی اللہ علیہ وسلم کسوٹی ہے جو آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

کتاب وسنّت کی چٹان

قرآن کریم آپ کے سامنے اصول پیش کرتا ہے۔ یہ تو علم ہے اور ذات محمدی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) کردار پیش کرتی ہے کہ یہ کسوٹی اور معیاری کردار ہے۔ اس پر اپنے عمل کو پرکھو تو عقائد کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھو کہ وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں؟ اور عمل کو ذات محمدی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) کے اسوۂ حسنہ کے اوپر پرکھو کہ کس حد تک عمل مطابقت کھاتا ہے؟ کس حد تک نہیں؟

اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِيْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا '' ① میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر تم ان سے تمسک کرتے رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے، کبھی راستے سے نہیں بھٹک سکو گے''۔ وہ دو چیزیں کیا ہیں؟ ''كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ'' ''اللہ کی کتاب اور میری سنت اور طریقۂ کار''۔ ان دو چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ثَقَلَيْنِ'' وزنی چیزیں فرمایا۔ یعنی بھاری چیزیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ؟ جب فتنوں کے طوفان آتے ہیں اور فتنوں کا، فسق کا، کفر کا، فجور کا، اور منکرات کا دریا چڑھتا ہے، اس وقت اگر آپ نے کسی تنکے سے تمسک کیا تو طوفانوں میں تنکا بہہ جائے گا اور آپ بھی بہہ جائیں گے۔ اگر جان بچانے کے لئے کسی شہتیر کو پکڑا تو طوفان میں شہتیر نہیں ٹھہرا کرتے۔ وہ بھی بہہ جائیں گے، آپ بھی بہہ جائیں گے، اسی طرح اگر آپ نے کسی درخت سے تمسک کیا تو درخت کو طوفان جڑ سے اکھاڑ کر لے جائے گا، وہ بھی بہے گا، آپ بھی بہہ جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کسی ایسی چٹان کو پکڑ لیں جو عظیم الشان پہاڑ کی مانند ہو کہ لاکھ طوفان آئیں مگر اس کو ہلا نہ سکیں، تو نہ چٹان ہل سکے گی نہ آپ بہیں گے، طوفان کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''ثَقَلَيْنِ'' فرمایا۔ یعنی اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ کتنے ہی بڑے فتنوں کے اور گمراہیوں کے جھکڑ چلیں لیکن کتاب وسنّت کی چٹان کو جس نے پکڑ رکھا ہے، وہ کبھی اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں ہے، اس کے علاوہ جس چیز سے بھی تمسک کرو گے، ہر چیز بہنے والی ہے۔ اتنی قوی نہیں ہے، وہ بھی بہے گی اور آپ بھی بہیں گے، تو ایک طرف قرآن کریم کو رکھا اور ایک طرف سنّت کو رکھا، جس کے معنی سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ حسنہ کے ہیں، تو حدیث اسوۂ حسنہ کو پیش کرتی ہے اور قرآنِ کریم علم کو پیش کرتا ہے۔ تو قرآن کریم پر اپنی فکر کو جانچو کہ عقائد صحیح ہیں یا نہیں۔؟ اور عمل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر جانچو، جس حد

① مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النهی عن القول بالقدر ج: ۵ ص: ۳۷۱.

تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق ہے، جس حد تک انحراف کرے، سمجھو کہ غلط ہے، دیوار پر مارنے کے قابل ہے، ان کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

اسوۂ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اور زیادہ سہولت پیدا فرمادی۔ اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تو معیار اور کسوٹی ہے ہی۔ اس پر علم وعقیدہ اور عمل کو پرکھا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی شامل کرلیا کہ وہ بھی معیار اور کسوٹی ہیں۔ اگر آپ اپنے علم وعمل کو ان کے اوپر پرکھو گے تو بھی حق وباطل کا پتہ چل جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ ہر کس وناکس کا پہنچنا تو بجائے خود ہے، اس کی بلندی کو نگاہ اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ہر قسم کے نمونے موجود ہیں۔ ان میں تاجر بھی ہیں، زراعت کرنے والے بھی ہیں، فقہاء بھی ہیں، علماء بھی ہیں، حکماء بھی ہیں، گھر میں بیٹھنے والے بھی ہیں، خلوت پسند بھی ہیں، جلوت پسند بھی ہیں، مجاہد بھی ہیں، مجاہدہ پسند بھی ہیں۔ ہر نمونہ موجود ہے۔ تو فرمایا کہ میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

"بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ" تو واضح فرمادیا کہ میری ذات تو ہے ہی معیار، میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی تمہارے علم وعمل کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی ہیں۔ یعنی بالذات تو میں معیار ہوں، لیکن جسے میں معیار بتلادوں وہ بھی معیار ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا۔

معیارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین...... حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہود ونصاریٰ میں بہتر فرقے ہوئے اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ "كُلُّهَا فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةٌ" سب کے سب ہلاکت میں پڑنے والے ہوں گے حقیقی معنی میں ایک نجات پائے گا۔ یعنی آخرت میں اعمال کی وجہ سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کو سزا مل جائے گی۔ گو وہ انجام کار چھٹکارا پالیں گے، لیکن عقائد کی وجہ سے جن کو ہلاکت نصیب ہوگی وہ بہتر فرقے ہوں گے تہترواں فرقہ وہ ہے کہ عقائد کی وجہ سے اس پر کوئی وبال نہیں ہوگا، کوئی عملی خرابی یا کھوٹ ہوا تو معاف کردیں گے؟ یا سزا دے دیں گے۔ تو فرمایا: "كُلُّهَا فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةٌ" یہ سب کے سب ناری ہوں گے، ایک ناجی ہوگا"۔

اس پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ ناجی فرقہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَآاَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَاَصْحَابِىْ" "آج کے دن جس چیز پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں"۔ ①

یہی فی الحقیقت معیار ہے۔ تو اپنی ذات کو پیش کیا اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو پیش کیا۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اور میرے عقیدے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا عقیدہ ایک ہے۔ میرے

① جامع الترمذي، كتاب الايمان، باب ماجاء في افتراق هذه الامة ج: ۹ ص: ۲۳۵.

عمل کی نوعیت میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کی نوعیت میں فرق نہیں، جو میرا عمل ہے۔ جو میری فکر ہے وہ ان کی فکر ہے، جو میرے مقاصد ہیں وہ ان کے مقاصد ہیں۔ اپنی نوعیت میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو شریک کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تہتر فرقوں میں سے حق و باطل کو پرکھنے کے لئے ایک میں معیار ہوں اور ایک صحابہ رض اللہ عنہم معیار ہیں۔ ان پر تم اپنے آپ کو پیش کرو، جس حد تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق پر ہے۔ جس حد تک منحرف ہو جاؤ، اس کی اصلاح کرو۔ سمجھو کہ یہ تمہارے اندر باطل ہے اور ناحق کی بات ہے۔ تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کسوٹی بتایا۔

طبقۂ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... گویا کسی طبقے کو من حیث الطبقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز صحابہ رضی اللہ عنہم کے، مقدس نہیں بتلایا۔ امت کے اندر۔ افراد آئیں گے جو کامل اور مکمل ہوں گے۔ مگر طبقہ کا طبقہ مقدس ہو۔ اس میں سے کوئی مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا معیار ہے، تو جب یہ معیار قرار پا گیا تو آپ دیکھ لیجئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم معیار بن گئے۔

جس شخص کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت اور محبت دیکھیں سمجھو کہ حق پر ہے۔ اگر محبت نہیں، انہیں سب وشتم کرتا ہے یا انہیں گالم گلوچ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ ناحق ہے وہ حقانی نہیں کہلائے گا۔ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ سب کے سب متقی، پارسا اور پاکباز ہیں، ان کی نیتیں صادق ہیں۔ ان کے قلوب کا رخ سچا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر ہے اور جو طبقہ یہ کہے گا کہ معاذ اللہ ان میں تو منافق بھی تھے۔ ان میں تو غلط کار بھی تھے۔ انہیں گالم گلوچ کرے، سمجھ لیجئے کہ وہ ناحق پر ہے۔ گویا ایک سیدھا سادہ معیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرقوں کے حق و باطل ہونے کے بارے میں بتلا دیا۔ تو جو سبّ وشتم کرے، وہ بھی ناحق، جو قتلِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درپے ہو وہ بھی ناحق، جو یوں کہے کہ ہم معیار ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم معیار نہیں ہیں۔ ہم ان پر نقد و تبصرہ کر سکتے ہیں وہ ہم پر نہیں کر سکتے۔ سمجھو کہ بطلان کی بات ہے۔ کوئی حقانیت کی بات نہیں ہے۔ غرض ایک سیدھا سا معیار فرقوں کے حق و باطل اور خطا و صواب کے پہچاننے کا بتلا دیا کہ مجھے دیکھ لو۔ اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دیکھ لو۔

اعلانِ رضا...... بہرحال قرآن کریم نے جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ فرمایا کہ: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① وہ مہاجرین وانصار۔ اور بعد میں جو مہاجرین وانصار میں ملتے رہے، وہ سب کے سب۔ کون ہیں؟" ۔﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ "اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی"۔

مشترکہ اعلان رضا کیا۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا جن کے دل میں کوئی ادنیٰ کھوٹ اور ٹال ٹیک ہو، ان سے کبھی رضائے مطلق کا اعلان نہیں ہو سکتا۔ رضا کا اعلان ہے۔ اور قرآن کریم میں اعلان ہے۔ اور قرآن

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، ۱۰۰.

کریم قیامت تک بلکہ آگے تک چلنے والی ایک عظیم کتاب ہے۔ گویا ابدالآباد تک یہ اعلان ہوتا رہے گا۔ تو قیامت تک بھی یہ اعلان غلط نہیں ہوسکتا، اور قیامت کے بعد بھی یہ اعلان غلط نہیں ہوسکتا، تو قرآن کریم دُہراتا رہے گا کہ ﴿ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ ① اللہ ان سب مہاجرین وانصار سے راضی اور ان سے بھی جو ان میں بعد میں ملے، یعنی کل کے کل مرضی خداوندی میں ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ ناراض یا ناخوش ہوں۔ پہلے تو مطلق جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اپنی رضا کا اعلان کیا۔ اور یہ نہیں کہ اولین مہاجرین وانصار کو لے لیا ہو، بلکہ فرمایا ﴿وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ جو احسان کے ساتھ بعد میں ان کے ساتھ ملتے رہے اور ان کی جماعت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سب اس اعلان رضا میں شامل ہیں۔ گویا مطلق حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس ہوئی کہ وہ سب مرضی اور پسندیدہ ہیں۔

پھر طبقاتی طور پر تقدیس کی، چناں چہ ایک جگہ اصحابِ حدیبیہ کے بارے میں فرمایا ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ﴾ ② ”اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے راضی ہے جنہوں نے کیکر کے درخت کے نیچے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! تمہارے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔“ ان کے لئے بھی رضا کا اعلان ہے۔

اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس ...... پھر ایک آیت میں ان کے عمل کو سراہا۔ ارشاد فرمایا ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا﴾ ③ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں، ان کی شان یہ ہے کہ ان میں کفر کے اوپر شدت ہے اور باہمی طور پر ان میں رحمت ہے۔ اور ان کا طریقہ کیا ہے؟ تم انہیں دیکھو گے، کہیں رکوع میں ہیں، کہیں سجدوں کے اندر ہیں۔ اللہ کے فضل کو جابجا تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ خدا کا فضل ان کے پیش نظر ہے۔ ابتغاء وجہِ اللہ اور ابتغاء مرضات اللہ، یہ ان کا شیوہ ہے۔

کمالِ معرفتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ...... اور اس درجہ ان میں ایمان بھر گیا اور اس درجہ ان کے قلبی مقامات پاک ہیں کہ بالکل اس طرح ہے کہ جب کسی چیز سے ظرف بھر جاتا ہے تو آخیر میں چھلک پڑتا ہے تو فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس درجہ ایمان سے بھرپور ہیں کہ چھلک کر ان کے ایمان کی ان کی پیشانیوں پر علامت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کو ارشاد فرمایا۔ ﴿سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ④ سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں“۔ گویا اندرونی ایمان کی اوپر تک علامت آ گئی ہے اور اندرونی کمالِ معرفت کی علامت اوپر چھلک پڑی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمادیا کہ ﴿ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ﴾ ⑤ یہ قرآن ہی ان کے اوصاف کو نہیں سراہ رہا، یہی مثال ان کی تورات میں بھی ہے۔ یہی انجیل میں بھی ہے“۔

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، ۱۰۰۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔ ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔ ⑤ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔

تو اوّلین بھی ان کی مدح کرتے آئے ہیں۔ اور آخرین بھی ان کی مدح کرتے چلے جائیں گے۔ تو اللہ کے ہاں جو ممدوح، اللہ کے نیک بندوں کے ہاں ممدوح ہے، اوّلین و آخرین شہادت دے رہے ہیں۔ اور قیامت تک دیتے رہیں گے۔ وہ طبقہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ تو اس طبقہ کے اندر کوئی کھوٹ تسلیم نہیں کیا جاسکتا، ورنہ یہ ساری آیتیں بے محل ہو جائیں گی، اللہ کی ساری رضا معاذ اللہ بے محل واقع ہوگی۔

قلوبِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب، تھے تو ایسے ہی۔ مگر ممکن ہے بعد میں کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی ہوں۔ ممکن ہے بعد میں کوئی کھوٹ آ گیا ہو؟ تو اوّل تو یہ غلط ہے۔ اور اس لئے غلط ہے کہ یہ قرآن کریم کی شہادت ہے اور قرآن کریم ابدالآباد تک اعلان کر رہا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا رہے گا لہذا یہ احتمالِ محض ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک موقع پر ان حضرات کے قلوب پر بھی یہی حکم لگایا ہے۔ محض اعمال ہی پر نہیں۔ فرمایا ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ ① یہ وہ طبقہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں کا امتحان کر چکا ہے۔ یہ امتحان میں پاس ہو چکے ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ اور خرابی نہیں ہے۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے۔ اور اجرِ عظیم بھی ہے۔ تو دو چیزیں ہیں۔ مغفرت اور اجرِ عظیم۔ مغفرت آخرت میں ہوگی اور اجرِ عظیم دنیا میں دیا جائے گا۔ تو ان کی دنیا و آخرت دونوں درست ہیں۔

فرقۂ ناجیہ...... غرض جس طبقے کی نسبت ان کے قلوب پر بھی حکم لگایا، ان کے قوالب پر بھی حکم لگایا، ان کے اعمال کو بھی سراہا، ان کے طبقے کی بھی تقدیس بیان کی گئی، وہ طبقہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ پھر اس کے بارے میں کوئی ادنیٰ کھوٹ کا یقین کیا جائے یا کوئی تخیل ہی باندھے۔ جب یہ معیار ہوا وہ سارے فرقے نکل جائیں گے، جو قلوب میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت نہیں رکھتے جن کے قلوب میں عظمت ہوگی، وہی ناجی قرار پائے گا۔ اور وہ طبقہ کون ہے۔؟ جو یوں کہتا ہے کہ "اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ" ② سارے صحابہ رضی اللہ عنہم عدول، متقی، پارسا اور پاکباز ہیں۔

خطاءِ اجتہادی...... گو، ان سے خطاءِ اجتہادی ممکن ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اجتہادی طور پر ان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے۔ مگر مجتہد کو تو خطاء پر بھی اجر ملتا ہے، اس کی خطا بھی مقبول ہوتی ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر اجتہادی خطا ہو، وہ ہماری طاعتوں سے بہتر ہے کہ اس پر اجر دیا جا رہا ہے۔ وہ خطا اجتہادی ہے، بہر حال نیت کی ان میں کوئی خرابی نہیں ہوسکتی۔

اور اگر دنیا میں ان کی کوئی تھوڑی بہت خرابی ہو، کوئی معصیت یا برائی سرزد ہوئی ہو تو دل ان کا کسی برائی یا نیت کے کھوٹ سے قطعاً پاک ہے اور اگر کوئی غلطی عمل میں ہوئی اور وہ بھی دنیوی عمل میں تو اس کے بعد ان کی توبہ و استغفار اتنی ہے کہ یہ ہماری عمر بھر کی طاعتوں پر وہ اجر نہیں جو ان کی توبہ و استغفار پر ان کو اجر ملا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ترقیءِ مدارج کے لئے ان سے کوئی ایسی چیز کروا دی ہو۔ غرض ایسی چیز اگر ہے تو وہ دنیا سے متعلق ہے۔

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳۔ ② عمدۃ القاری، کتاب الوضو، باب الماء الذی یغسل بہ الشعر، ج:۳، ص:۳۹۹۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدس...... لیکن جہاں تک دین کا معاملہ ہے۔ علم اور تبلیغ اور احکام وعقائد کا معاملہ ہے، اس میں سب کے سب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین مل کر متقی، عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے قلوب کا اللہ امتحان لے چکا ہے۔ تو جس ذاتِ بابرکات کے شاگرد ایسے ہوں ان کا استاد کیسا ہوگا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر پھل میٹھا ہے تو درخت قابلِ مدح ہے۔ اگر پھل کڑوا ہے قابلِ مذمت ہے۔ تو جس درخت کے یہ پھل ہیں اس درخت کا کیا حال ہوگا۔؟ جس کی شاخوں میں یہ لطف ہے ان کی اصل میں کیا لطف وکرم موجود ہوگا، تو جس ذاتِ بابرکات کی تربیت سے صحابہ، صحابہ رضی اللہ عنہم بنے، اس ذات کی برگزیدگی اور اس کی سیرت کے تقدس کا کیا عالم ہوگا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کو دیکھ کر سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہچانی جاسکتی ہے۔ جس ذاتِ بابرکات نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے تیار کر دیئے۔ یہ مربی کی کامل تربیت کی علامت ہے کہ اپنے شاگردوں کو اپنے جیسا بنا دیا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نمونہ بنا دیا۔ اور ایک دو نہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب افراد کا نمونہ جو مقدسین کی ایک عظیم جماعت ہے۔ جو بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام بنی اور اس جماعت نے عالم کو علم اور دین سے بھر دیا۔ غرض جس اصل کی شاخیں ایسی، اس کی اصل کیسی؟ اور جس ذات کے پھل ایسے وہ درخت کیسا؟ اور جس استاد کے شاگرد ایسے وہ استاد کیسا؟ اور جس شیخ کے تربیت یافتہ ایسے مقدس، اس شیخ کے تقدس کا کیا عالم ہوگا؟

اکمل السیر...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو اگر انسانی اصول پر پرکھا جائے تو انسان کی سیرت کے عناصرِ اربعہ میں نے ذکر کر دیئے۔ ان میں سب سے زیادہ کامل اور اکمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نکلتی ہے۔ یہ تو اصل کے اعتبار سے ہے اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دیکھ لو، جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کا تقدس ایسا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تقدس کا کیا عالم ہوگا؟ تو اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی سیرت اکمل السیر ہے۔ اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تب بھی وہ سیرت اکمل السیر ہے۔ جب وہ سیرت ہمارے سامنے آتی ہے، اس کا مقصد کہانی سنانا نہیں ہوتا بلکہ معیار پیش کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو پرکھ پرکھ کر اس کے اوپر جانچیں، مسلمانوں میں علم کی کمی نہیں فکر کی کمی ہے۔ علم تو ہے۔ رات دن وعظ سنتے ہیں، کتابیں بھی پڑھتے ہیں، رسالے بھی ان کے سامنے ہیں لیکن تفکر موجود نہیں ہے کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر غور وفکر کریں اور اپنے کو اس نمونے کے اوپر پیش کریں کہ کس حد تک مطابقت ہے اور کس حد تک مطابقت نہیں۔ یہ فکر جب تک پیدا نہیں ہوگی سیرت کا سننا نہ سننا آپ کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالے گا۔ تو آپ محض کانوں سے سنتے ہیں۔ حالاں کہ دل سے اور دماغ سے سننا چاہئے جس سننے میں دل بھی شامل ہو۔ یعنی اس طور پر آپ سیرت کو سنیں کہ ہم اپنا جائزہ لیں۔ نہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد وثناء کرتے رہیں۔ آپ نہ بھی مدح کریں وہ جب بھی واجب

المدح ہیں۔ آپ ایک بھی ثناء نہ کریں وہ جب بھی معظم ومکرم ہیں۔ اس سیرتِ پاک کی عظمت ورفعت آپ کے عظمت کرنے پر موقوف نہیں ہے۔ آپ عظمت نہ کریں وہ جب بھی باعظمت ورفعت ہیں سوال یہ ہے کہ سیرت کو سن کر آپ نے اپنے لئے کیا کیا۔ تو آپ سیرت کا بڑا مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ سبحان اللہ کہہ کر یہ کہہ دیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے یہ عظمت دی، وہ تو باعظمت ہیں ہی۔ آپ نہ بھی کہیں جب بھی عظمت ملی ہوئی ہے۔

لیکن یہ عظمت آپ کے سامنے کیوں لائی گئی؟ تاکہ آپ بھی باعظمت بنیں، آپ کے اندر بھی خوبیاں اور کمالات پیدا ہوں، اس لئے سیرت سامنے رکھی جاتی ہے۔ یہ جذبہ ہمارے اندر مفقود ہے۔ اس لئے اپنے جانچنے کی فکر نہیں۔ تعریف کرنے کی فکر ہے۔ تو تعریف سے زیادہ اپنا جانچئے کہ خود اپنے کو پیش کریں۔ اور سیرت کے مطابق اپنے کو پرکھیں۔ اس واسطے میں نے سیرتِ مقدسہ کو دو پہلوؤں سے پیش کیا ایک سیرت کی اصل کے لحاظ سے کہ انسانیتِ کاملہ اسی سیرت کے اندر ہے اور ایک سیرت کی فرع کے اعتبار سے کہ اس سیرت سے اخذ کر کے جو سیرتیں بنیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد والوں کی ہیں جو دوسروں کو مقدس بنا سکتی ہیں۔ وہ سیرت اس قابل ہے کہ اسے سامنے رکھ کر مقدس بننے کی فکر کرے، تو دونوں پہلوؤں سے سیرت کامل اور اکمل ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اور آپ کو توفیق دیں کہ ہم اپنے کو پرکھنے کی کوشش کریں اور اپنے کو سیرت کے مطابق بنانے کی فکر کریں۔ آمین۔

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ. اَللّٰهُمَّ وَ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَامَفْتُوْنِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ."

ملّتِ اسلامیہ کا المیّہ اور اس کا علاج

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَـرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَـدُ اَنَّ سَیِّـدَ نَـاوَسَـنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّابَعْدُ............... عَنْ اَنَسِ بْـنِ مَالِکٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَعَاذُ رَدِیْفُہٗ عَـلٰی رَحْـلٍ،قَـالَ یَـامَـعَاذُبْنُ جَبَلٍ! قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ،قَالَ یَامَعَاذُ!قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُـوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ،قَالَ یَامَعَاذُ!قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ .... قَالَ مَامِنْ اَحَدٍیَّشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقًامِّنْ قَلْبِہٖ اِلَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ...... [1]

گزارشِ واقعی...... بزرگانِ محترم! میں اس وقت زیادہ دیر تک نہیں بول سکوں گا۔ کچھ تو اپنے ضعف کی وجہ سے اور پر کچھ یہ کہ تقریباً ایک ہفتے سے روزانہ مسلسل تقریریں کرنی پڑیں، اتنی قوت نہیں ہے کہ روز کی تقریریں نبھائی جاسکیں، بمبئی آنے کا میرا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں آ کر تھکاوٹ دور کروں اور آرام کروں۔ مگر یہاں پہنچ کر بہر حال جلسے کی تیاری ہوگئی، اس لئے اس تعب اور تھکان کی بناء پر زیادہ دیر نہیں بول سکوں گا، صرف جلسہ اور اس کے اعلان کا احترام قائم رکھنے کے لئے چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔

اضطرابِ عام...... اس جلسہ کے لئے جو دعوت نامہ پہنچا تھا اس میں یہ تھا کہ اس وقت مسلمان پریشانیوں میں مبتلا ہیں، اور مختلف قسم کے فتنے اور مختلف قسم کی پریشانیاں ان پر آرہی ہیں، کچھ اخلاقی لائنوں سے، کچھ سیاسی لائنوں سے، کچھ اعتقادی لائنوں سے، کچھ تمدنی اور معاشرتی لائنوں سے۔ غرض مختلف قسم کے فتنے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو مضطرب، بے چین اور پریشان کر رکھا ہے۔ اس میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ ان پریشانیوں کو دور کرنے کا کوئی راستہ تجویز کیا جائے اور کوئی بات کہی جائے جس سے یہ پریشانیاں دور ہوں۔ یہ ہمارے قبضے میں تو نہیں ہے کہ ہم کسی پریشانی کو دور کردیں۔ ہم اپنی ہی پریشانی دور نہیں کرسکتے، ہم دوسروں کا کیا بنا سکتے ہیں البتہ تدبیر بیان کی جاسکتی ہے کہ یہ تدبیر اختیار کی جائے تو فتنے ختم ہوں گے، پریشانی دور ہوگی اور دلجمعی پیدا ہو جائے گی۔

---

[1] الصحیح للبخاری، کتاب العلم ،باب من خص بالعلم قوماً دون قوم کراھیۃ ان لایفھموا ، ج: ۱ ، ص: ۵۹، رقم:۱۲۸ .

تدبیر بھی ہم خود کیا تجویز کر سکتے ہیں، جو خود فتنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو وہ تدبیر کیا کرے گا۔ تدبیر وہ بتلا سکتا ہے جو فتنوں سے بری اور بالا ہو۔ تو اس کی تدبیر حق تعالیٰ ہی سے پوچھنی چاہئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنی چاہئے وہی ہمارے فتنوں کا رد ہوگا اور وہی فتنوں کے دفعیہ کا ذریعہ ہوگا۔ اس کے بارے میں ایک حدیث سنائے دیتا ہوں، اس کا ترجمہ اور اس کی مختصر سی تشریح عرض کئے دیتا ہوں۔

حدیثِ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ...... حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرما رہے ہیں۔ اور انہوں نے روایت سے پہلے واقعہ بیان کیا کہ میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سواری پر سوار تھے۔ عرب میں عامۃً یہ دستور ہے کہ ایک اونٹ پر دو سیٹیں ہوتی ہیں، اسی طرح ایک گھوڑے پر دو سیٹیں، ایک گدھے پر دو سیٹیں۔ تو زین ہی دو سیٹ کا بنایا جاتا ہے، اس کے آگے پیچھے دو آدمی سوار ہو جاتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی سواری پر سوار تھے اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا قریب تھا کہ: "لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ اِلَّا مُؤَخَّرَۃُ الـــرَّاحِـلِ" میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میں کوئی حائل نہیں تھا، صرف زین اور کجاوے کی ایک ڈنڈی بیچ میں تھی۔ گویا اگلا بیٹھنے والا تو لگام سہار کر بیٹھتا ہے اور پچھلا بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو سہار لیتا تھا تا کہ گر نہ پڑے۔ تو وہ زین ایسے ہی بنائے جاتے تھے کہ دو سیٹیں تھیں، بیچ میں ایک ڈنڈی اس طرح سے لگاتے تھے تا کہ پیچھے بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو تھامے رہے۔ اسے موخرۃ الراحل کہتے تھے۔ گویا کجاوے کا ایک درمیانی حصہ۔ بہر حال حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: زین کی اگلی سیٹ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور پچھلی پر میں تھا میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسی ڈنڈی کا فاصلہ تھا۔ اس کے سوا کوئی فصل نہیں تھا۔

تعدُّدِ نداء...... تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ: "یَا مُعَاذُ!" اے معاذ! میں نے عرض کیا "لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ الـلّٰـہِ وَسَـعْدَیْکَ" میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! اس کے بعد کچھ سکوت فرمایا۔ اور پھر آواز دی کہ یَا مُعَاذُ! اے معاذ! میں نے عرض کیا۔ "لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں اور میری سعادت ہی حاضری میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری آواز دی کہ یَا مُعَاذُ! میں نے پھر عرض کیا "لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حدیث ارشاد فرمائی جو مجھے اس وقت سنانی ہے۔

مقامِ اشتباہ...... اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کسی بعید کو جو دور ہو اسے پکارا جاتا ہے اور جو اتنا قریب ہو کہ ملا ہوا بیٹھا ہو، صرف ایک کجاوے کی ڈنڈی بیچ میں ہو، اسے پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما دیتے، پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پھر پکارنا بھی ایک دفعہ نہیں تین دفعہ ہے۔ اور پھر اس کے باوجود کہ ہر پکار پر وہ عرض کرتے ہیں کہ "لَبَّیْکَ یَـا رَسُوْلَ

الـلّـٰـہِ۔" یارسول اللہ میں حاضر ہوں۔ اگر جواب نہ آتا ممکن تھا کہ پہلی آواز کو نہ سنا ہو، اس لئے دوسری آواز دی، دوسری انہوں نے نہ سنی ہو تو تیسری مرتبہ پکارا گیا ہو۔ لیکن ہر پکار کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلی پکار نہیں سنی ہوگی، تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ تین دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پکاریں۔

اشتیاقِ مقصد...... یہ حقیقت میں ایسے مواقع پر ہوتا ہے جب کوئی اہم مضمون بیان کرنا ہو اور کوئی عظیم مقصد پیش کرنا ہو۔ تو تین تین دفعہ متوجہ کرتے ہیں کہ غور سے سنو تا کہ وہ چیز دل کے اندر اتر جائے۔ بلا پکارے ہوئے اور بلا لبیک کہلوائے ہوئے کسی چیز کا کہنا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کان سے بات کہی اور دوسرے کان سے نکل گئی۔ تین دفعہ متوجہ فرمایا کہ: شوق پیدا ہو جائے اور اس مضمون کی رغبت پیدا ہو جائے جو آگے ارشاد فرمانا ہے۔

اور یہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات نائبانِ انبیاء علیہم السلام کا خاصہ رہا ہے کہ پہلے دل میں شوق اور تڑپ پیدا کرتے ہیں، اس کے بعد میں مقصد پیش کرتے ہیں تا کہ دل میں اتر جائے۔ بلا طلب کے اگر از خود کوئی چیز کہہ دی جائے تو عادت یہ ہے کہ دل میں اترا نہیں کرتی، آدمی توجہ نہیں کرتا، جب تک اندر سے طلبِ صادق نہ ہو، تو شوق پیدا کرنے کے لئے ایسے اسباب اختیار کرتے ہیں کہ طلب پیدا ہو جائے اور طلب کے بعد جو چیز دل میں آتی ہے وہ دل میں اترتی جاتی ہے۔ غیرِ طالب کو کچھ نہیں ملتا، اس لئے طلب گار ہونا چاہئے۔

جیسے عارف رومی نے کہا ہے کہ ؎

آب کم جو ، تشنگی آور بدست

پانی کو زیادہ مت پکارو، پیاس اپنے اندر پیدا کرو، پیاس پیدا ہوگی تو پانی ملے گا اور پھر وہ اترے گا اور رگ رگ میں تری پیدا کرے گا پیاس نہ ہو تو پانی پی لو تو بعض دفعہ بیماری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ میں اپھارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو معدے کی خواہش کے بعد اگر کھانا کھایا جائے گا تو معدے میں اترے گا، پچے گا اور بدن کو لگے گا، اور بلا کسی بھوک کے کوئی کھاتا رہے تو بیماریوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے پانی اور دانے کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ بھوک اور پیاس پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معدہ خراب ہوتا ہے اور بھوک کی کمی ہوتی ہے تو طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ تندور پر نہیں جاتے کہ بہت سی روٹیاں لے آئیں، بلکہ طبیب کے پاس جاتے ہیں کہ ان روٹیوں کی گنجائش تو پیدا ہو جائے، علاج کراتے ہیں تا کہ معدے میں طلب تو پیدا ہو جائے۔

انتظارِ رغبت...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ العزیز بانی دارالعلوم دیوبند ان کے مریدوں میں سے حافظ محمد احسن صاحب جو ہمارے عزیزوں میں سے تھے، حضرتؒ سے بیعت تھے۔ نوجوان تھے اور اس زمانے کے نوجوانوں کا جو لباس تھا وہ یہ تھا کہ چوڑی دار پائجامہ جو ٹانگوں پر لپٹا ہوا ہو اور سر کے اوپر دوپٹہ جس کی کناری پر کرن اور گوٹہ بھی ٹکا ہوا ہوتا تھا اور ہاتھوں پر مہندی، اور پور پور چاندی کے چھلے، یہ اس زمانے میں نوجوانوں کا تمدّن تھا۔ یہی لباس ان کا بھی تھا۔ ان کے بارے میں سنا کہ یہ حضرت کی مجلس میں آتے تھے اور

حضرت کچھ نہیں فرماتے تھے۔

لوگوں کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ حضرت کے مرید اور خادم، اور لباس غیر شرعی، مردوں کے لئے کب جائز ہے کہ مہندی لگائیں یا ہاتھوں میں چاندی کے چھلے پہنیں۔ یہ سارے ناجائز کام کر رہے ہیں۔ چوڑی دار پائجامہ جو ٹخنوں سے نیچا، جس کی شرعی ممانعت ہے۔ جس کو شرعاً اسبال کہتے ہیں۔ چناں چہ ایک حدیث میں فرمایا گیا، ٹخنوں سے نیچے پائجامہ یا لنگی ڈالنے والا جس کا نام ''مسبل متان'' ہے حق تعالیٰ اسے قیامت کے دن نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے کہ دنیا میں اسبال کرتا تھا، ٹخنوں سے نیچے ازار یا پائجامہ رکھتا تھا، تو اس پر نگاہِ رحمت نہیں فرمائیں گے، اس سے اعراض کیا جائے گا۔

تو حضرت کی مجلس میں وہ آتے ہیں اس حالت میں کہ اسبال موجود، ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی۔ ناجائز چھلے پہنے ہوئے اور حضرت کچھ نہیں بولتے، نہی عن المنکر نہیں فرماتے، لوگوں کے دلوں میں یہ خطرہ گزرتا تھا، اور ایک دو نے ایک دوسرے سے کہا بھی مگر حضرت پر کوئی اثر نہیں۔ حافظ صاحب آ رہے ہیں اور مجلس میں بیٹھ رہے ہیں۔

حضرت کیوں کچھ نہیں فرماتے؟ دل میں شریعت کے اتباع کا شوق اور طلب پیدا کرنے کے لئے۔ کہ طلب پیدا ہو جائے۔ پھر جب یہ حکم دیا جائے گا تو دل اتر جائے گا۔ اور بلا طلب کے لاکھ تقریریں کرو، وعظ کہو، کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جیسے آج کی دنیا میں سینکڑوں وعظ اور سینکڑوں تقریریں ہوتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں نہ ایسی تقریریں تھیں، نہ مواعظ تھے، نہ جلسے ہوتے تھے۔ اور آج جلسوں کی بھرمار ہے۔

اور جلسوں کا سیزن ہے اور ہزاروں پر انتہا نہیں ہوتی۔ لاکھوں تک اجتماعات میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ لیکن دل ٹس سے مس نہیں کسی کے اندر کوئی تغیر نہیں۔ وہی کی وہی حالت جو پہلے تھی۔ ایک واعظ وعظ کہہ کے وعظ کا ایسا پانی ڈالتا ہے جیسے گنبد پہ ڈال دیا، کہ اِدھر اُدھر بکھر جاتا ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں پہنچتا، بنا اس کی یہ ہے کہ طلبِ صادق نہیں، تفریحاً آ کے وعظوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ گویا بھانڈ کی دیکھتے ہیں کہ مقرر کیا بولتا ہے، کیسی باتیں کرتا ہے۔ یہ طلب ہو کہ اس کی کوئی بات لے کر ہم اپنی دنیا و آخرت کی نجات کی فکر کریں۔ یہ نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ ہوگی، ہزاروں لاکھوں میں کسی ایک کو۔ عام طور سے نہیں ہے۔ اس لئے مواعظ اثر بھی نہیں کرتے۔

وعظ، غلط نہیں ہوتا، مگر دل کھلا ہوا ہو جب اس کے اندر کوئی چیز اترے اور اگر دل الٹا ہو تو اس کی تلی پر جتنا پڑے گا، اِدھر اُدھر بہہ جائے گا۔ بہرحال حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ جب چھ مہینے گزر گئے اور دیکھا کہ اب ان کے اندر عقیدت پوری بیدار ہوگئی ہے اور قلب میں گرویدگی آ گئی ہے۔ اور طلبِ صادق آ گئی۔ تو تنہائی میں لے جا کر کیسے عجیب انداز سے کہا، فرمایا۔ ''بھائی! حافظ جی! تم تو ہمارے دوست ہو اور ہم تمہارے دوست ہیں اور دوستوں کے اندر محبت ہوتی ہے۔ اور محبت میں ہر ایک دوسرے کی حرص کیا کرتا ہے۔ اب ہمارا لباس تو یہ ہے کہ ایک معمولی سا کرتہ اور ایک سیدھے پائنچوں کا پاجامہ، اور ایک دو پلی ٹوپی۔ تمہارا ماشاء اللہ فاخرہ لباس ہے۔ گوٹے لگا ہوا

عمامہ بھی ہے۔ پور پور چھلّے بھی اور نہایت عمدہ اچکن اور چپل بھی۔ بھائی! دوستی ہے تو یا تو ہم بھی آج سے یہ لباس اختیار کر لیں کہ ہم بھی چوڑی دار پائنچوں کا پاجامہ پہن لیں، ہم بھی ہاتھوں کو مہندی سے رنگیں، یا پھر تم اس راستے پر آ جاؤ جس پر میں ہوں۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو دوست ہوں، ایک کا رخ مشرق کو ہو اور ایک مغرب کو ہو"

طرزِ نصیحت...... چوں کہ دل میں عقیدت آ چکی تھی اور طلب صادق پیدا ہو چکی تھی، تو حافظ محمد احسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ رونے لگے اور بلا کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر گئے۔ جا کر وہ چوڑی دار پاجامے تو بیوی کو دیئے کہ رنگ لگا کر اس کو تو پہن لے، اور گوٹے کی کناری کے دوپٹے اس کو دیئے کہ ان کی تو اوڑھنیاں بنا لے۔ اور پندرہ دن گھر سے نہیں نکلے، جب تک مہندی کا وہ رنگ ہتھیلیوں سے زائل نہیں ہو گیا، چھلّے بھی بیوی کو دیئے کہ تو ان کا زیور بنوا لے۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب وہ مہندی کا اثر جاتا رہا تو خالص مولویانہ لباس، وہی مغلیہ قسم کا پاجامہ اور کرتہ، اور دو پلّی ٹوپی اوڑھ کر حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچے۔ بالکل ایسے جیسے ایک طالب علم ہوتا ہے، حضرت نے سینے سے لگایا اور فرمایا بھائی! آج دونوں دوست یکساں ہو گئے۔ اور بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ جو چھ مہینے تک امر بالمعروف نہیں کیا، وہ اس لئے نہیں کیا کہ اس کا انتظار تھا کہ دل میں طلب آ جائے دل میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے تب کہیں تو اثر پڑے گا۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی طریقہ ہے۔ اہل اللہ اور وارثین انبیاء علیہم السلام کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اور وہ لوگ تو اب کہاں ہیں کہ ایک منٹ میں توجہ ڈالی اور کایا پلٹ دی، وہ لوگ گزر گئے، اب تو یہ ہے کہ اخلاق اور بھائی بندی سے کوئی اثر ڈال کر طلب پیدا کر کے کوئی نصیحت کریں تو کارگر ہوتی ہے۔ یوں نصیحت کرنے کو ہر ایک کا فرض ہے کہ نصیحت کرے، وعظ بھی کہے۔ لیکن موثر نہیں ہوتا۔

حکمتِ تربیّت...... حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرّہٗ۔ ان کے ایک پٹھان مرید جلال آباد کے تھے۔ بڑے خوبرو جوان تھے۔ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدن داڑھی منڈانے کا نہیں، داڑھی رکھنے اور چڑھانے کا تھا۔ نماز نہیں پڑھتے تھے، حضرت حاجی صاحب سے شکایت کی گئی کہ حضرت! آپ کے مرید ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ حضرت نے بلایا۔ بڑی شفقت سے کمر کے اوپر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

"بیٹا! نماز پڑھنی چاہئے، نماز ہی تو ایک مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز اور فرق ہے، جب نماز ہی نہ ہو تو وہ مسلمان ہی کیا ہوا؟" انہوں نے کہا حضرت! مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور سوا گھنٹے میں داڑھی چڑھتی ہے۔ پہلے اسے گوند لگاتا ہوں، پھر اسے سکھاتا ہوں، پھر اس میں کنگھا کرتا ہوں، سوا گھنٹہ لگتا ہے۔ آپ کہیں گے وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی، جب وضو کروں گا تو وہ سارا گوند موند دھل جائے گا۔ تو ہر نماز کے بعد مجھے داڑھی چڑھانی ہے۔ تو پانچ نمازیں تو گھنٹے بھر سے کم میں ہو جائیں گی اور پانچ دفعہ داڑھی چڑھانے میں سات گھنٹے صرف ہوں گے۔ یہ مشکل ہے اور آپ کہیں گے کہ بے وضو نماز جائز نہیں۔

اب آگے ''حکمتِ تربیّت'' ہے۔ تعلیم تو یہ ہے کہ حضرت فرماتے کہ ہاں بلا وضو نماز جائز نہیں، حدیث میں ہے لَاتُقْبَلُ صَلٰوۃٌ بِغَیْرِ طُھُوْرٍ ① کوئی نماز بغیر پاکی کے قبول نہیں ہوتی''۔ یہ تو تعلیم کا درجہ تھا۔ مگر تربیت کا درجہ دوسرا ہے۔ تعلیم میں ایک حکم ہوتا ہے، سب کو سنا دیا جاتا ہے، تربیّت میں ہر ایک کا مزاج دیکھنا پڑتا ہے، اس کی نفسیات کے مطابق اس سے کلام کرنا پڑتا ہے۔ تو حضرت نے یہ دیکھا کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے اس کا کیا سنانا، وہ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ آپ کہیں گے کہ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی، تو مسئلہ تو معلوم تھا۔ اب حضرت کیا فرماتے جو معلوم ہے اس کا علم کرا دیتے، مگر حکمتِ تربیّت پیش نظر تھی۔ حضرت نے فرمایا ''بھائی میں نے تو وضو کا ذکر نہیں کیا، میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھا کرو''۔ انہوں نے عرض کیا، حضرت! بے وضو پڑھ لوں؟ فرمایا ''پھر وضو کا ذکر، میں وضو کا نام کب لے رہا ہوں، میں وضو کا تذکرہ کب کر رہا ہوں میں تو نماز پڑھنے کو کہہ رہا ہوں''۔ تو خان صاحب اٹھے، انہوں بے وضو نماز ٹرخانی شروع کر دی، غرض بے وضو نماز پڑھنی شروع کر دی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ بے وضو پڑھ رہے ہیں اور انہیں ٹوکتے نہیں۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ کی نماز نہیں ہوتی اس لئے کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے کہ نماز نہیں ہوتی۔ پندرہ دن گزر گئے۔ پندرہ دن کے بعد ان کے ذہن میں خود یہ جذبہ پیدا ہوا کہ تو محنت بھی کر رہا ہے۔ اور اکارت جا رہی ہے۔ رائیگاں جا رہی ہے۔ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی۔ مگر انہوں نے کہا کہ نماز تو اب میں چھوڑ نہیں سکتا، اس لئے کہ پیر کا حکم ہے۔ اور پٹھان کی زبان ہے جو کٹ سکتی ہے وہ ٹل نہیں سکتی، لہٰذا نماز نہیں چھوڑوں گا۔ نماز مجھے ہر صورت میں پڑھنی ہے۔ تو یہ کیا صبح کی نماز کے لئے وضو کرتے اور داڑھی چڑھاتے اور عشاء تک اس وضو کو باقی رکھتے اور پانچوں نمازیں وضو سے پڑھتے۔ لیکن یہ ایک نوجوان آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے کہ صبح سے لے کر عشاء تک باوضو رہے، تکلیف شروع ہوئی۔ پیٹ میں نفخ اور اپھارہ شروع ہوا۔

اب انہوں نے یہ کیا کہ ایک وضو تو صبح کی نماز کے لئے کرتے اور ایک ظہر کے وقت کرتے، اسے عشاء تک باقی رکھتے۔ غرض نماز باوضو شروع کر دی۔ لیکن ایک نوجوان کے لئے بڑی مشکل سی بات ہے کہ ظہر سے لے کر عشاء تک باوضو رہے۔ اس سے بھی پیٹ میں تکلیف شروع ہوئی۔ اب انہوں نے کہا کہ نماز تو میں چھوڑ نہیں سکتا، پیر سے وعدہ کر چکا ہوں اور زبان پٹھان کی ہے جو کٹ سکتی ہے، اب بدل نہیں سکتی۔ اس واسطے انہوں نے سوچا کہ یا تو داڑھی چڑھانے کو قائم رکھو یا نماز قائم رکھو، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے داڑھی چڑھانی چھوڑ دی اور نماز باوضو پڑھنی شروع کر دی۔

بیس پچیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحب نے بلوایا اور بہت شاباش دی اور فرمایا ''نوجوان صالح ایسے ہی ہوتے ہیں''۔ اور بڑی دعائیں دیں۔ اس کے بعد فرمایا بھائی! بے وضو کے نماز کتنے دن تم نے پڑھی؟'' انہوں نے عرض کیا۔ حضرت! پندرہ بیس دن۔ فرمایا۔ اسے لوٹا لینا، یہ ہوئی نہیں۔ انہوں نے عرض کیا ضرور لوٹاؤں گا۔ اس کے

① الصحیح للبخاری، کتاب الوضو، باب لاتقبل صلوۃ بغیر طھور، ص: ۱۴، رقم: ۱۳۵.

بعد فرمایا کہ بھائی! تمہاری عمر کیا ہے؟ خان صاحب نے کہا کہ سولھواں سال شروع ہے۔ پندرہ پورے ہو چکے ہیں۔ فرمایا چودہ برس کے بعد آدمی شرعاً بالغ ہوجاتا ہے اور نماز اس پر فرض ہوجاتی ہے۔ برس دن کی نماز تو پڑھی نہیں ہوگی۔ انہوں نے عرض کیا۔ حضرت! نہیں، میں نے تو نہیں پڑھی۔ فرمایا۔ یہ قضا عمری ہے۔ اسے بھی قضا کرلو۔

اب دل میں لگن تو لگ چکی تھی۔ سرکاری ملازم تھے، انہوں نے ایک ہفتے کی رخصت لی، اور ساری نمازیں برس دن کی انہوں نے قضا کیں، اور ادا نمازوں سے سلسلہ مل گیا۔ گویا بلوغ کے وقت سے جو نمازی بنے تو پھر مرتے دن تک نماز نہیں چھوٹی اور پکّے پابندِ صوم وصلوٰۃ ہوگئے۔ یہ کیسے ہوئے؟

حضرت نے پندرہ دن کی بے وضو نمازیں پڑھوا کے عمر بھی کی نمازیں باوضو پڑھوادیں۔ اور اگر پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی، وہ کبھی نہ پڑھتے، اور عمر بھر بے نماز رہتے۔ یہ حکمتِ تربیّت تھی کہ پندرہ دن بے وضو کے نمازیں پڑھوا کے عمر بھر کے لئے پابندِ نماز بنادیا۔ اگر تربیّت کی یہ صورت اختیار نہ کرتے، وہ کبھی نماز کے عادی نہ ہوتے۔ تربیت کرنے میں بعض اوقات کسی بری اور منکر چیز کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، سکوت کرنا پڑتا ہے کہ طبیعت میں صلاحیت آجائے، پھر بات کہی جائے، پھر نصیحت کی جائے، وہ قابلِ قبول ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

تربیّت کا امتیاز...... اور سنّت سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ ایک قبیلہ جو کئی ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ! ہم اسلام قبول کرنے کے لئے آئے ہیں۔ فرمایا. ”بَارَکَ اللّٰہُ“ انہوں نے کہا، حضرت! اسلام قبول کرنے کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ ایک صبح کی نماز نہیں پڑھیں گے۔ اور ایک عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے، تین نمازیں پڑھواتے رہیں۔ فرمایا۔ شرط منظور ہے۔

حالاں کہ جس طرح سے تین وقت کی فرض تھیں، ویسے ہی بقیہ دو وقت کی بھی فرض تھیں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط منظور فرمائی اور وہ تین وقت کی پڑھ رہے ہیں اور صبح وعشاء کی غائب۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ ناجائز ہے، ممنوع ہے، حرام ہے۔ مہینہ بھر کے بعد میں از خود ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ جیسے تین وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ ویسے ہی صبح وعشاء کی بھی فرض ہیں۔ تو ہم آدھے دین کو قبول کریں اور آدھے دین کو ضائع کریں، یہ ہرگز مناسب نہیں، چناں چہ مہینہ بھر کے بعد انہوں نے وہ دو بھی پڑھنا شروع کردیں۔ اس کے بعد وہ حاضر ہوئے اور نماز کے پابند ہوگئے، تو دو وقت کی نماز نہ پڑھنے کی شرط مان کر عمر بھر کی پانچ وقت کی نمازوں کا پابند بنادیا، یہ تعلیم نہیں تھی بلکہ تربیّت تھی۔

تعلیم میں تو مسئلہ عام ہوتا ہے، تربیّت میں ہر مزاج کے مطابق اس کو دوا دی جاتی ہے۔ آپ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے ہاں تعلیم پانے جائیں۔ ایک ہی مسئلہ بیان ہوگا، جو کتاب میں ہے وہی سب کے لئے ہے۔ لیکن جب طبیب مطب کرے گا، وہاں یہ نہیں کہ ایک نسخے میں سب کو پار کردے، ہر مریض کی نبض الگ ہے اور اس کا مزاج الگ ہے، اس کے مطابق نسخہ تجویز کرنا ہوگا۔ غرض تعلیم میں عموم ہوتا ہے اور تربیت میں خصوص ہوتا ہے۔ اس لئے

''مربیانِ قلوب'' بعض اوقات انتظار کرتے ہیں۔ اس کی نفسیات کو دیکھ کر اس کی برائی پر کوئی روک ٹوک نہیں لگاتے کہ پہلے اس سے تعلق پیدا ہوجائے، دل میں گرویدگی آجائے، پھر اس وقت کہا جائے گا۔

خیر وہ بات طویل ہوگئی، میں مختصر بیان کرنا چاہتا تھا، بہرحال حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو تین دفعہ آواز دی، حالانکہ وہ کمر مبارک سے ملے ہوئے بیٹھے تھے، تاکہ تین دفعہ آواز دے کر ان کے دل میں شوق پیدا کردیں کہ کوئی بڑی اہم بات کہی جانے والی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دل میں ایک طلب، تلاش اور پیاس پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمائیں گے جو مجھے تین دفعہ متوجہ فرمایا۔

اللہ و بندے کا باہمی معاہدہ...... حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یَا مَعَاذُ! هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَی الْعِبَادِ؟...... ''اے معاذ۔! اللہ کا بندوں کے اوپر کیا حق ہے؟ انہوں نے عرض کیا ''اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ......'' اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں۔ فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے۔ ''یَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا یُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا...... '' عبادت صرف ایک اللہ کی کریں جس میں شرک نہ آنے پائے۔ جبھی اللہ کا حق ادا ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَاحَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ؟...... '' یہ بھی جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ کے اوپر کیا حق ہے؟ عرض کیا، اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ فرمایا ''بندوں کا حق یہ ہے کہ جب وہ ایک ہی طرف جھک جائیں اور شرک سے بالکل الگ ہوجائیں۔ پوری زندگی ان کی توحید پر آجائے اور ایک ہی کو کرتا دھرتا سمجھیں، ایک ہی کو نافع اور ضارّ سمجھیں، ایک ہی کو محی و ممیت سمجھیں، ایک ہی کو رزّاق اور فتّاح سمجھیں، ایک ہی کو مشکلات آسان کرنے والا سمجھیں، ایک ہی کو دافع بلیّات سمجھیں، ایک ہی کو حلال مشکلات سمجھیں، جب بندے کے دل میں یہ آ گیا، اس نے اللہ کا حق ادا کردیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ: پھر تمہارا حق میرے اوپر یہ ہے کہ میں تمہیں رزق دوں گا، رزقِ ظاہری بھی اور رزق باطنی اقتدار، عزت، عظمت، عرفی حیثیت، دنیا کی اقوام پر رعب داب، یہ میں تمہیں عطاء کروں گا۔'' ①

غرض بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو عبادت کر جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔ میں تمہیں رزق دوں گا جس کے اندر کمی کا شائبہ نہیں ہوگا۔ یہ گویا بندے اور خدا کا ایک معاہدہ ہوا کہ تم میری یاد میں لگو، میں تمہیں رزق دوں گا۔

قانونِ مکافات...... اللہ تعالیٰ کے ہاں مکافات کا قانون ہے کہ جیسا تم کروگے، ویسا نتیجہ سامنے آئے گا۔ چناں چہ فرمایا گیا ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ ② ''فرماتے ہیں تم میری یاد کروگے میں تمہاری یاد کروں گا''۔ ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ﴾ ③ تم اللہ کے دین کی مدد کروگے، میں تمہاری مدد کروں گا۔ ''مَنْ اَحَبَّ

① الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل، ج:۱۸، ص:۳۵۴.

② پارہ:۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۵۲. ③ پارہ:۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ:۷.

لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآئَهٗ.“ ① فرماتے ہیں، اگر تمہیں یہ شوق ہے کہ مجھ سے آ کر ملو اور موت قبول کر و تو مجھے بھی یہ شوق ہے کہ کب میرا بندہ آئے اور مجھ سے ملے۔ تم میں میری محبت ہے مجھ میں تمہاری محبت ہے۔ غرض ”ادل بدل“ اور مکافات کا قانون ہے اس لئے بندے اور خدا کا گویا معاہدہ یہ ہوا کہ تم تو میری عبادت میں رہو اور مجھے تنہا خالق و مالک اور موثر سمجھو، مجھے اپنا تنہا بادشاہ اور مالک حقیقی سمجھو اور پھر میں تمہیں رزق ظاہری اور باطنی بھی دوں گا، روٹی و مکان بھی، اقتدار و عزت بھی اور حکومت و سلطنت بھی۔ اور تمہیں دنیا کے اوپر غالب کروں گا۔ جس کا ایک جگہ وعدہ فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ ② اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے، عقیدہ بھی پکا اور سچا اور عمل بھی سچا، ہم ضرور انہیں زمین میں خلافت عطا کریں گے، انہیں اقتدار عطا کریں گے، انہیں عزّت عطاء کریں گے، وجاہت دیں گے“۔

یہ گویا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو تنہا میری طرف جھک، کسی کو کرتا دھرتا مت سمجھنا، ڈرے تو مجھ سے ڈر عبادت کر تو میری کر، مانگ تو مجھ سے مانگ، میرا غیر تیری مشکلات کو حل نہیں کر سکتا، غیر اللہ کے ہاں تیرے لئے گنجائش نہیں۔ میرے ہی پاس ساری گنجائش ہے۔ میں ہی دوں گا۔ یہ معاہدہ ہو گیا۔

بندے کا انحرافِ عہد...... معاہدے کا قاعدہ ہے کہ اگر ایک معاہد اپنا عہد توڑ دے تو دوسرے پر ضروری نہیں رہتا کہ اپنا معاہدہ پورا کرے اور اپنا وعدہ پورا کرے۔ دو حکومتوں میں معاہدے ہوئے، ایک نے غدر کیا، دوسری کہے گی اب ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، اب خواہ ہم جنگ کریں یا اس ملک پر ہم قبضہ کریں، جب تک معاہدہ رہتا ہے دونوں فریق ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہیں۔

اسی طرح بندے اور خدا میں معاہدہ ہو گیا، بندے نے عہد کیا کہ میں آپ کا بنوں گا، فرمایا، ہم تیرے بنیں گے، تو ہماری عبادت کر ہم تجھے سب کچھ دیں گے، اب اگر بندہ اس عہد سے پھر جائے کہ بجائے اس ایک کی عبادت کرنے کے اس نے ہزاروں کے سامنے سر جھکانا شروع کر دیا، بجائے اس ایک کی بندگی کے کبھی وہ کسی قبر کے آگے جھک رہا ہے، کبھی کسی پتھر کے آگے جھک رہا ہے۔ کبھی سونے اور چاندی کے آگے جھک رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے عہد توڑ دیا، جب عہد توڑ دیا تو وہ جو وعدہ تھا اس کی پابندی باقی نہیں رہی۔ فرمائیں گے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ تجھے رزق دیں، کیا ضرورت ہے کہ تجھے اقتدار دیں، تُو تو ہم سے منحرف ہو جائے اور ہم تجھے اقتدار دیں تُو تو مالک و خالق روٹی گیہوں اور چنے کو اور انسانوں کو سمجھے اور ہم تجھے عزّت و اقتدار دیں؟

﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾ ③ کیا ہم اپنی رحمت تیری کمر سے چپکا دیں گے کہ تو بھاگتا

① الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب من احب لقاء الله...... ص: ٥٤٦، رقم: ٦٥٠٧.

② پارہ: ١٨، سورة النور، الآية: ٥٥. ③ پارہ: ١٢، سورة هود، الآية: ٢٨.

جا رہا ہے۔ ہم کہیں رحمت لیتا جا تجھے لاکھ دفعہ ضرورت ہو تو ناک رگڑ، تو ہم تجھے رحمت دیں گے، جب تو وعدہ کا پکا نہیں تو ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، جب تک وعدے کی پوری پابندی رہی، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا دور، حضرات تابعین کا دور، حضرات تبع تابعین کا دور، اقتدار بھی آیا، عزت بھی آئی اور وہ اقتدار آیا کہ آج دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، آج آپ فخر کرتے ہیں کہ عرب ہمارا، عراق ہمارا، مصر ہمارا، ترکستان ہمارا، افغانستان ہمارا، شام اور اردن ہمارا، یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ تو ہے جو آپ کو یہ کہنے کو ملا، آپ نے ان کو خود فتح کیا تھا؟ کیا آپ نے خود قوتِ بازو سے ان ممالک کو قبضے میں کیا تھا؟ یا ان بزرگوں نے جو اللہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے تھے؟ آپ کو فخر کا موقع مل رہا ہے کہ۔

چین و عرب ہمارا ، ہندوستان ہمارا   مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ فخر کا موقع ان کی جوتیوں کے صدقے سے مل رہا ہے، آپ کی بات اگر ہوتی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ تو جب تک قوم وعدے پر پختہ رہی وہ اقتدار بھی تھا، وہ عزت بھی تھی، وہ روزی بھی تھی۔ وہ فتنے بھی نہیں تھے، آپ داعی تھے، دوسرے مدعو، جب آپ نے دعوت چھوڑ دی تو دوسرے داعی بنے آپ کو مدعو ہونا پڑا، آپ با اقتدار تھے، دوسرے ماتحت تھے۔ جب آپ نے اقتدار کے اسباب چھوڑ دیئے، آپ ماتحت بنے، دوسرے آپ کے اوپر غالب کر دیئے گئے۔ یہ وعدہ خلافی آپ نے کی۔ تو جب فتنے آتے ہیں، پریشانیاں آتی ہیں آپ کہتے ہیں کہ تدبیر تو بتلاؤ، تدبیر تو اللہ نے بتلا دی کہ تم میرے بن جاؤ، میں تمہارا بن جاؤں گا اور کیا تدبیر ہو۔ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ رزق ان کے ہاتھ میں ہے، عزت ان کے ہاتھ میں ہے، اس کی چوکھٹ پر جھکو گے تو یہ چیزیں آئیں گی، اس کی چوکھٹ چھوڑ کر غیروں کے آگے جھکنا شروع کیا تو غیروں نے آپ کی رہی سہی عزت کو بھی قبضہ میں لے لیا رہی سہی روٹی پر قبضہ کر لیا، آپ کو فتنوں کے میدان میں چھوڑ دیا۔ اب کوئی روٹی کو رو رہا ہے، کوئی پانی کو رو رہا ہے، کوئی صحت کو رو رہا ہے۔ کیوں رو رہے ہیں؟۔ اس لیے کہ جب ایک کا دروازہ چھوڑا تو پچاس کے آگے جھکنا پڑا اور ان دروازوں پہ کچھ نہیں جو آپ کو دیں، نہ اُدھر کے رہے۔

عظمتِ دَر اور سَر ...... مجھے ایک شعر یاد آیا واقعی بڑا کام کا شعر ہے اور شاعر نے بڑی بلیغ بات کہی ہے، جس نے بھی کہی ہے بڑی اونچی بات ہے اور دو لفظوں میں بڑی زبردست حقیقت کہہ دی ہے، شاعر کہتا ہے۔

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے دَر نہیں کہتے

دروازہ وہی ہے جسے دیکھتے ہی آدمی کا جی چاہے کہ جھک جائے۔ اہل اللہ کا دروازہ، انبیاء علیہم السلام کا دروازہ۔ خواہ مخواہ ہی دل چاہتا ہے کہ سر جھکاؤ۔ انکار کی شکل ہی نہیں۔ تو شاعر کہتا ہے۔

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے دَر نہیں کہتے   ہر در پہ جو جھک جائے اسے سَر نہیں کہتے

ذلتِ انحراف ...... جو پچاس کو اپنا آقا بنا لے، وہ کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا، ایک ہی آقا کی خدمت ہو سکتی

ہے۔ جب آپ کے پچاس آقا ہیں کبھی اس کی چوکھٹ پہ جھکنا کبھی اس کی چوکھٹ پہ۔ کبھی اس سے بھیک مانگنی کبھی اس سے بھیک مانگنی۔ تو مسلم قوم دنیا میں بھک منگی بن کے تھوڑا ہی آئی تھی۔ وہ دنیا سے کچھ مانگنے کے لئے نہیں آئی تھی۔ دنیا کو کچھ دینے کے لیے آئی تھی، وہ محسن بن کے آئی تھی، سائل بن کر نہیں آئی تھی. جب احسان کا دروازہ بند کر دیا اور ختم کر دیا تو سائل اور بھکاری بننا پڑا۔ اب آپ کی یہ حالت ہے کہ کسی قوم کے آگے جھک رہے ہیں کہ ہمیں تمدن کی بھیک دے دو، کسی کے آگے جھکتے ہیں کہ ہمیں سیاست کی بھیک دے دو کسی کے آگے آپ جھک رہے ہیں کہ ہمیں اخلاق کی بھیک دے دو، اور سر کے اوپر ٹوکرا رکھا ہوا ہے جس میں رزق موجود ہے۔ مگر دردر مانگتے پھر رہے ہو۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ہاتھ اٹھا کے سر کے اوپر سے لے لو، وہ ساری چیزیں اس ٹوکرے میں موجود ہیں۔ قرآن وحدیث سر کے اوپر رکھا ہوا ہے اور دنیا کے در پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ حالاں کہ اس میں سب کچھ موجود ہے۔ اسی نے دنیا میں بین الاقوامیت اور بین الاوطانیت پھیلائی ؎

یک سبد پُر زنان ترا بر فرقِ سر　　　　تو ہمی جوئی لبِ ناں در بدر

سر پہ روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا ہے۔ اور ٹکڑوں کی مانگ کرتے پھر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جب غیر کی چوکھٹ پر سر جھکائیں گے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپ بھکاری بنیں گے، تو مسلمان دنیا میں اقوام کو کچھ دینے کے لئے آئے تھے، مگر سائل اور بھکاری ہو گئے۔ اور بھیک ملتی نہیں۔ تو ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وعدہ خلافی کی۔ اس معاہدہ کو توڑ دیا جو اللہ سے کیا تھا۔ کہا تھا کہ مجھ ہی پر بھروسہ کرو، مجھے ہی اپنا بادشاہ سمجھو مجھے ہی خالق اور مالک سمجھو۔ میرے ہی قانون کی دنیا کے اندر ڈنڈی پیٹو، میرا ہی قانون سب تک پہنچاؤ۔ آپ نے جو اس قانون کو چھوڑا تو دنیا کی اقوام نے آپ پر قوانین لادنے شروع کئے۔ وہ قوانین جو فطرت کے بھی خلاف، عقل کے بھی خلاف اور ہوش مندی کے بھی خلاف مگر آپ کو جھک مار کر کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ کشاں کشاں جا رہے ہیں۔ اور آپ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ چیز بری ہے۔ مگر آپ کو جانا پڑا۔

کوئی نس بندی کا قانون پاس کرے گا، آپ کو مجبور ہو کے گردن جھکانی پڑے گی، اس لئے کہ جب اپنے قانون کو پس پشت ڈالا تو دوسرے کے قانون پر چلیں، کوئی فیملی پلاننگ لائے گا، آپ کو ماننا پڑے گا۔ اس لئے کہ جو اسلام کا حکم تھا وہ پسِ پشت ڈال دیا۔ پھر دنیا کی اقوام کے آگے جھکنا پڑے گا۔

اسلامی قانون کی عملی پابندی کی ضرورت...... اگر آپ اس قانون پر عامل ہوتے فقط اعتقادی طور پر نہیں، عمل بھی ہو تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے اندر رخنہ اندازی کرے جب عملاً چھوڑ دیا تو ؎

خانۂ　　خالی　　رادیومی　　گیرد

جب گھر خالی ہوتا ہے تو شیطان ہی اس میں آ کر بسیرا کرتا ہے۔ اس لئے ایک ہی قرار واقعی علاج ہے۔ اللہ نے جو قانون دیا ہے آنکھ بند کے اس کی عملی پابندی کرنی شروع کیجئے۔ پھر دیکھئے کیسے تبدیلی آتی ہے۔ آپ چاہتے

ہیں کہ نظری طور پر چیزیں آجائیں۔ دماغ کو فرحت ہو جائے۔ عمل کا کوئی نام نشان نہیں اور کچھ نہ کرنا پڑے۔ تو دنیا میں بلا کئے کسی کو کچھ نہیں ملتا، دنیا تو دار العمل اور دار الکسب ہے، جتنا کسب و محنت کریں گے اتنا ہاتھ آئے گا، اور جتنا آپ اسباب کو چھوڑ کر غنی بن کے بیٹھ جائیں گے محتاج ترین بن جائیں گے، آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی، یہ جنت نہیں ہے کہ تخیل باندھنے سے نعمت سامنے آجائے۔ یہ دنیا ہے یہاں محنت کرنے سے چیز سامنے آجائے گی۔

اگر کاشتکار چھ مہینے خون پسینہ ایک نہ کرے، وہ چار دانے لے کر گھر میں نہیں آسکتا، اس لئے کہ دنیا دار العمل ہے۔ اگر کاشت کار برسات کے مہینے میں یہ دیکھ کر کہ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، بڑا اچھا خنک موسم ہے۔ لہٰذا یہ چار، چھ مہینے تو سو کے گزار لو۔ تو تخم ریزی کا زمانہ نکل جائے گا، بارش کا دور ختم ہو جائے گا، جب لوگ اناج کے ڈھیر لے کر آئیں گے تو یہ بیٹھ کر قسمت کو روئے گا کہ میں نے تخم ریزی کا سارا وقت سونے میں گزار دیا، اب جب دانہ لینے کا وقت آیا تو جنہوں نے محنت کی تھی وہ لے کر آرہے ہیں۔ میں خالی اور محروم ہوں۔ اب بیٹھ کر روئے گا مگر اب رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ملامت کرنے والا یہی تو ملامت کرے گا کہ کمبخت تو نے ان چھ مہینوں میں جا کر کیوں نہیں محنت کی؟

جب نہیں کی تو اب بیٹھ کر اپنی قسمت کو روؤ۔ غرض دنیا کا بازار اور دنیا کا میدان کاشت کاری کے لئے ہے۔ اللہ نے تخمِ سعادت کا بیج دلوں میں بکھیر دیا ہے۔ اس کو بار آور کرنا کہ ایمان و اعتقاد مضبوط کر کے عملاً چلنا، تب جا کے آخرت اور دنیا میں اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔ جب آپ نے نہ بیج کو پانی دیا، نہ بیج کی آبیاری کی تو چند دن کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیج بھی سوخت ہو جاتا ہے۔ جب زمین پر پانی ہی نہ پڑے تو بیج جل جائے گا۔ جو تخم سعادت قلوب کے اندر بکھیرا گیا تھا، اسے آپ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کو پانی دے کر اگانے کی فکر میں نہیں ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ ہمیں دانہ کیوں نہیں مل رہا؟ ہمیں رزق کیوں نہیں مل رہا؟ بھائی! جب تم اگاؤ گے نہیں تو کہاں سے ملے گا۔؟ جب تخم ریزی نہیں کرو گے تو دانہ کہاں سے ملے گا؟

حصولِ عزت و اقتدار کی تدبیر...... یہ ہر شخص کے دل میں سوال ہے کہ مجھے راحت کیسے ملے؟ مجھے سکون کیسے ملے؟ مجھے عزت اور عرفی حیثیت کیسے ملے۔؟ اقتدار کیسے ملے۔؟ اور عمل کے نام سے آگے کوئی بڑھنا نہیں چاہتا۔ یہ اسی کاشتکار کی سی مثال ہوگئی کہ تخیل باندھ رکھا ہے جو تخم ریزی کے زمانے میں تو پڑ کے سو گیا، اس کے گھر میں دانہ کون لائے گا۔؟ سوائے اس کے کہ وہ دکان دکان بھیک مانگے گا کہ بھائی! میں نے تو اپنی زمین میں نہیں اگایا تم خدا کے واسطے ایک ڈھیری مجھے دے دو، خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو، وہی مثال ہماری ہوگئی کہ جو کام کرنے کا وقت ہے وہ تو ہم آرام میں ضائع کر رہے ہیں، نہ دین کی خبر، نہ احکام کی خبر، نہ خدا کے اور رسول کے اتباع کی خبر۔ نہ وہ معاہدہ یاد ہے جو اللہ سے کر کے آئے ہیں۔ اور جب کچھ نہیں کیا اور فتنے آ کے پڑے، اقتدار بھی چھنا، دولت بھی چھنی اور ملک بھی چھنا، اب بھیک مانگتے پھر رہے ہیں کہ ہمیں فلاں ریاست دے دو فلاں ملک دے دو۔ ملک و ریاست، دولت و عزت کے ملنے کے جو اسباب تھے، ان اسباب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اب کہتے ہیں کہ کیا تدبیر کی جائے؟ تدبیر موجود

ہے، کرنے کا بھی وقت ہے۔ تدبیر بنانے کی ضرورت نہیں، وہ تو بنی بنائی اللہ نے اتار دی تھی۔

کفر کے دست نگر اسلامی ممالک..... غرض جب آپ نے عہد کی خلاف ورزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم پر بھی ضروری نہیں کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں، وہ وعدہ تو اس شرط سے مشروط تھا کہ تم ہماری بندگی کرو، تم قانون خداوندی پر عمل کرو، تم اپنی زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا دستور اپناؤ۔ ان کی حیات اور دستور زندگی کو مشعل راہ بناؤ اور تم یہ وعدہ کر کے آئے تھے، جب تم نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ تو ہم پر کب وعدہ پورا کرنے کی پابندی رہی کہ تمہیں اقتدار بھی دیں، عزت بھی دیں اور رزق بھی دیں۔

اسی لئے یہ چیزیں ہاتھ سے چھننی شروع ہوئیں۔ ملک ہاتھ سے چھننا شروع ہوئے، آج یہ ملک نکل گیا۔ کل یہ نکل گیا۔ اور نہیں بھی نکلا تو اقتدار خود آپ کا نہیں، اقتدار اب غیروں کا ہے۔ آپ اپنے ملک میں رہ کر کچھ نہیں کر سکتے، جب تک ان غیروں کی منشاء نہ ہو، تو آپ ان کی منشاء کے غلام اور تابع بنے۔ کہنے کو آپ کہتے رہیں کہ صاحب! ہمارا ملک آزاد ہے اور ہمارا اقتدار ہے۔ مگر تمہارا اقتدار کیا ہے؟ پیسوں کے تم محتاج ہو، وہ اگر یوں کہیں کہ جب تک تم نس بندی نہیں کرو گے، ہم قرضہ نہیں دے گے۔ تمہیں جھک مار کے کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ کون سا اقتدار ہے؟ یہ کون سی آزادی ہے؟

آزادی' اقتدار..... اقتدار اسی کا نام ہے کہ ''اپنی قدرت سے قادر ہو۔'' ''قادر بقدرت الغیر'' کو قادر نہیں کہتے۔ کیا آپ قادر ہیں جب تک دوسرے کی قدرت استعمال نہ کریں۔؟ یہ کون سی قدرت ہے؟ قدرت وہ ہے کہ اپنے اندر ہو اور آپ اپنی من مانی کارروائی کر سکیں۔ جی چاہی بات کر سکیں۔ یہ قدرت نہیں تو آپ قادر ہی کب رہے؟ ملک اگر آزاد بھی ہو، ہندوستان ہو، پاکستان ہو، کچھ بھی ہو۔ اور انتظام و اثرات غیروں کے غالب ہوں، جب تک وہ مدد نہ کریں چل نہیں سکتے۔ اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی، رزق اور ٹکڑے میں، عزّت اور اقتدار میں۔

پارٹی بندی کا انجام..... تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزقی اور بے عزّتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟ یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اقتدار کیوں نہیں دیا۔؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزّت کیوں چھین لی؟ ہماری روٹی کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگتے پھر رہے ہیں؟۔ اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے۔ اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کہ ؎

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جو آفت آتی ہے، وہ انہیں پر آتی ہے۔ اب روتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ برق آئی کیوں۔؟ یوں کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے بھیج دی، اللہ میاں نے بھیجی۔ مگر کب بھیجی؟ جب تم اللہ میاں کے نہ رہے۔ وہ بجلی ہی گرائیں

گے، وہ تو قحط سالی ہی رکھیں گے، وہ تو رزق چھین لیں گے۔ تم نے معاہدہ توڑ دیا، انہوں نے بھی وعدہ پورا نہیں کیا، وعدہ جب ہی تک ہے جب کہ شرط ایمان و عملِ صالح کی پوری ہو۔ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ ① تو ایمان و عمل صالح اور باہمی اعتماد و محبت کی شرط پوری ہو تو ایفائے وعدہ ہوگا"۔ ہمیں آپ کو تو لڑنے سے ہی فرصت نہیں۔ اتحاد کہاں رہے گا؟ اختلاف اور نزاع ہر چیز میں ہے۔ اب گویا مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر چیز میں لڑتا جھگڑتا رہے، کوئی مسئلہ آئے گا، تب کھڑے ہو کر لڑیں گے، کوئی حکمِ شرعی ہوگا، اس میں کھڑے ہو کے لڑیں گے۔ ہر چیز میں لڑائی ہر چیز میں پارٹی بندی، ہر چیز میں نکتہ چینی، اس قوم کا تو پھر یہی انجام ہونا ہے کہ وہ روتی پھرے۔

قومی غفلت...... یہ سوال ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے کہ صاحب! ان فتنوں میں گرفتار ہیں، کیا کریں؟ مگر دل میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے فتنے برسا دیئے۔ بس اللہ تعالیٰ کی شکایت ذہن میں آتی ہے۔ اپنے نفس کی کوئی شکایت ذہن میں نہیں آتی کہ میں نے کیا کیا۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ اس سے بری ہے کہ کوئی اس کا شکوہ کرے، اس کے ہاں تو دروازے کھلے ہوئے ہیں، لینے والا کوئی ہونا چاہئے؟ اقبال نے ایک جگہ "جوابِ شکوہ" میں کہا ہے۔ جو گویا اللہ کی طرف سے شکوہ کا جواب آیا ہے کہ ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے، رھروِ منزل ہی نہیں

جب کوئی سوال کرنے والا ہی نہ ہو تو وہ کیسے دے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: روزانہ اخیر تہائی رات میں حق تعالیٰ کی تجلیات آسمان دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ: "اَنَا الرَّزَّاقُ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَسْتَرْزِقُنِيْ، اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَسْتَغْفِرُنِيْ" ② میں رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرتیں کرنے والا ہوں، کوئی ہے مغفرت مانگنے والا؟

جن کو اللہ نے توفیق دی، وہ مانگتے ہیں اور انہیں شخصی طور پر ملتا بھی ہے۔ لیکن قوم غافل ہے، نہ وہ مانگتی ہے، نہ اسے ملتا ہے۔ غرض ہاتھ پھیلا کر کہہ رہے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا؟ تو صحیح ہے کہ ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گل ہی نہیں

جس مٹی سے انسان کو بنایا گیا تھا، اس مٹی میں ہی پیداوار نہ رہے۔ تو شیطانی روح حلول کر گئی تو نصب العین شیطان سے مل گیا۔ آدم سے کہاں باقی رہا؟

زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت...... اب ذہن میں یہ تو آتا ہے کہ اللہ میاں نے دوسری اقوام کو سب کچھ دے

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۵۵.

② مسند احمد، مسند ابی ھریرۃؓ ج: ۱، ص: ۳۳۷. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، اوقات الاجابۃ ج: ۴ ص: ۴۱۳.

دیا، اور ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ یہ نہیں آتا کہ کیوں چھینا۔؟ اور ہم نے کیا کیا۔؟ تو سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیا جائے، ہمارا فرض ہے کہ زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر گزاریں اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک تھوڑی بہت تعلیم نہ ہو اور تھوڑی بہت تربیت نہ ہو۔ سنتیں آسمان سے برستی تھوڑا ہی ہیں کہ وہ گھر گھر میں اتریں۔ وہ تو تعلیم کے راستے سے آتی ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان ہوگیا۔ کتنے ہیں ہم میں جو واقعی قرآن کریم کو اس نیت سے پڑھتے یا سنتے ہیں کہ ہمیں عمل نصیب ہو جائے؟

بہت سے وہ ہیں جو پڑھنا ہی نہیں جانتے، انہوں نے تعلیم ہی نہیں پائی، لفظوں کی بھی تعلیم نہیں۔ معنی کی بات تو الگ ہے اور مفہوم کی الگ ہے۔ سو میں ننانوے وہ نکلیں گے جنہیں مس بھی نہیں کہ دین کیا چیز ہے مگر مدعیٔ دین بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ صاحب! ہم دین دار ہیں۔ شاید سو میں کوئی دو چار گنے چنے نکل آئیں گے۔ تو قوم، نیک قوم تب کہلاتی ہے جب اس کی اکثریت نیکی پر ہو۔ ہزار دو ہزار میں سے اگر دس بیس اشخاص نکل آئیں تو وہ قوم کی سربلندی نہیں ہے۔ وہ ان اشخاص کی سربلندی ہے، قوم کی سربلندی جب ہوگی جب کم سے کم اکثریت تو آئے۔ برابر سرابر تو ہو۔ اب ہماری کیفیت یہ ہے کہ ﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ ① مومنین کم ہیں۔ فساق وفجار زیادہ ہیں اور جتنے مومن ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم نے شکایت کی ہے کہ ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ ② بہت سے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔ دلوں کے اندر وہی غیر اللہ کی عظمت جمی ہوئی ہے۔ مالک کی عظمت نہیں ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ پیر مجھے اولاد دے گا، کوئی کہہ رہا ہے فقیر مجھے منہ مانگی مراد دے گا۔ جو اللہ کی عظمت تھی وہ فقراء اور اشخاص کے سپرد کردی۔ اس میں قوم کا کیسے بیڑا پار ہوگا؟ تو یہ طلب ہوتی ہے کہ فتنوں سے بچنے کی صورت بتائی جائے، یہ نہیں ہوتی کہ ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے۔

کم ہمتی کی انتہاء...... اور بڑے سے بڑا کام کریں گے تو یہ کہ صاحب! کہ ایک تعویذ لکھ دیں، دکان میں برکت ہو جائے۔ میں نے کہا تجھے کچھ نہ کرنا پڑے، جو کرے بس تعویذ کھڑا ہو کر کرے، تم اپنا آرام سے بیٹھے رہو۔ تو عمل کی خُو جاتی رہی، بس تعویذ سب کچھ بنا دے گا۔ یا کوئی دعا لٹکا دی، دعا بھی جبھی کارآمد ہوتی ہے جب اپنے اندر کچھ جان ہو۔ ورنہ ایسا ہے جیسے کوئی کسی کے پاس جائے کہ حضرت! دعا کرو کہ میرے اولاد ہو جائے اور نکاح کا نام نہیں۔ بیوی پاس نہیں۔ بھائی! دعا بھی جبھی کارآمد ہوتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرے۔ دعا نتیجے کے لئے کرائی جاتی ہے کہ اسباب پر ثمرہ مرتب ہو جائے، یہ نہیں ہوتا کہ اسباب بھی دعا ہی سے مہیا ہو جائیں گے، مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ "حضرت! مجھے نماز پڑھنے کے لئے تعویذ لکھ دو!" حضرت نے فرمایا۔ "بھائی مجھے ایسا کوئی تعویذ لکھنا نہیں آتا کہ میں تعویذ لکھ کے اس میں دو سپاہی بھی بٹھا دوں کہ جہاں نماز کا وقت آیا اور وہ ڈنڈا لے کر تیرے سر پر ہو جائیں کہ چل مسجد میں۔ میرے پاس ایسا تعویذ نہیں

① پارہ: ۴، سورة آل عمران، الآية: ۱۱۰. ② پارہ: ۱۳، سورة يوسف، الآية: ۱۰۶.

ہے کہ اس میں دو سپاہی بھی بیٹھے ہوئے ہوں۔ اور پھر اس کو ڈانٹا کہ ''نالائق! جو تیرے کرنے کا کام ہے۔ وہ بھی تعویذ ہی کرے۔ تجھے اپنی چارپائی سے ہلنا نہ پڑے۔ تو آرام سے پڑا رہے، بس تعویذ سب کچھ کر دے گا''۔

تو تعویذ کار آمد ہے مگر جبھی جب آپ اسباب مہیا کر لیں۔ نتیجے کے لئے تعویذ ہوتا ہے، دعا ہوتی ہے کہ اللہ ثمرہ مرتب کر دے، یہ محنت رائیگاں نہ جائے، محنت کے لئے تعویذ تھوڑا ہی بنایا جاتا ہے کہ صاحب! مجھ سے عمل کرالو۔ کان پکڑ کے مجھ سے عمل کرادو، عمل تو آپ کی ہمت کرے گی۔ دوسرے کے کان پکڑنے سے عمل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

عزم وہمّت کی ضرورت...... اصل چیز دین میں صرف ہمّت ہے۔ آدمی عزم باندھ لے کہ یہ مجھے کرنا ہے، پھر مددِ خداوندی ہوتی ہے۔ اور وہ کر گزرتا ہے ڈانواں ڈول رہے۔ عزم ہی نہیں، اس کی مدد بھی نہیں ہوتی، تو آپ کے دلوں میں تمنا تو ہے کہ فتنے رفع ہوں مگر دل میں عزم نہیں ہے کہ آپ انہیں رفع کر دیں گے۔ اس لئے عزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیوی معاملات میں بھی اگر محض تمنا ہو کہ مجھے ماہوار ہزار روپیہ آمدنی ہو، کبھی نہیں ہوگی، لیکن جب عزم کریں گے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار کمانا ہے۔ چاہے تجارت کرنی پڑے، چاہے زراعت کرنی پڑے، چاہے ملازمت کرنی پڑے، مجھے ایک ہزار کی آمدنی کرنی ہے۔ اور اس کام میں آپ لگ گئے تو مددِ خداوندی ہوگی۔ ضرور ایک ہزار کی آمدنی ہو جائے گی۔ لیکن اگر نہ دکان پر جائیں، نہ دفتر میں جائیں، نہ کھیت میں جائیں اور تمنا یہ ہے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار ملے تو ایک ہزار روپیہ ماہوار کی کوئی بارش تھوڑا ہی برسے گی؟ کئے کرنے سے آئے گی۔

بلا اسباب دعا موثر نہیں...... دعا بھی جبھی کام دیتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرا کے دعا کرائے کہ صاحب! اتنا کام تو میں نے کر دیا کہ میں وضو کر کے پانچ وقت مسجد میں جاتا ہوں۔ آپ دعا کیجئے کہ میں اس پر جما رہوں مستقیم رہوں۔ اس کی دعا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کہ میرا ارادہ تو نماز پڑھنے کا ہے نہیں۔ آپ دعا کر دیں کہ نمازی ہو جاؤں۔ ایسا بھی دنیا کا کوئی دستور اور فطرت ہے؟ اسی واسطے ایسی دعا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جس کو مشیّت کے اوپر محوّل کیا جائے۔ یوں کہا جائے ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ......'' ''اے اللہ! میری مغفرت فرما دے، اگر تو چاہے، اے اللہ میرے اوپر رحم فرما، اگر تو چاہے''۔

رحم و مغفرت تو وہ جبھی کریں گے، جب چاہیں گے۔ آپ کا یہ کہنا کہ ''اگر آپ چاہیں میری مغفرت کر دیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو ضرورت ہے نہیں آپ کی مغفرت کی، آپ چاہیں تو مغفرت کر دیں، یا یہ کہ مجھے تو آپ کی رحمت کی ضرورت نہیں ہے، آپ چاہیں تو میرے اوپر رحم کر دیں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ دعا کو مشیت کے ساتھ مقید کر کے دعا مت مانگو کہ آپ چاہیں تو دے دیں۔ مجھے تو ضرورت نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔ فرمایا کہ دعا مانگو اس الحاح اور قوت کے ساتھ کہ ہم لے کر اٹھیں گے۔ کریم کے دروازے پر آئے ہیں۔ محروم ہو کر نہیں جائیں گے، تو لیچڑ بن کے دعا مانگو تو دعا ضرور قبول ہوگی اور ملے گا۔ تو سائل بن کر اور لیچڑ بن کر سوال کریں اور چوکھٹ پر سر ٹیک دیں کہ میں بغیر لئے اٹھوں گا نہیں۔ تو ایسے بندے کی دعا بے شک قبول ہوتی ہے۔

وہاں حج پر ہم نے دیکھا کہ بیت اللہ میں ایک بدوی حاضر ہوا۔ بالکل بے پڑھا لکھا۔ اور صاحب! اس نے جو دعا مانگی عجیب تھی۔ اس نے کہا "یَارَبَّ الْبَیْتِ یَا رَبَّ الْبَیْتِ جِئْتُکَ وَالْاَھْلُ فِی الْبَیْتِ اَنْ تَغْفِرَلِیْ اَنْ تَغْفِرَلِیْ......" "اے اللہ! میں تیرے گھر میں آیا ہوں اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں"۔

گویا بڑا احسان کیا۔ تو بیوی بچوں کو چھوڑ کے آیا ہوں، وہ گھر میں ہیں اور میں تیرے گھر میں آ گیا۔ لہٰذا بخشنا پڑے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں بلا مغفرت کے جاؤں، میں تو مغفرت لے کر جاؤں گا۔ واقعی ایسے کو مغفرت ملتی ہے۔ غرض الحاح بھی ہو، زاری بھی ہو، قلب کا جھکاؤ بھی ہو، قلب کے اضطراب سے دعا ہو ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ﴾ ① "جو مضطر ہو کر الحاح تام کے ساتھ دعا مانگے گا، ہم ضرور برائی رفع کریں گے، اس کے اوپر سے فتنہ ضرور ہٹائیں گے۔ اور زمین کی قوت و خلافت بھی دیں گے اور اقتدار بھی دیں گے"۔

تو مانگنے والا ہو، قول سے بھی مانگے عمل سے بھی مانگے۔ عمل کرے تو وہ کرے جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو، اور دعا وہ مانگے جس میں استغناء کا شائبہ نہ ہو، لپٹ کر مانگے، تو ضرور ملتا ہے۔ تو اب آپ دعا سے بھی مستغنی، تعلیم سے بھی مستغنی، تربیت سے بھی مستغنی، پڑھنے لکھنے سے مستغنی، محنت بھی سے مستغنی، اور تمنا یہ ہے کہ سب کچھ ملے۔ یہ فطرۃ اللہ کے خلاف ہے۔

عزت و اقتدار کا قانونِ عام...... دنیا میں حق تعالیٰ کی کسی سے رشتہ داری تھوڑا ہی ہے کہ اس قوم کو ضرور اقتدار دیں گے، انہوں نے تو اصول و قوانین بیان کر دیئے، جو ان پر چلے گا، اسے ملے گا، جو نہیں چلے گا نہیں ملے گا، قانون عام کا اعلان کر دیا۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ ② مسلمان ہوں یا صابی ہوں یہودی ہوں یا نصرانی ہوں۔ مجوسی ہوں یا کسی اور قوم کا ہو، جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا، اس کے لئے اجر بھی ہے، نہ پھر خوف رہے گا، نہ غم رہے گا، نہ اسے محرومی رہے گی"

تو تدبیر تو یہ آ گئی، اب آپ کو کیا تدبیر بتائی جائے؟ اور کیا کہا جائے؟ اور کون آ کر کہے؟ کیا حضرت جبرئیل علیہ السلام کہنے کے لئے آئیں گے؟ نہیں۔ اللہ نے اپنی کتاب اتار دی، پڑھو، علم حاصل کرو اور احکام معلوم کرو، تعلیم نہیں پائی، علماء سے پوچھ پوچھ کر احکام حاصل کرو، مگر اتباع کا جذبہ رکھو کہ پابندی کریں گے۔ خواہ پڑھنے سے ہم معلومات حاصل کریں، خواہ مطالعہ سے ہم معلومات حاصل کریں، خواہ علماء سے فتوے لے لے کر ہم معلومات حاصل کریں۔ سوال کر کر کے اپنی تشفی کریں، ہمیں عمل کرنا ہے۔ اور اتنا علم ہم نے حاصل کرنا ہے جس پر ہم عمل کر سکیں۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ہو۔ جب آدمی کے دل میں لگن ہوتی ہے تو دس طریقے اختیار کرتا ہے۔

① پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیۃ: ۶۲۔ ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۶۹۔

وہ کہتے ہیں کہ: کسی عورت کا شوہر ملازمت پر گیا، اور وہ سینکڑوں ہزاروں میلوں کے فاصلے پر تھا۔ عورت کو خاوند سے محبت تھی۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ اگر خاوند کا خط آتا، چوں کہ خود پڑھی لکھی نہیں تھی مگر چوں کہ خاوند کی لگن اور محبت تھی تو محلے میں پھرتی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے پڑھ کے سنادے کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اگر دل میں لگن نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی گھروں کو جاکے نہ جھانکتی، تو بے پڑھی لکھی تھی، مگر چوں کہ خاوند سے محبت تھی، اس کا کارڈ کا ایک پرزا آیا تو گھر گھر پھر رہی ہے کہ اللہ کے واسطے اس کا مضمون سنادو کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اس لئے کہ لگن ہے۔

اللہ کا آپ کے گھر خط آیا۔ اور وہ قرآن کریم ہے جو اللہ کا فرمان ہے۔ اگر آپ کے دل میں لگن ہوتی اور علم نہ ہوتا، آپ علم کے لئے گھر گھر، مدرسے مدرسے جھانکتے پھرتے کہ اس کا مجھے مطلب سمجھادو، یہ میرے مالک کا فرمان ہے۔ میرے مالک کا خط آیا ہوا ہے۔ غرض لگن ہو تو سب کچھ ہوتا ہے اور لگن نہ ہو تو پھر آدمی مگن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے اندر کڑھن ہوتی ہے اور پریشانی ہوتی ہے۔

خاصیتِ ذکرُ اللہ...... صاف فرمادیا گیا۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① اگر تم دلوں کا اطمینان اور سکون چاہتے ہو تو ذکر اللہ میں لگو، ہماری یاد میں لگو، ہم سکون دیں گے۔ ذکر اللہ میں سکون مخفی ہے، دنیا کے لاکھ اسباب آپ جمع کرلیں۔ سکون قلب کبھی میسّر نہیں ہوگا۔ جو آج تمام اسباب و وسائل کو جمع کئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ پریشان خاطر ہیں، ہر وقت ڈانواں ڈول ہیں کہ یہ اسباب چھوٹ نہ جائیں، اقتدار کہیں چلا نہ جائے۔ رات دن مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور جو اللہ کا ذکر کر کے ان پر اعتماد کئے ہوئے ہیں ان کو کوئی فکر نہیں ہے، نہایت مطمئن اور ساکن القلب ہیں۔

آپ سکون قلب غیر اللہ میں اور دنیا کے وسائل میں تلاش کریں۔ وہ کبھی میسّر نہیں ہوگا، ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کی یاد ہو۔ اس سے دل کو سکون آتا ہے، آپ گھروں کے اندر کتنا ہی پریشان ہوں، مصیبت زدہ اور مبتلا ہوں مگر جب مسجد میں آتے ہیں اور ایک سجدہ کرتے ہیں، دل ٹھہر جاتا ہے کہ میں نے اپنے مالک کے آگے عرض و معروض کردی، تو گھر میں سکون نہیں ہوتا، مسجد میں آکے ہو جاتا ہے، تو ذکر اللہ کا خاصہ قلب کا سکون ہے۔

ذکرُ اللہ اور اسٹالن...... یہ جو اسٹالن تھا، جو کمیونسٹوں کا حضرت حضرت امام ہے، جس نے کمیونزم ایجاد کیا، جب یہ مرنے لگا تو خدا کا تو بالکل منکر تھا۔ دین و مذہب کا انکار کرتا تھا جب مرنے لگا تو اس کی زبان سے اللہ اللہ جاری ہوا اور یہ کہنا اس نے شروع کیا۔ لوگوں نے کہا بھائی! تُو تو خدا کے وجود کا انکار کرتا تھا، اب تو کیسے کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا، میں اب بھی انکار کرتا ہوں۔ کمبخت محروم تھا۔ اس لئے کہا کہ اب بھی انکار کرتا ہوں مگر اسے کیا کروں کہ دل میں سکون اسی نام سے ہوتا ہے۔ اور سکون کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر میں گنّیوں کا نام لوں، روپے کا نام لوں، قلعوں کا نام لوں سکون نہیں ہوتا، ساری چیزیں مجھ سے دور ہونے والی ہیں، چھننے والی ہیں، جب یہ نام لیتا ہوں،

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

دل ٹھہر جاتا ہے۔ تو میں منکر ہوں۔ مگر اس کے باوجود سکونِ قلب اسی سے میسر آتا ہے۔

تو ایک دھریہ اور ملحد تو اس کا احساس کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ اور ایک ماننے والا مسلم اقرار نہ کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ نہ وہ فکر کرے، نہ وہ ذکر اللہ کرے، نہ دل میں یادداشت رکھے تو جب مسلمان اتنے غافل بن جائیں تو انہیں سکون کے ثمرات اور رزق کے اسباب اور اقتدار کے اسباب کہاں سے ملیں گے۔ تو میرے بھائی نے یہ درخواست کی تھی کہ مسلمان مصائب میں گرفتار ہیں۔ کیا علاج کریں؟ بھائی علاج یہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ سب کے لئے ضروری نہیں کہ سارے علماء بن جائیں اور سب کے سب امام غزالی بن جائیں۔

ادائیگیٔ فرض...... مگر اتنا ضروری ہے کہ اللہ نے جو سب کے لئے فرائض رکھے ہیں، ان کی تو پابندی شروع کرو، پانچ وقت کی نماز پڑھو، اگر صاحبِ نصاب اور صاحبِ استطاعت ہو، زکوٰۃ اور صدقات سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرو۔ روزہ رکھ کر اپنے نفس کو پاک کرو، اگر استطاعت ہو تو حج کر کے اپنے عشق کے جذبات ابھارو، حسن سلوک سے پیش آؤ، ہر ایک سے محبت سے پیش آؤ۔ حسنِ ظن رکھو۔ دیکھو پھر قوم جڑتی ہے یا نہیں جڑتی؟

ہر ایک کے دل میں جو بدظنی ہے کہ وہ نکما ہے اور ناکارہ ہے۔ بس میں کارآمد ہوں۔ وہ بھی نالائق اور مجھ میں لیاقت ہے۔ جب یہ جذبات ہوں گے۔ محبتِ باہمی کیسے پیدا ہوگی۔؟ اپنی برائی سامنے نہیں اور دنیا کی برائیاں سامنے ہیں اور ہم ایسے مقدّس ہیں کہ ہم میں کوئی برائی نہیں۔ ساری برائیاں دنیا کے انسانوں میں ہیں۔ تو یہ سب سے بدظنی ہے تو بدظنی سے نہ کوئی اتحاد قائم ہوتا ہے نہ کوئی محبت ہوتی ہے، تو حسنِ ظن سب سے بڑی چیز ہے کہ اپنے کو کمتر سمجھے اور دوسرے کو اعلیٰ سمجھے، اس سے حسنِ ظن پیدا ہوگا۔

معیارِ اقتداء...... آپ کا آخری بادشاہ ظفرؔ جو مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار تھا۔ کچھ تو اپنی ذات سے بھی صوفی منش اور کچھ حالات نے بھی غریب کو صوفی بنا دیا تھا۔ اس نے ایک قطعہ کہا ہے۔ وہ واقعی بڑی عبرت کا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ۔۔۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر ۔۔۔ تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

دنیا کو آپ برا جب ہی سمجھیں گے جب اپنی برائی سامنے نہ ہو، جب اپنے عیب سامنے ہوں، ہر ایک آپ کو پاک صاف اور پاکیزہ نظر آئے گا، اب یہ کہ۔

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

جب دیکھو دوسرے کو نصیحت کر رہا ہے، خود اپنے کو بھلائے ہوئے ہے۔ اس سے کام نہیں چلتا، دنیا کے بارے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر کے بارے میں نظر رہنی چاہئے کہ اس بے چارے کی تو سو روپے ماہوار کی آمدنی ہے اور مجھے ہزار پانچ سو روپے کی آمدنی ہے۔ آدمی شکر کرے۔ اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر پر نظر ہونی چاہئے کہ یہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا ہے۔ افسوس، مجھے توفیق نہیں۔ تو دنیا کے بارے میں اپنے سے کم

تر کو دیکھے، اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھے تا کہ زیادہ رغبت پیدا ہو۔

اب لوگوں نے بالکل قصہ برعکس کر دیا کہ دین کے بارے میں تو اپنے سے کمتر کی اقتداء کرتے ہیں۔ میری نمازیں بہت ہیں۔ یہ تو نالائق آدمی ہے، اس کی نہ نماز پوری نہ کچھ، اور دنیا کے بارے میں اپنے سے برتر کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں کہ مجھے سو روپے کی آمدنی ہے۔ مجھے دو سو کی چاہئے۔ جس سے حرص بڑھتی ہے اور حرص کا انجام برا نکلتا ہے۔ غرض لوگوں نے قصہ الٹ کر دیا۔ بہر حال دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھا جائے، تا کہ دین کی حرص پیدا ہو اور دنیا کے بارے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو تا کہ شکر کا جذبہ پیدا ہو کہ مجھے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ اس لئے ظفر نے کہا کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ‏ ‏ رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر

پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر ‏ ‏ تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اور آگے کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ‏ ‏ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

کہ بڑا مدبر، لیڈر، دانشمند، ذہین ہو، اس کو آدمی نہ جانیئے گا۔ تو کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ‏ ‏ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ‏ ‏ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

وہ آدمی نہیں ہے، عیش میں آدمی اس پر نگاہ کرے کہ جو دینے والا ہے، اس کا حق ادا کروں، اس سے ڈرتا رہوں، جسے دینا آتا ہے اسے چھیننا بھی آتا ہے۔ جتنا آدمی شکر ادا کرے گا۔ اسے زیادہ ملے گا، کفرانِ نعمت کرے گا، وہ نعمت چھین لی جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① جتنا نعمت پر شکر کرو گے، میں نعمت کو بڑھاؤں گا۔ ﴿وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ ② اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو میرا عذاب بھی دردناک ہے۔ پھر وہ ساری نعمتیں چھینی جائیں گے۔

مسلم کے لئے اسبابِ اقتدار...... سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھے، اس کی اطاعت میں رہ کر تھوڑی عبادت پر بھی شکر بہت کرے، تا کہ وہ عبادت بڑھتی جائے، اپنی اطاعت پر غرّہ نہ کرے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب آدمی نماز پڑھ کے یا کچھ ذکر کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی، میں نے تلاوت کی، میں نے ذکر کیا، گویا غرور اور اتراہٹ ہے کہ میں نے بڑا کام کیا۔ فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا! ارے طاقت میں نے بخشی تھی، ارادہ میں نے پیدا کیا تھا۔ اسباب میں نے مہیا کئے، تو نے کیا کیا۔ غرض جتنا کیا، اسے بھی رد کر دیتے ہیں۔

① ② پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷۔

اور اگر سب کچھ کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں بن پایا۔ فرماتے ہیں، نہیں چل کر مسجد تک تُو ہی گیا تھا، طاقت کا استعمال تو نے ہی کیا تھا۔ حج کے لئے سفر کرنے کا ارادہ تُو نے ہی کیا تھا۔ تُو نے سب کچھ کرلیا، تو سب کچھ کر کے جو یوں کہتا ہے کہ کچھ نہیں کیا، اس کا جواب دیتے ہیں کہ تُو نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ تجھے سب کچھ ملے گا۔ اور اگر تھوڑا بہت کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا، اسے فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا۔ قوت میری تھی، ارادہ میرا تھا، مشیت میری تھی، اسباب میرے تھے، تو نے کیا کیا؟

اس لئے ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے مالک کے آگے جھکیں اور جھکنے کے بعد غرّہ نہ کریں، ہر قدم پر سمجھیں کچھ نہیں ہوسکا، توبہ کریں استغفار کریں اور آگے بڑھیں، جب قوم میں یہ جذبہ ہوگا، قوم بڑھے گی۔ اگر یہ جذبہ نہیں۔ وہ لاکھ سوچتی رہے کبھی مرکز اقتدار پر نہیں پہنچے گی اقتدار تمناؤں سے نہیں ملا کرتا، نہ تمناؤں سے عزّت ملا کرتی ہے۔ اور نہ غیر اسباب سے عزّت ملتی ہے۔ انہی اسباب سے عزت ملتی ہے جنہیں اللہ نے مسلم قوم کے لئے متعین کر دیا ہے۔ غیر اقوام سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ مسلم سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ جو یہ دعوی کرے کہ میں آپ کا ہوں، اس کے ساتھ معاملہ اور قسم کا ہے۔

دشمن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ...... اور جو یہ کہے کہ میں آپ کا نہیں ہوں، اس کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے، دشمن ہے تو آدمی اس کی گالیوں کو بھی سہہ جاتا ہے، کہتا ہے کہ دشمن ہے، اور اس کا کیا کام ہے، گالیاں ہی دے گا اور اپنا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو باپ دھول رسید کرے گا کہ تجھ سے توقع نہیں تھی۔ اس لئے مسلم کی ادنی سے ادنی چیز پر گرفت ہوتی ہے، تو ہمارا تھا، تیرا دعوی تھا کہ ''اَنَا مُسْلِمٌ'' میں مطیع خداوندی ہوں اور پھر تو نے یہ حرکت کی؟

اور ایک قوم کہتی ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ انہیں سب کچھ دے دو، ایک وقت آئے گا کہ اچانک عذاب کا پنجہ ان پر گرے گا، جب انہیں پتہ چل جائے گا۔ تو دشمن کو ڈھیل دیتے ہیں اور دوست کو ڈھیل نہیں دی جاتی، جو غلطی کرتا ہے، ہاتھ کے ہاتھ سزا دی جاتی ہے۔ اور کافر کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ گالیاں بھی دے دے، دین کی تکذیب بھی کر دے، دین کا مذاق بھی اڑائے اسے ڈھیل دیتے ہیں کہ اس کے انجام کی خرابی کا وقت آرہا ہے۔ غرض میرا مطلب یہ تھا کہ بھائی! تدبیر تو سب پوچھتے ہیں لیکن یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اس تدبیر کو عمل میں کون لائے گا؟۔ یہ کہتے ہیں کہ عمل کے لئے یہودی اور نصرانی ہیں۔ باقی ہمیں تو تدبیر بتلا دو، تا کہ ہمارے دماغ میں فرحت آجائے کہ ہمیں تدبیر معلوم ہوگئی، عمل کرنا دھرنا نہیں ہے۔ یہ دوسری قوموں کا کام ہے۔ جب دوسری قومیں کریں گی تو وہی پائیں گی بھی۔ پھر آپ رشک کیوں کرتے ہیں کہ صاحب! انہیں سب کچھ مل گیا اور ہمیں کچھ نہیں ملا۔ انہوں نے کچھ کیا تھا تو انہیں کچھ ملا، آپ نے نہیں کیا، نہیں ملا۔

تدبیر عمل...... اسلام کے معنی مسلم بننے کے ہیں۔ اور مسلم کے معنی ''مطیع حق'' کے ہیں۔ جب آپ کہتے ہیں کہ: میں مسلم ہوں، اس کے معنی ہیں کہ میں اپنے پروردگار کا مطیع ہوں، پھر اس اطاعت کو کر کے دکھلائیے۔ تو یہ حدیث معاذ

رضی اللہ عنہ میں فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ''؟...... اے معاذ! جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ وہ یہ ہے کہ: '' اَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا......'' تو اللہ کی عبادت میں لگ جائیں، اس کے قانون پر چلیں، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کریں اور جذبہ ولگن ان کے دل میں یہی ہو کہ ہمیں اپنے رب کی اطاعت کرنی ہے اور غیر رب کو ہم شریک نہیں کرنا چاہتے، تو یہ حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَاحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ......'' کیا یہ جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟

فرمایا بندوں کا حق یہ ہے کہ اس کا وعدہ ہے کہ جب تم عابد بنو گے تو میں تمہیں سب کچھ دوں گا۔ (۱) رزقِ معنوی بھی رزقِ باطنی بھی رزقِ حسی بھی، رزقِ ظاہری بھی۔ سبھی کچھ ملے گا، دونوں چیزیں ہاتھ آئیں گی۔ اس لئے ساری تدبیر اس ایک حدیث میں فرمادی گئی۔ اگر عمل کرنا چاہیں تو یہ ایک حدیث بھی زندگی درست کرنے کے لئے کافی ہے اور عمل نہ کرنا چاہیں تو ایک ہزار وعظ بیٹھ کر آپ سن لیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ وہ وعظ اور وبال جان بنیں گے۔

دنیا دار علماء...... اس واسطے کہ وعظ میں کچھ مسئلہ تو معلوم ہو گیا۔ اگر آدمی جاہل ہے اور غلطی کر جائے تو ایک عذر ہے کہ صاحب! مجھے مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ معلوم کر کے پھر نہ کرے تو یہ مصیبت اور وبال ہے، وہ متنبی ایک موقع پر کہتا ہے۔

وَاِنْ كُنْتَ لَاتَدْرِیْ فَتِلْكَ مُصِيْبَةٌ   وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِيْبَةُ اَعْظَمُ

اگر تم جانتے نہیں ہو، جاہل ہو، یہ ایک مصیبت ہے، اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ ڈبل مصیبت ہے۔ اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو بددعا دی ایک دفعہ اور عالم کو سات دفعہ فرمایا: ''وَيْلٌ لِّـجَاهِلٍ مَرَّةً وَوَيْلٌ لِّعَالِمٍ سَبْعَ مَرَّاتٍ.'' (۲) جاہل ایک دفعہ برباد اور عالم سات دفعہ برباد، جو علم رکھتا ہے پھر عمل نہیں کرتا۔ اب اگر ایک عالم ہے، اسے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کا علم ہے۔ وہ اللہ ہی کی رضا کی پابندی کرے گا، غیروں کی رضا کی نہیں کرے گا۔ اب اگر کوئی مولوی یہ کہے کہ صاحب! مسئلہ تو بے شک یہ ہے مگر آمدنی کا تعلق فلاں سے ہے۔ لہٰذا کیا حرج ہے۔ اس کی دلداری کے لئے اس کے مطابق مسئلہ بیان کر دو۔ وہ اللہ کا بندہ تھوڑا ہی رہا۔ وہ تو ابلیس کا بندہ بن گیا کہ جس سے چار پیسے مل گئے تو فتویٰ بھی اس کے مطابق دے دیا۔ وہ مسئلہ کیا ہوا۔ وہ تو موم کی ناک ہو گئی کہ جیسے دنیا کی غرضیں سامنے آتی جائیں ویسے ہی بدلتے جائیں۔ یہ عالم کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہل کا کام ہے۔ جس نے خواہ مخواہ علم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جو واقعی عالم ہے وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔

آدمی عالم ہو اور اپنی حاجات غیروں کے آگے پیش کرے۔ اور غیروں کی رضا اتنی ہو کہ چاہے مجھے دین کا مسئلہ بھی بدلنا پڑ جائے مگر مجھے یہ چار پیسے مل جائیں۔ یہ علم اور علماء کی شان نہیں ہے۔ اور ایسے لوگ درحقیقت علماء ہیں بھی نہیں۔ وہ نام کے علماء ہیں۔ عالموں کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ ''وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِيْبَةُ اَعْظَمُ......'' جان بوجھ کر عمل

---

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل، ج: ۱۸، ص: ۳۵۴.

(۲) مرقاة المفاتیح، کتاب الدعوات، باب جامع الدعاء، ج: ۸، ص: ۴۲۶.

نہیں کرو گے تو ڈبل مصیبت ہے۔اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو ایک دفعہ بد دعا دی اور عالم کو سات دفعہ۔

جدّ و جہد کا ثمرہ...... بہرحال یہ چند باتیں اس سلسلہ میں عرض کرنی تھیں کہ بے شک فتنوں کی افراط ہے، پریشانیاں ہر طرف سے ہیں۔مگر وہ ہماری لائی ہوئی تو ہیں۔اللہ تعالیٰ نے تو نہیں برسائیں، وہ تو پیدا کرنے والے ہیں۔وہ اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کا بندہ کسب کرے،تو کاسب بندہ ہے۔خالق اللہ ہے۔تم کسی کام میں جدّ و جہد کرو گے، وہ پیدا کردیں گے۔تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جدّ و جہد میں لگو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔وہ تخلیق فرمائے گا۔تو فتنے ہیں بلاشبہ ہیں۔مگر

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تست

یہ تمہارے ہمارے ہی لائے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ ① کوئی مصیبت تم تک نہیں پہنچتی جب تک تم ہی اپنی کرتوت سے اس مصیبت کو اپنے اوپر نہ ڈال دو،تمہارے کئے ہوئے کا یہ سب ثمرہ ہے۔تو ہم نے جو کیا وہ کیا دھرا سامنے آ گیا۔اور اگر نیکی کا کام کریں گے اور نیکی کی راہ پر چلیں گے تو پھر دوسرا ثمرہ آ جائے گا۔ثمرہ حق تعالیٰ دیتے ہیں۔ان کے ہاں عدل ہے۔ان کا نام ہی العدل اللطیف الخبیر ہے۔ان سے زیادہ عادل کون ہے۔تو کسی کی محنت کو وہ رائیگاں نہیں فرماتے۔﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ② کسی محسن کے احسان کو اور عمل کو رَدّ نہیں فرماتے۔آدمی کر کے دیکھے،تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور کچھ جدو جہد بھی کیجئے، کچھ دین کی معلومات اور تعلیم بھی حاصل کیجئے۔کچھ اپنی تربیت کی طرف بھی متوجہ ہو جایئے۔کسی مربی سے تعلق پیدا کر کے اپنے اخلاق کی اصلاح کرایئے۔تو خیر انشاء اللہ ظاہر ہوگی۔اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں۔اور وہ شاعر کا قطعہ ہے،وہ پڑھ لیتا ہوں۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم　　　روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس　　　بر رسولاں بلاغ باشد وبس

شاعر کہتا ہے کہ: ہم نے اپنی جگہ بہت نصیحتیں کرلیں۔ایک بڑا زمانہ ہم نے صرف کیا،ہم نے بڑی نصیحتیں کیں،اب اس کے بعد بھی کسی کے کان میں نصیحت نہ جائے اور دل میں نہ اترے،تو نصیحت کرنے والے کا کام تبلیغ اور پہنچا دینا ہے۔منوا دینا اس کا کام نہیں ہے۔آدمی مانے گا تو اپنے اندرونی جذبے اور دیانت سے مانے گا۔ اس واسطے تدبیر میں نے عرض کردی،عمل آپ کو کرنا ہوگا۔اب یہ کہ تدبیر بھی بتلاؤں اور عمل بھی کرلوں۔اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ بھئی میرے عمل کرنے سے پوری قوم تر جائے گی تو چلو یہ بھی ہو جاتا،مگر قوم ہی کے عمل کرنے سے قوم ترے گی،کسی ایک کے عمل کرنے سے کسی دوسرے کو نجات تھوڑا ہی مل جائے گی۔﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا

① پارہ: ۲۵،سورۃ شوریٰ،الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۱۲،سورۃ ھود،الآیۃ: ۱۱۵۔

مَاسَعٰی﴾ ① جو سعی کرے گا وہی انسان پائے گا، سعی تو ایک کرے اور دوسرے کو مل جائے، یہ سنتُ اللہ کے خلاف ہے، جو کرے گا، اسی کو ملے گا۔ اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں، فتنے اور مصائب واقعی ہیں۔ ان کا علاج جو واقعی ہے وہ عرض کر دیا گیا، اس کی تفصیلات پھر آپ علماء سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس عمل کو کس طرح کریں۔ اس عمل کو کس طرح کریں۔ مثلاً ایک عمل عبادت کا ہے تو پوچھنا پڑے گا کہ کس طرح سے نماز پڑھیں، ایک عمل اجتماعیات کا ہے کہ دنیا کی قوموں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ یہ بھی قرآن کریم سے پوچھئے، اس نے بتلا دیا ہے۔ ایک عمل سیاست کا ہے کہ سیاسی تدبیریں کیا ہوتی ہیں۔ وہ بھی قرآن کریم نے بتلا دی ہیں کہ: وہ یہ ہیں جن سے قوم اقتدار پاتی ہے۔ تو سب کچھ ہے، مگر یہ اسی کے لئے ہے جو کچھ کرے۔

ایمان کے سونے کی ضرورت...... اگر ہم یوں کہیں کہ آپ خالی جیب جا رہے ہیں۔ تو بازار میں چاہے کروڑوں روپے کا مال بھرا پڑا ہے۔ تو یہ ٹھیک ہوگا، اس لئے کہ جیب خالی ہے، وہاں سے تو وہ سامان لے کر آئے گا جو جیب میں پیسے لے کر جائے گا۔ تو اگر آپ بازار گئے اور ہم یوں کہیں کہ اس بازار میں کچھ نہیں، کوے اڑ رہے ہیں، کوئی سامان نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چاہے لاکھوں کا سامان ہو مگر تیرے لئے کچھ نہیں، اس لئے کہ تیری جیب میں پیسہ نہیں، پیسہ ہوگا تو تُو بھی کچھ لے کے آئے گا۔

غرض دل کی جیب میں ایمان کا سونا ہونا چاہئے۔ ایمان کا جذبہ ہونا چاہئے، پھر دنیا کے بازار میں سب کچھ ملے گا، اور اگر دل خالی کر کے جا رہے ہیں جس میں ایمان باللہ نہیں، عمل صالح، پیروی سنت نہیں، پھر دنیا چاہے کروڑوں کی ہو مگر آپ کے لئے کچھ نہیں، خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا۔

دعاء...... اللہ تعالیٰ ہمیں نیک عمل کی، عبرت پکڑنے کی، عمل کا جذبہ اختیار کرنے کی، عمل کی ہمت باندھنے کی، ہمت کے اسباب پیدا کرنے کی صحبتِ صالحین اختیار کرنے کی، مطالعہ اختیار کرنے کی، سوال کرنے کی، ان سب چیزوں کی توفیق دے، جن سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور عمل میں ترقی ہوتی ہے۔

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ. اَللّٰھُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ."

تنبیہ...... یہ دعا بھی کر دی ہے اور یہ عزم لے کر جائیے کہ اس پر عمل کرنا ہے، اس کی ٹوہ میں لگنا ہے۔ ہمیں دینی اور اخلاقی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ پھر انشاء اللہ مددِ خداوندی ہوگی۔ اور ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ عام

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹.

طور سے عادت یہ ہے کہ لوگ مصافحہ کیا کرتے ہیں۔ تو میں کمزور ہو رہا ہوں۔ اور ضعیف ہو رہا ہوں۔ آپ میں سے تو ہر ایک کو ایک دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا، مجھے پانچ سو دفعہ، میرے اندر طاقت نہیں ہے لہذا مصافحہ سے معاف رکھیں اور گزر جانے دیں۔ بس دل مل گئے، یہ کافی ہے۔ ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں۔

"وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا وَرَسُوْلِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ."

تعلیمِ نسواں

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَا وَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰہُ اِلٰی كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. ①

اَمَّابَعْدُ!. فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

ترقی کا پہلا زینہ...... عزیز بچیو، محترم بہنو اور استانیو! آپ کے اس مدرسہ میں آ کر بے حد مسرت اور خوشی ہوئی۔ تعلیم کا مسئلہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بغیر تعلیم کے ترقی نہیں کر سکتی۔ کسی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ تعلیم ہے۔ اسلام میں بھی سب سے پہلے پڑھنے ہی کی آیت نازل ہوئی اور فرمایا ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ② اسلام سے قبل کا زمانہ بداخلاقی، بداعمالی، اور برائیوں سے بھرپور تھا لیکن اس زمانے کا نام بداخلاقی اور بداعمالیوں کا زمانہ نہیں رکھا بلکہ اس کا نام جہالت کا زمانہ رکھا، معلوم ہوا کہ برائی کا سرچشمہ جہالت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اسلام کا بنیادی سرچشمہ تعلیم ہے۔ تعلیم کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنا اہتمام کیا اور کسی چیز کے بارے میں نہیں کیا، سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے کھانے، پینے اور پہننے کا انتظام نہیں کیا بلکہ اولاً تعلیم کا بندوبست کیا جیسے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ③ انہیں اشیاء کے نام سکھلا کر ملائکہ سے مقابلہ کرایا اور وہ کامیاب ہوئے تو خلافت سے بہرہ ور کیا اور خلافت کا تاج سر پر رکھا۔ اس کے بعد فرمایا: ﴿اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ ④ تو رہنے سہنے کا انتظام بعد میں ہوا، پہلے تعلیم کا انتظام کیا۔ معلوم ہوا کہ علم اور تعلیم کا بہت درجہ ہے۔

دنیا ایک تعلیم گاہ ہے...... بغیر تعلیم کے حیوان اور انسان میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کہ باپ کو تعلیم دیتے اور بس کرتے بلکہ اولاد کو بھی تعلیم دی۔ حدیث میں آتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر دایاں ہاتھ مارا تو نیک اولاد نکلی اور بایاں ہاتھ مارا تو بری اولاد نکلی۔ اور اس کے بعد تمام کو وادیٔ ذاران میں

---

① ۵ محرم الحرام ۱۳۸۲ھ کو جامعہ خیر المدارس ملتان کے شعبہ تعلیم النساء میں خطاب فرمایا۔ ② پارہ: ۳۰، سورة العلق، الآية: ١.

③ پارہ: ١، سورة البقرة، الآية: ٣١. ④ پارہ: ١، سورة البقرة، الآية: ٣٥.

جمع کر کے ان (روحوں) سے خطاب کیا۔ اور فرمایا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ ① تو اس سے بھی مقصود تمام کو تعلیم دینا تھی ربوبیّت کے بارے میں کہ میں تمہارا رب ہوں۔ تو اس سے بھی تعلیم کا اہتمام معلوم ہوا۔ گویا دنیا ایک مدرسہ ہے۔ اور تمام انسان اس کے طالب علم ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے معلّم ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے خصوصی شاگرد ہیں۔ تو دنیا کی پیدائش کا مقصد تعلیم ہے اور اس کے بعد عبادت ہے، حسنِ معاشرت ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں ضرورت پڑتی ہے کہ طالب علم کے لئے وظیفہ ہو تا کہ کھانا پینا اور رزق حاصل ہو تو اس کے لئے زمین اور دریا بنائے، مطالعہ کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے تو چاند، ستارے اور سورج کو پیدا کیا۔ تو جب ہم اس دنیا سے قبر میں جائیں گے۔ اسی تعلیم سے متعلق سوال ہوگا۔ (مَنْ رَّبُّكَ) اور اس کا امتحان ہوگا۔ یہ اوّل امتحان ہوگا۔ اور بڑا امتحان میدانِ حشر میں ہوگا۔ کچھ کامیاب ہوں گے اور کچھ ناکام۔ کامیاب کو انعامات دیئے جائیں گے۔ اور ناکام کو سزا دی جائے گی اور اس امتحان میں تمام شریک ہوں گے۔

اس میں بوڑھے، جوان اور بچے کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اگر چہ عالم ارواح میں تو تمام کی روح یکساں تھیں مگر آخر عمر کے اعتبار سے کہ جو پیدائش کے بعد جلدی مرے گا تو وہ بچپن اور جو جوانی میں مرے گا وہ جوان اور جو بڑھاپے میں وہ بوڑھا، تو ان روحوں میں بھی جوان بچے اور بوڑھے اس اعتبار سے تھے، اس لئے تعلیم کا اتنا لحاظ رکھا گیا کہ جوان اور عمر رسیدہ تمام سے امتحان ہوگا۔ تو تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور دنیا کے آباد کرنے کا مقصد یہی ہے۔

عورتوں کی تعلیمی ذمّہ داری اور اس کے نتائج و اثرات...... تعلیم کا سلسلہ عورتوں کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔ اس لئے ابتدائی تربیت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ قوم کی تعلیم کا دارومدار ماں کی تعلیم پر ہے۔ اگر وہ جاہل ہے تو قوم جاہل رہے گی۔ الا ماشاء اللہ، جس کی فطرت سلیم ہو اگر وہ عالم ہوئی تو اولاد بھی عالم ہوگی۔ اگر والدہ کے قلب میں تعلیم کی طرف رغبت موجود ہو تو بچے بھی اس کی رغبت سے فیض یاب ہوں گے، اگر ماں خود رغبت سے خالی ہے تو بچے بھی ایسے ہی رہیں گے۔ اسی لیے سب سے پہلے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اس وقت بھی سب سے پہلے اس کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ دائیں کان میں اذان دی جاتی ہے جس میں توحید و رسالت اور عبادت کی تعلیم ہے۔ تو اس اذان کے ذریعے اصول و فروع' عقائد و اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے اور حی علی الفلاح میں اس کا انجام اور نتیجہ بھی بتا دیا جاتا ہے۔ کہ فلاح اور کامیابی ہے۔ جو آخرت میں تمہیں میسّر ہوگی۔ تو ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے اسلام میں تعلیم کا کتنا بڑا مرتبہ اور درجہ ہے، اس لئے اس پر زور دیا گیا ہے۔

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ" ② علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ تاکہ علم حاصل کرنے کے بعد ہر مسلمان مرد و عورت کو معلوم ہو جائے کہ میں کیسا مسلمان ہوں۔ اور

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔ ② المجعم الاوسط للطبراني، من اسمه: مقدام، قال الطبراني: لم يرو هذا الحديث عن ابي عروة وهو معمر بن راشد الامفضل بن فضالة، ج: ۱۹ ص: ۱۶۲۔

مسلمان کے کیسے اخلاق ہونے چاہئیں چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں سے ادب واحترام سے پیش آنا، رہنے سہنے اور حسنِ معاشرت کا طرزِ عمل معلوم ہو، اس لئے تعلیم واجب قرار دی گئی ہے تمام پر خواہ مرد ہو یا عورت، اس کے بعد دوسرے اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ: جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو عبادت کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔

تو حقیقت میں یہ مقصد عورتوں سے ہی حاصل ہوتا ہے کہ جب ماں تعلیم یافتہ ہوگی، بچّہ کو بھی تعلیم سے آشنا کر دے گی۔ جس سے اس کے اخلاق سدھر جائیں گے اور اگر بالفرض ماں بچے کو تعلیم نہ بھی دے مگر وہ ماں نیکوکار اور بااخلاق ہے تو اس کو نیکوکاری اور حسنِ اخلاق کی برکت سے اولاد بھی دیندار بن جائے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ: جو قوم میری فرماں برداری کرتی ہے تو میں اس کی سات پشتوں تک اور نسلوں تک رحمت کو بھیجا کرتا ہوں اور اگر فرماں برداری نہیں کرتی اس کی سات پشتوں تک لعنت بھیجتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی نیکوکاری اور بدکاری کا بڑا اثر ہے جو سات پشتوں تک جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ والدین جیسے ہوں ویسے ہی ان کے بچے بھی اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر والدین عالم ہیں تو بچے میں بھی علم کا اثر ہوگا کہ وہ جائز و ناجائز کے مطابق گفت وشنید کرتا ہوگا۔ اگر دوکاندار ہیں تو بچے میں بھی دکانداری کے اثرات حساب وغیرہ کچھ نہ کچھ موجود ہوں گے۔ اگر والدین کھیتی باڑی کرتے ہیں تو بچے میں بھی اس کا اثر موجود ہوگا۔ تو یہ اثر ہے، ماں کے ماحول کا بچے پر اثر ہوگا۔ اب سب سے پہلا حق انسان پر اپنے نفس کا ہے۔ دوسرا حق اولاد کو پڑھانا کہ وہ صحیح راستہ پر چلے، یعنی مخلوق کا ہے۔ اور تیسرا حق معاشرہ کا ہے۔ اور یہ تینوں علم پر موقوف ہیں۔ تو جتنا علم حاصل کریں گے خاندان علمی بنتا جائے گا۔ اور ماحول خوشگوار ہوتا جائے گا۔

ملکہ کے تقوے کا اس کی اولاد پر اثر...... امیر عبدالرحمٰن خان والیٔ کابل کے دادا امیر دوست محمد کا واقعہ ہے۔ کہ اس کے ملک پر کسی نے چڑھائی کی، اس کی سرکوبی کے لئے اس نے ایک فوج اپنے ولی عہد شہزادے کے ہاتھ بھیجی، دو تین دن بعد اطلاع آئی کہ شہزادے کو شکست ہوئی اور وہ دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اور دشمن اس کے پیچھے ہے، اس سے بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا اور کئی غم سوار ہوئے۔ شکست کا غم، شہزادے کی کمزوری کا اور قوم کی ملامت کا، تو وہ اس غم کے اندر محو ہو کر گھر آیا اور بیگم صاحبہ سے تمام قصّہ سنایا۔ بیگم نے کہا کہ یہ سارا قصّہ غلط ہے۔ امیر نے کہا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی رپوٹ ہے، وہ کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ مگر بیگم نہ مانی کہ شکست ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تو بادشاہ گھر سے نکل آیا کہ یہ عورت ہے۔ یہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے گی۔ دوسرے دن اطلاع آئی کہ وہ خبر غلط ہے۔ شہزادہ فتح پا کر واپس آ رہا ہے۔ اس پر بیگم نے شہزادے کی سلامتی اور فتح یابی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

بادشاہ نے پوچھا، تجھے کیسے معلوم ہوا تھا کہ وہ شکست نہیں کھا سکتا۔ کیا دلیل ہے تیرے پاس کہ میری پوری حکومت کو تو نے جھٹلایا۔؟ اس نے کہا کہ کچھ نہیں صرف اللہ تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔ یہ میرا راز ہے۔ میں اس کو

فاش نہیں کرنا چاہتی۔ آخر اصرار کرنے پر بتایا، جب شہزادہ میرے پیٹ میں آیا تو میں نے اس وقت سے عہد کرلیا تھا کہ میرے پیٹ میں مشتبہ لقمہ نہیں آنا چاہئے۔ اس لئے کہ حلال غذا سے اچھی طبیعت اور اچھے اخلاق بنتے ہیں اور حرام غذا سے طبیعت فاسد ہوتی ہے اور اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ شہزادہ نو مہینے تک میرے پیٹ میں رہا۔ اور ایک لقمہ غذا کا میں نے ایسا نہیں کھایا جو مشتبہ ہو۔ اس لئے اس کے اخلاق رذیل اور برے نہیں ہوسکتے۔ شہید ہونا یہ اچھا خلق ہے۔ اور پشت پھیرنا یہ اچھا خُلق نہیں ہے۔ تو شہزادہ شہید ہوسکتا ہے اور کٹ کر مرسکتا ہے، مگر پشت پھیر کے فرار نہیں ہوسکتا۔

اور پھر اس پر بس نہیں بلکہ جب یہ شہزادہ پیدا ہوا تب بھی میں نے مشتبہ غذا استعمال نہیں کی تاکہ اس غذا سے دودھ بن کر اس کے اخلاق پر اثر انداز نہ ہو۔ اور جب دودھ پلاتی تو وضو کرکے اور دو رکعت نفل ادا کر کے پلاتی۔ اس لئے ان چیزوں سے شہزادے کے اخلاق بہت بلند ہونے چاہئیں، اس لئے میں نے تمہاری ساری فوج اور حکومت کی بات کو جھٹلایا۔ مگر اپنے قول سے باز نہیں آئی۔

جب امیر دوست محمد کی بیگم اتنی متقی بن سکتی ہے جبکہ آرام وعیش کے تمام اسباب موجود ہیں۔ تخت پر بیٹھ کر متقی بن سکتی ہے تو ہماری آج کل کی بہنیں جھونپڑیوں میں رہ کر کیوں کامل نہیں ہوسکتیں۔ جو رکاوٹیں ان کو تھیں وہ تمہیں نہیں۔ بعض لوگ حیلہ جو ہوتے ہیں اور ہر کام اور ہر بات میں حیلہ تلاش کرتے ہیں، مگر حیلوں سے کچھ نہیں بنے گا۔ اور یہی حیلہ کرنے والے قیامت کے دن بھی حیلہ سازی کریں گے اور کہیں گے کہ ہمیں وقت نہیں ملا، اس لئے اطاعت نہیں کی بلکہ دولت میں مشغول رہے اور اس سے فرصت نہیں ملی تو اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہما السلام کو پیش کریں گے کہ باوجود اتنی دنیا اور دولت کے اللہ کے مقبول بندے اور نبی ہیں۔

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا علمی مقام...... ایسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے مردان باہمت تھے، ان کی عورتیں بھی ایسی تھیں اور ایسے ہی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں، میری وحی کا آدھا علم صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور آدھا علم صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سیکھو، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بہت بڑے بڑے درجہ کے تابعین رحمہم اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ شاگرد رہے ہیں۔ تو جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وحی کا آدھا علم سیکھ سکتی ہیں تو آج کل کی بہنیں ابتدائی حالات اسلام کے اور معاملات کا علم بھی حاصل نہیں کرسکتیں، حضرت امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث کی کتاب کا املاء ان کی لڑکی نے لکھا تھا، آج تمام امت پر اس کا احسان ہے۔ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا بڑے صوفیا میں سے گزری ہیں۔

عورت اور منصب افتاء...... فقہ کی کتاب "بَدَآئِعُ الصَّنَآئِع" کی وجہ تصنیف یہ ہوئی کہ ایک بہت بڑے محدث کی لڑکی بڑی عالم اور محدث تھی اور اس کے ساتھ ساتھ حسین اور خوبصورت تھی، بہت بڑے بڑے علماء کے

پیغام نکاح کے آئے اور ایسے ہی سلاطین وغیرہ نے بھی پیغام بھیجے۔ مگر تمام سے اس لڑکی کا علم زیادہ تھا، اس لئے پیغام قبول نہیں ہوتا تھا، اس لڑکی نے یہ شرط مقرر کی کہ تمام علماء فقہ میں کتابیں تصنیف کریں۔ جس کی کتاب مجھے پسند ہوگی میں اس سے نکاح کرلوں گی، اس پر ہزاروں کتابوں کی تصنیف ہوئی تو اسے "بَدَائِعُ الصَّنَائِعِ" پسند آئی، اور اسی سے اس نے نکاح کیا۔ آج کل اگر ہماری بہنیں کمال اور مہارت حاصل نہ کرسکیں تو کم از کم حقوق کی ادائیگی کا علم تو حاصل کرلیں کہ خاوند کے یہ حقوق ہیں اور بچوں کے یہ حقوق ہیں۔

مقصدِ علم...... اور وقائع میں لکھا ہوا ہے کہ سلجوقی کے عہد میں مدرسہ نظامیہ بنایا گیا، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اس مدرسہ کے صدر مدرس تھے بعد عرصہ مدید کے معلوم ہوا کہ پڑھنے والوں کی نیتیں فاسد ہیں تو بادشاہِ وقت نے ارادہ کیا کہ مدرسہ کو ختم کردوں مگر خیال آیا کہ ایک دفعہ دیکھ لوں کہ واقعی سب کی نیتیں فاسد ہیں کہ نہیں۔

چناں چہ ایک رات نظام الملک خود آیا، ایک ایک طالب علم سے سوال کرتا رہا، تم کس لئے پڑھ رہے ہو؟ کوئی جواب دیتا کہ میرا والد بادشاہ کا قاضی ہے، میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میں بھی قاضی بن جاؤں۔ کوئی کہتا کہ میرا والد بہت معروف اور مشہور عالم ہے۔ اطراف میں اس کی شہرت کا ڈنکا بج چکا ہے، تو میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میری بھی شہرت ہوجائے۔ وغیر ذلک۔ نظام الملک نے تمام طلباء کو دیکھا کہ ان کی نیتیں فاسد ہیں تو تہیہ کرلیا کہ مدرسہ کو بند کردیا جائے۔ میرے لاکھوں روپے ضائع ہو رہے ہیں۔ صحیح نیت سے کوئی نہیں پڑھتا کہ ثواب حاصل ہوجائے، اس فیصلہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس کی نظر ایک طالب علم پر پڑی، جو مطالعہ میں مستغرق تھا۔ نظام الملک اس کے پاس گیا، مگر اس طالب علم نے کتاب سے ایک لمحہ کے لئے نگاہ نہ اٹھائی۔ پوچھا "تم بڑے مستغنی ہو"؟ کہا "میرا مقصد کتاب کا مطالعہ کرنا ہے چہروں کا مطالعہ کرنا نہیں"۔ نظام الملک نے پوچھا "تمہارا ایک دومنٹ کے لئے حرج تو ہوگا لیکن یہ بتاؤ آپ کا اس پڑھنے سے مقصد کیا ہے؟" تو اس نے کہا "میں نے ماں باپ سے سنا ہے ہمارا ایک خدا ہے جس نے ہمیں زندگی عطاء کی ہے۔ وہ ایک محسن ہے اور اس کے حقوق مجھے معلوم نہیں، تو میں محسن کے حقوق جاننے کے لئے تعلیم حاصل کر رہا ہوں"۔ نظام الملک نے کہا "میرا تو ارادہ اس مدرسہ کے توڑنے اور بند کرنے کا تھا لیکن جب تک تم اس مدرسہ میں پڑھتے رہو گے، تمہاری وجہ سے مدرسہ جاری رہے گا"۔ یہ طالب علم حضرت حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ چناں چہ نظام الملک نے اس مدرسہ کو باقی رکھا۔ معلوم ہوا اصلی مقصد علم سے حقوق کی ادائیگی ہے اور ہم میں سے کون ہے جس پر حقوق نہیں ہیں۔ مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا تمام پر حقوق ہیں۔ تو ان حقوق کے بتلانے کے لئے تعلیم سکھائی جاتی ہے۔

تعلیم حق فطرت وعقل ہے...... تعلیم ایک فطری چیز ہے کہ فطرۃً محسن کا حق ادا کرنا چاہئے۔ اور عقلی بھی ہے۔ تو جو جاہل ہے وہ فطرت اور عقل دونوں کے خلاف کر رہا ہے اور احکامِ شرعیہ وعقلیہ کے خلاف کر رہا ہے۔ ہمیں اپنی بچیوں سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ محسن کشی کریں گی۔ اور عقل وفطرت کو آگ لگائیں گی۔

عورت کی صلاحیت......اکثر عورتوں کو یہ خلجان اور شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقی اور علم وفضل کا میدان مردوں کے لئے ہے۔ اور عورت تو گھر میں بیٹھنے والی ہے اس کو علم سے کیا واسطہ؟ مگر ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ تاریخ اس کو جھٹلاتی ہے بلکہ کتابوں سے عورتوں کے بڑے بڑے فضائل معلوم ہوتے ہیں۔

''صِفَةُ الصَّفْوَةِ'' ایک کتاب ہے، اس میں مستقل عورتوں کا ایک باب باندھا گیا ہے، ان کی سیاست، ان کی تعلیم اور جہاد کا بیان ہے حتیٰ کہ عورتوں کی کشتی کا بھی بیان ہے کہ انہوں نے کشتی میں بڑے بڑے بہادر مردوں کو بچھاڑ دیا۔ تو تاریخ اس کو جھٹلاتی ہے بلکہ عورتوں نے میدان جنگ میں کام کیا ہے۔

عورت کی نبوت......دوسری بات یہ ہے کہ دین مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں۔ جیسے رسالت اور ''قَاضِیُ الْقُضَاةِ'' کا عہدہ کہ عورت رسول اور قاضی القضاۃ نہیں بن سکتی۔ کیوں کہ اس کی قابلیت عورت میں نہیں، مگر سب سے بڑا کمال جو نبوت کا ہے، ایک بڑی جماعت اس پر ہے کہ عورت کو نبوت مل سکتی ہے۔ ابن حزم بھی یہی کہتے ہیں۔ اگر چہ جمہور کا یہ مسلک نہیں۔ جس جماعت نے اس کا قول لیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی آتی رہی، تو وہ نبی ہیں فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا نبی تھی۔ تو جب اس قول کے مطابق عورت کو نبوت جو ایک اعلیٰ درجہ کا کمال ہے، اس کا حصول ممکن ہے تو اور کیا کمال چاہئے؟ اور کون سی فضیلت ہے جس کو وہ حاصل نہیں کر سکتی، قرآنِ مجید میں ہے: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ...﴾ ① اس آیت میں مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ عبادات، اخلاق اور معلامات میں یکساں ہیں۔ تو مبداءِ فیاض سے فرق نہیں، عقل اور نقل اس کو جھٹلاتی ہے، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ اہتمام تعلیم کا ہے۔

عورتوں کی دینی ترقی......انبیاء علیہم السلام کو بھی اس کا اہتمام ہے، امت کے بڑوں اور نامور لوگوں کو بھی اس کا اہتمام ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بچیاں جہل کو چھوڑ کر دینی تعلیم کی طرف نہیں آسکتیں، تو مدرسہ خیر المدارس کا یہ شعبہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ عورتیں اور بچیاں بھی ترقی میں حصہ لئے رہی ہیں اور دین کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں کہ اصل ترقی یہی ہے۔

عورتوں کی عمومی تعلیم......ایک دور میں یہ بات تھی کہ مخصوص گھرانے علم سے مختص ہو گئے اور مائیں اولاد کو تعلیم سکھاتی تھیں۔ مگر اب یہ اختصاص نہیں۔ تو خیر المدارس کا یہ شعبہ پوری قوم کے لئے خوشی کی بات ہے عورتیں اس میں تعلیم حاصل کریں تو آئندہ چل کر نسلیں نیک بنیں گی۔ عورتوں کے لئے اب یہ موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھائیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دن دوگنی، رات چوگنی ترقی عطاء فرمائے۔

''آمِيْن ثُمَّ آمِيْن.''

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۵.

افادات علم وحکمت

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا! اَمَّا بَعْدُ

وصول الی اللہ کے اصول......ان صلاحیتوں کا معیار ہے کہ علائق جتنے کم سے کم ہوں گے، وصول اتنا جلد سے جلد ہوگا، جتنے علائق اور تعلّقات بڑھ جائیں گے طبعیت اس میں بٹے گی، یکسوئی کم ہوگی، تو پھر دیر لگ جاتی ہے چاہے استعداد بھی ہو۔

اسی واسطے ان حضرات نے جو اصول رکھے ہیں وہ چار ہی ہیں۔ قلت طعام یعنی کھانا کم کھانا اور کم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو خوراک ہے اس سے بھی آدھا کردے، یہی دو چار لقمے کم کردے، یہ کافی ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں۔ پہلا دور جو کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا دور ہے کہ ان کی غذائیں سوکھا ٹکڑا وغیرہ تھی۔ حتی کہ جہاد میں جارہے ہیں۔ کسی کی زنبیل میں چند ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، کوئی سامانِ رسد نہیں تھا کہ وہاں کیک وغیرہ ملیں۔ بعض کے پاس کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں، بھوک نے ستایا، وہ کھائیں۔ بعض کو یہ بھی میسر نہیں تو چھوہاروں کی گھٹلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ انہیں ہی منہ میں ڈال لیا اور چوس لیا، دل کو بہلا لیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں۔ غرض غذا تو یہ تھی اور مجاہدات عظیم کہ دن بھر جہاد میں اور رات کو مجاہدہ میں ہیں اور غذا اکل یہ۔ غالباً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ''اِنَّهُمْ يَبْعُرُوْنَ بَعْرًا وَّاَنْتُمْ تَصْلِطُوْنَ صَلْطًا'' ① وہ فراغت کو جاتے تھے بمشکل دو چار مینگنیاں سی نکل آتی تھیں۔ غذا ہی نہیں اور تم قد مچے بھر دیتے ہو۔ یہ اپنے لوگوں کو جو کہ تابعین تھے، ان کو کہا۔ تو ہر زمانے کی قلّتِ طعام الگ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی ان کی قلّتِ طعام کی حرص کرنے لگے تو چار پائی پر پڑ جائے گا، اور اس کا انتقال بھی ہو جائے گا، برداشت نہیں کرسکتا۔ ان کے ظرف میں برداشت تھی، فیضانِ نبوّت براہِ راست متوجہ تھا۔ اس سے بڑھ کر طاقت نہیں ہوسکتی۔ اب حال کی قلّتِ طعام یہی ہے جو ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا۔ ہم دو آدمیوں کو کسی ضرورت سے دہلی بھیجا، دو آدمیوں کی آمد و رفت میں پانچ روپے لگ جاتے مگر ہمیں پچاس روپے دیئے کہ خوب کھاؤ اور خوب کام کرو۔ غرض اس زمانے کی قلّتِ طعام یہی ہے، کھانے میں زیادہ کمی نہ کرے۔ معمول کو معتدل رکھے۔ ایک اصول یہی ہے۔ اور ایک ہے قلت منام، یعنی سوؤ کم۔ اس میں بھی یہی بات ہے کہ ان حضرات کا سونا تو مجبوری تھا کہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ سوئیں بھی نہ۔ بس ذکر

① هذا من قول عليؓ: اخرجه البيهقي في سننه، جماع ابواب الاستطابة باب الجمع في الاستجاء بين المسح، ج: ۱، ص: ۱۵.

اللہ میں ہی لگے رہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر ذکر فرماتی تھیں، ایک رسی چھت میں ٹانگ رکھی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رسی کیسی ہے؟ عرض کیا ''جب نیند کے جھٹکولے زیادہ آنے لگتے ہیں تو اپنے کو اس رسی سے باندھ لیتی ہوں''۔

فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آنے لگے پڑ کے سورہو۔ جاگ جاؤ پھر اللہ کا نام لینا شروع کرو۔ طبیعت کو گھوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو شریعت نے طبائع کی رعایت بہت زیادہ کی ہے۔ طبیعتوں کا معمول ہر ایک کا الگ الگ ہوتا ہے، اس میں کمی ہوجائے گی تو اس کا برا اثر پڑے گا۔ اور بالخصوص اس دور میں، اس واسطے جس کا معمول سونے کا ہے اس میں کمی نہ کرے۔ اس لئے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ: '' **لَا تَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ** '' ① نیند میں کمی مت کرو۔ جس کو جو عادت ہے اس کو پورا کرلے اور اپنا کام بھی کرے۔ مگر نیند میں اتنا وقت لگادے جتنا معمول ہو۔ تو طبائع الگ الگ ہیں۔ اس لئے ہر ایک کی قلتِ طعام وقلتِ منام مختلف ہوتی ہے، پھر زمانے بھی الگ الگ ہیں، اس کے لحاظ سے ایک طبقہ پر دوسرے طبقے کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔

تیسرا اصول ہے قلّتِ کلام۔ کم بولو۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بلاضرورت نہ بولو۔ ضرورت کے موقع پر کلام کرنا ضروری ہے۔ لیکن خواہ مخواہ کی فضول مجلسیں اور تفریحی باتیں، ان میں وقت ضائع ہوتا ہے اور علائق کی کثرت ہوجاتی ہے، پھر اپنے معمولات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ اور چوتھی چیز ہے قلّتِ اختلاط مع الانام۔ ملنا جلنا کم، بالخصوص مجاہدات کے زمانے میں۔ میل جول، تفریحی مجلس، اٹھنا بیٹھنا، یہ چیزیں مضرت پہنچاتی ہیں، حدیث میں ہے کہ: '' **مَنْ سَكَتَ سَلِمَ وَمَنْ سَلِمَ نَجَا** '' ② جو چپ رہا وہ صحیح سالم رہا، اور جو صحیح سالم رہا اس نے نجات پالی۔ حاصل وہی ہے کہ بلاضرورت بولنا، اسے شریعت نے پسند نہیں کیا۔ جیسے ایک روایت میں ہے کہ عجمیوں کے بکواس سے بچو۔ بے ضرورت بول رہے ہیں۔ بولے چلے جارہے ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔ ضرورت کے موقع پر چپ رہنا برا ہے اور چپ رہنے کے موقع پر بولنا برا ہے۔ حسبِ ضرورت سکوت وکلام کرے، سب کا حاصل یہی نکلا کہ اختلاط اور علائق کی کمی ہو اس سے وصول جلد ہی ہوجاتا ہے، ذکر کی تاثیر قوی ہوجاتی ہے۔

مجاہداتِ باطنیہ کی مثال...... مجاہداتِ باطنیہ کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مدارس میں طلباء تعلیم پاتے ہیں، ان کے لئے بھی کثرتِ علائق بری چیز ہے۔ اگر وہ دوستیاں کریں۔ مجلسوں میں جائیں تو مطالعہ کون کرے گا؟ استعداد کس طرح پیدا ہوگی۔؟ غرض کسی بھی مقصد کے لئے ضروری ہے کہ دل میں مقصد کی لگن ہو اور مقصد کے لئے عشق ہو اور غیر مقصد سے تنفر اور بُعد ہو۔ پھر جاکے مقصد حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرمارہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں میں گریہ طاری تھا۔ توجہ الی اللہ ہورہی تھی۔ تو جوشِ عقیدت میں ایک شخص نے کہا۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب فی من نام عن صلوۃ، ص: ۱۲۵۵، رقم: ۴۳۷.

② شعب الایمان للامام البیهقی، ج: ۱۱، ص: ۶۸، رقم: ۴۸۶۲. (یہ حضرت اصمعیؒ کا قول ہے۔)

مقصد کی لگن...... ''اے موسیٰ! تم سے بھی بڑا کوئی دنیا میں عالم ہے؟ یعنی نہیں ہے''۔ فرمایا۔ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ اور یہ حق تھا، اس لئے کہ اپنے دور میں پیغمبر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوتا۔ انہی کے طفیل میں دوسروں کو علم پہنچتا ہے، تو اپنے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام افضل الخلائق ہیں۔ بلا کسی غرورِ نفس اور بلا کبر کے حق بات آپ نے فرمادی۔ کہ میں ہی بڑا عالم ہوں۔ اللہ نے بنادیا۔ یہ تکبر نہیں تھا۔ مگر کبر کی صورت پیدا ہوگئی دعویٰ کی صورت پیدا ہوگئی کہ ''میں ہوں'' یہ ناپسند ہوا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: تم دعویٰ کرتے ہو کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ ''بَلٰى عِنْدَنَا عَبْدُنَا هُوَ اَعْلَمُ مِنْكَ. '' ① ہمارا ایک بندہ ہے کہ جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اس سے جا کے علم سیکھو۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے اور حضرت یوشع ابن نون کو ساتھ لیا۔ حق تعالیٰ نے علامت بتلادی کہ فلاں جگہ مجمع البحرین میں جب پہنچو گے تو اس بندے سے ملاقات ہوگی۔ اور یہ فرمایا جو مجھے سنانا تھا کہ ﴿حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا﴾ ② میں مجمع البحرین پر پہنچ کر رہوں گا، چاہے لاکھوں برس گزر جائیں، مجھے جانا ہے اور اس بندے سے علم حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصد کی لگن تھی کہ چاہے لاکھوں برس گزر جائیں۔

غرض ایک طالب علم کا جب انتہائی مقصد متعین ہو جائے، اس میں لگن ہونی چاہئے اور مقصد سے عشق ہونا چاہئے۔ جب اس میں منہمک ہوگا تو غیر مقصد کی طرف کبھی توجہ نہیں کرے گا۔ تو مقصد کی لگن اور دھن یہ اصل چیز ہے۔ جب علوم ظاہرہ میں اس کی ضرورت ہے تو علوم باطنہ میں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے آدمی یہ سوچ لے کہ چاہے عمرِ نوح بھی گزر جائے مگر مجھے ہر صورت میں یہ مقصد حاصل کرنا ہے، پھر حق تعالیٰ بھی مدد فرماتے ہیں اور مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ غرض پہلی چیز یہ ہے کہ اپنے مقصد سے لگن ہو۔ اس کے لئے پھر ایثار ضروری ہے کہ آدمی اپنی خواہشات مقصد میں فنا کردے۔ اگر رات دن اس میں ہے کہ کھاؤں گا یہ اور پیوں گا یہ، تو وہ آرائش کی فکر میں ہے۔ اسے مقصد سے کیا تعلق؟ جب آدمی مقصد میں لگتا ہے تو ہر چیز سے نگاہ ہٹ جاتی ہے۔ پھر مددِ خداوندی آتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''ہمتِ مرداں مددِ خدا'' ہمت کرو گے تو اللہ کی مدد شاملِ حال ہوگی، کم ہمت ہو کر گھر بیٹھ جاؤ گے، اس کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔

اختلافِ استعداد...... تو اس میں احوال بھی مختلف ہیں، استعدادیں بھی مختلف ہیں۔ عزیمتیں بھی مختلف ہیں۔ بعضوں میں عزیمت ہوتی ہے کہ انتہائی لگن ہے۔ بعض میں کچھ ہلکی سی لگن ہوتی ہے، اس کو مقصد کے حاصل کرنے میں دیر لگ جائے گی، اس کا کوئی قانون نہیں ہے۔ قانونی بات اتنی ہے کہ نصاب پورا ہو گیا تو فارغ التحصیل ہو گئے۔ اب یہ کہ تم میں کتنی علمی قوت آئی، یہ ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ یہی یہاں بھی ہے کہ جب وہ مجاہدات و افکار صحیح طریقے سے پورے ہو گئے، شیخ کہہ دے گا کہ بھائی تم قانونی طور پر واصل ہو گئے۔ اب یہ کہ تمہارے اندر

---

① الصحيح للبخاری، كتاب العلم، باب مايستحب للعالم اذاسئل، ص: ۱۳، رقم: ۱۲۲.

② پارہ: ۱۵، سورة الكهف، الآية: ٦٠.

جذبہ کتنا ہے۔عشق خداوندی کتنا ہے۔یہ ہر شخص کے حالات الگ الگ ہیں۔

اعضاء کی پیوندکاری...... یہ اصل میں اس پر موقوف ہے۔پہلے یہ سمجھا جائے کہ اس جسم کے ہم مالک ہیں یا یہ جسم ہمیں بطور عاریت کے فائدہ اٹھانے کے لئے دیا گیا ہے۔ظاہر بات ہے کہ یہ جسم سرکاری مشین ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔اگر آپ مالک ہوتے یا آپ کے قبضے میں ہوتا تو آپ کبھی اس جسم کو بیمار نہ ہونے دیتے،کبھی کسی عضو کو اپنی جگہ سے ٹلنے نہ دیتے،مگر آپ مالک نہیں ہیں۔بیماری آتی ہے تو آپ کو سر جھکا دینا پڑتا ہے۔صحت آتی ہے جب بھی سر جھکا دیتے ہیں۔غرض پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اس بدن کے مالک ہیں یا بطورِ عاریت کے دیا گیا ہے؟ مالک تو ہیں نہیں بطورِ عاریت کے دیا گیا ہے۔حق تعالیٰ شانہٗ دیتے ہیں پھر لے لیتے ہیں۔اگر مالک ہوتے تو کبھی بھی اپنے بدن کو دوسرے کے حوالے نہ کرتے۔حتیٰ کہ اللہ میاں کے حوالے بھی نہ کرتے اور وہ لینا چاہتے تو کہتے کہ حضور، جب آپ نے ہماری ملک بنادی تو غیر کی ملک میں آپ تصرّف کیوں کرتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا، ہماری ملک نہیں، جب ملک نہیں ہے تو مالک سے پوچھا جائے گا۔اگر وہ اجازت دے تو ہم کسی عضو کو منتقل کرسکیں گے۔وہ اجازت نہ دے تو نہیں کرسکیں گے،تو اس اجازت کی ذمہ داری آپ کے پاس کوئی ہے یا نہیں؟ کہ آپ کو اجازت مل گئی ہے یا نہیں؟ اگر وحی یا الہام کے ذریعہ مل گئی ہو تو ٹھیک ہے۔اگر نہیں ملی تو پھر آپ کو کوئی حق نہیں۔ پھر اس میں ایک سوال تھوڑا ہی ہے۔آپ نے ایک شخص کو اپنی آنکھ دے دی،قیامت کے دن اس نے کہا کہ اب چونکہ یہ میری ملک ہوگئی،لہٰذا تم اندھے رہو۔لہٰذا یہ اندھے کا اندھا حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تو نے اپنا ایک عضو منتقل کردیا۔واپس لینے کا کیا حق ہے،جب واپس لینے کا حق نہیں تو اندھا رہ،وہاں پھر آپ کیا کریں گے۔یہ جسم جو ہے،برزخ ہو یا آخرت ہو،عذاب و ثواب اسی پر واقع ہوگا تو آپ کو حق کیا ہے کہ آپ جسم کا کوئی عضو کسی دوسرے کو دے دیں۔اوّل تو مالک نہیں۔پھر مالک نہ ہونے کی صورت میں جو تصرفات برزخ میں یا حشر میں ہوں گے وہ اسی بدن پر ہوں گے۔جب آپ یہ بدن دے چکے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی جلا کر بدن کو راکھ کردے۔ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

دین کی بنیاد مسائل پر ہے مصالح پر نہیں......اب رہا یہ کہ مصلحت یہ ہے تو دین کی بنیاد مصلحتوں پر نہیں ہے۔ مسائل پر ہے۔کون سی بُری سے بُری چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی مصلحت نہیں۔شراب پینے میں بھی تو مصلحت ہے۔ صحت اچھی ہوجاتی ہے۔بعض دفعہ بدن میں قوّت آجاتی ہے۔جوئے میں بھی مصلحت ہے ایک دم تو مال بھی بڑھ ہی جاتا ہے،ایک پیسہ خرچ کیا اور ہزار روپیہ کمالیا تو نفع ہوا۔اور قرآن کریم بھی اس مصلحت کو مانتا ہے۔﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ① لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ فرمادیجئے ان میں کچھ نفع بھی ہے،کچھ نقصان بھی ہے۔مگر نقصان غالب ہے نفع مغلوب

---

① پارہ:۲،سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۲۱۹.

ہے۔غرض قرآن کریم نے نفع کا اقرار کیا،تو کون سی چیز ایسی ہے جس میں نفع نہیں،مگر اس نفع ونقصان پر اگر احکام کا مدار ہوتا تو شراب جائز ہوتی کہ اس میں ایک نفع بھی ہے۔جوا جائز ہوتا،اس میں ایک نفع بھی ہے۔

لیکن باوجود منفعت کے ناجائز قرار دیا گیا،غرض آپ اگر تمدّنی مصالح سے کوئی منفعت ثابت کریں تو دین کا مدار تو منافع اور مصالح پر نہیں ہے،وہ تو مسائل پر ہے۔ورنہ آپ کل کہیں گے کہ صاحب تمدّنی طور پر شراب میں بھی تو منفعت ہے تو اس کی بھی اجازت دی جائے۔اور جوئے میں بھی کچھ نفع ہے تو اس کی بھی تھوڑی بہت اجازت دی جائے۔تو اس اجازت کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوسکتا۔یہ فقط آنکھ،ناک تک نہیں رہے گا،یہ نفس کی خواہشات پر بھی آئے گا۔طبعی تقاضوں پر بھی آئے گا کہ اس میں مصلحت یہ ہے۔اگر میری اور آپ کی تجویز کردہ مصلحتیں جو ہم بتلاتے ہیں،اس پر مدار ہوتا تو پھر اس کی اجازت دے دی جاتی مگر اس پر تو مدار نہیں،البتہ مصلحتِ کلی پر مدار ہے کہ بنی نوع انسان کی مصلحت کیا ہے۔زید،وعمر،بکر کی مصلحت نہیں دیکھی جاتی۔قانون جب بنتا ہے تو مفادِ عامّہ کو سامنے رکھ کر بنتا ہے۔زید،عمرو بکر کے لئے نہیں بنتا۔مثلاً ریلوے کا قانون ہے کہ ایک ٹکٹ میں آپ ۲۵ سیر وزن لے جاسکتے ہیں۔ایک آدمی یوں کہے کہ میں قوی ہوں،میں دومن وزن اٹھا سکتا ہوں۔میرے لئے ۲۵ سیر کی کیوں قید ہے۔؟اس کی بات کو نہیں مانا جائے گا۔اس لئے کہ مفادِ عامّہ کی رعایت پیش نظر ہے۔زید، عمرو بکر کی نہیں کہ کون قوی ہے،کون ضعیف ہے۔تو دنیا کے قانون میں بھی جو مفاداتِ عامّہ ہیں،مصالح عامّہ ہیں جو بنی نوع سے متعلق ہیں ان کی رعایت ہوتی ہے۔بنی نوع انسان کے چند افراد کی رعایت نہیں ہوتی۔

نس بندی یا کنبہ بندی؟......نس بندی تو باتفاق علماء ناجائز ہے۔اس لئے کہ اس میں تغیرِ خلق اللہ بھی ہے اور بدنِ انسانی میں اس قسم کے تصرّفات کرنا ہے جن کی فطرت اجازت نہیں دیتی۔پھر یہ کہ نس بندی سے وہ مادّہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے جس سے آدمی کو اولاد ہو۔کسی کو حق نہیں کہ کسی مادّے کو ختم کردے کہ وہ اولاد بنانے کے قابل ہی نہ رہے۔اور مرد سے نامرد ہوجائے۔اس کا کوئی حق نہیں۔اور کنبہ بندی جو ہے وہ اختیاری ہے۔اس میں یہ ہے کہ خاوند بیوی میں بعض مصالح ایسے ہیں کہ وہ اگر اولاد بند نہیں کریں گے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔مثلاً بیوی بہت بیمار ہے۔اگر اولاد ہوگی تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔یا خاوند بہت بیمار یا جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ رزق کی اتنی کمی ہے کہ کوئی صورت نہیں بن پڑتی اور اولاد روز بروز ہورہی ہے تو تقلیلِ اولاد کے لئے خاوند بیوی مل کر باہمی معاہدہ کرلیں کہ اب ہمیں اولاد کم کرنی ہے۔مگر یہ قانونی چیز نہیں،یہ تو اخلاقی اور خانگی چیز ہے قانونِ شریعت اس کے اوپر دباؤ نہیں ڈالے گا۔البتہ شریعت حق دے گی کہ اگر ایسے حالات آئیں تو اس حق کو باہمی رضامندی سے استعمال کیا جائے گا۔خاوند بیوی مل کر باہم معاہدہ کرلیں۔غرض نس بندی میں مادّہ زائل ہوتا ہے۔اس کا کسی کو حق نہیں۔کنبہ بندی اختیاری ہے کہ خاص حالات میں آدمی تقلیلِ اولاد کی طرف متوجہ ہو۔مگر وہ قانونی چیز نہیں۔ اخلاقی چیز ہے کیوں کہ ہر گھر کا الگ الگ معاملہ ہے۔

عمومی طور پر تقلیلِ اولاد کی صورت...... تقلیل اولاد کا جو طریق ہے وہ یہ ہے کہ ان اسباب کا انسداد کیا جائے جن سے ہر وقت شہوات ابھرتی رہتی ہیں اور خواہی نخواہی اولاد ہو، حتیٰ کہ جائز ناجائز بھی۔ جب فواحش اور منکرات عام ہوں، بے حجابی اور عریانی عام ہو، عورتوں اور مردوں کا اختلاط عام ہو، کوئی صورت تقلیل اولاد کی نہیں۔ آخر پہلے بھی تو لوگ تھے مگر اتنی اولاد نہیں ہوتی تھی، اس لئے کہ ہوسناک نہیں تھے، اب چوں کہ رات دن عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ شب وروز اختلاط ہے تو شہوات اپنے مرکز پر قائم نہیں ہیں، وہ منتشر ہیں، اس لئے لوگ جائز ناجائز میں مبتلا ہیں۔ اور جب کوئی چیز اپنے مرکز کو چھوڑ کر حد سے نکل جاتی ہے، کوئی بھی قوت ہو وہ کسی حد پر رکتی نہیں۔ شہوات جب قبضے میں نہ رہیں تو ہر وقت آدمی شہوت رانی میں پڑا رہے گا۔ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ تو قدرتی طور پر اولاد زیادہ ہوگی۔ اس واسطے تقلیل اولاد کی ایک تو خاص صورت ہے کہ بیوی بیمار ہے۔ بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہے کہ اب اگر اولاد ہوگی تو بچے گی نہیں۔ یہ تو ایک خصوصی بات ہے۔ لیکن عمومی طور پر اگر کوئی چاہے کہ اولاد زیادہ نہ ہو اس کی صورت یہ ہے کہ ان اسباب کو ختم کیا جائے جن کی وجہ سے شہوات اپنی جگہ پر قائم نہیں ہیں۔ بے پردگی، فحاشی اور عریانی روکی جائے۔ مرد وعورت کا اختلاط روکا جائے۔ قدرتی طور پر ہر قوت اعتدال پر آجائے گی۔

مقصود تکثیر اولاد ہے، تقلیل کا تعلق عوارض سے ہے...... تقلیل اولاد مقصود تو نہیں۔ مقصود تو تکثیر اولاد ہے۔ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑھے گی، بہتر ہی ہے مگر تقلیل مقصود نہیں ہے۔ عوارض کی وجہ سے ہوسکتی ہے۔ جب کوئی خاص حالت پیش آجائے جیسا کہ میں نے عرض کیا، بیوی بیمار ہے۔ یا مرد کے اندر صلاحیت باقی نہیں رہی یا اور اسباب پیش آئیں۔ غرض تقلیل مقصودِ اصلی نہیں، وہ تکثیر ہی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس پر کیا حالات گزر رہے ہیں، وہ اپنے گھریلو حالات دیکھ لے۔ اور ایک وہ عام چیز ہے، وہ قانونی ہے۔ چاہے تقلیل ہو، تکثیر ہو کہ منکرات کو دنیا سے مٹایا جائے، عریانی، بے حجابی، بے حیائی، اس کے کارخانے بند کئے جائیں۔ یہ قوت اعتدال پر آجائے گی۔

موجودہ تمدّن جو مغرب کی طرف سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک اسلامی تمدّن کی ضد ہے۔ یہاں نگاہ بازی حرام، وہاں نگاہ بازی تمدّن کا جز۔ یہاں اجنبیہ سے خلوت بالکل ممنوع، وہاں تمدّن کا جز، وہاں اگر کسی شخص کی بیوی اندر ہے، اور باہر کسی غیر مرد کے جوتے پڑے ہوئے ہیں تو اسے حق نہیں ہے کہ وہ مداخلت کرے، اسے بیوی کو روکنے ٹوکنے کا حق نہیں ہے۔ اندر نہیں جاسکتا۔ ایک تمدّن ہے، غرض اس بارے میں یہ اسلامی تمدّن کی بالکل ضد ہے۔

تمدّنی مشکلات...... اب مشکل یہ ہے کہ تمدّن تو وہ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہم اسلامی جزئیات کا جوڑ لگائیں۔ وہ جوڑ لگے کیسے؟ وہاں تمدّن کی بنیاد نفسانیت اور نفسانی خواہشات ہیں۔ یہاں تمدّن کی بنیاد اخلاق اور روحانیت پر ہے کہ اخلاق اعلیٰ ہوں، کردار بلند ہو، ہر شخص خوفِ خداوندی اور تقویٰ وطہارت کی تصویر ہو۔ غرض یہاں کی بنیاد الگ اور وہاں کی بنیاد بالکل الگ۔ وہاں مقصودِ اصلی عیشِ دنیا ہے۔ یہاں مقصودِ اصلی عیشِ آخرت ہے۔ بقدرِ ضرورت شریعت نے دنیا کمانے کی بھی اجازت دے دی۔ چوں کہ یہ ایک دوسرے کے ضد ہیں، اس لئے ایک

میں دوسرے کا جوڑ کیسے لگے؟

وعظ ونصیحت سے شخصی تبدیلی آتی ہے...... اب وعظ ونصیحت آتی ہے، کوئی بے چارہ اللہ سے ڈرنے والا ہے، وہ مان لیتا ہے، لیکن محض وعظ ونصیحت سے تمدن میں انقلاب نہیں آ سکتا۔ انقلاب تو قوتِ قہری سے آتا ہے۔ بعض چیزیں طاقت سے پیدا کی جاتی ہیں، محض وعظ ونصیحت سے پیدا نہیں ہوتیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اسلام میں خلافت نہ رکھی جاتی۔ چوں کہ جامع اور اجتماعی دین ہے۔ اس واسطے اس کے اندر خلافت ہے، حدود وتعزیرات ہیں. چوں کہ غرض بہت سی چیزوں کا انسداد قوت کرتی ہے، وعظ ونصیحت نہیں کرتی۔ وعظ ونصیحت سے بہت سے بہت کوئی عبادات کی طرف متوجہ ہوگیا، معاملات سچے کر لئے لیکن یہ کہ زمانے کے اندر تمدّنی انقلاب برپا ہوجائے، یہ محض وعظ سے نہیں ہوتا، قوّت سے ہوتا ہے۔

خلافتِ اخلاقی...... ایک خلافتِ عامّہ ہے جیسے خلفاءِ راشدین کی خلافت، جو طاقت ور خلافت ہے۔ اور ایک خلافتِ اخلاقی ہے جیسے کسی شیخ نے اپنے مریدین کو خلافت دے دی۔ وہ خلافتِ باطنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ قلوب کی اصلاح کرو لیکن زمانے کو بدل دو، یہ قبضے میں نہیں ہے۔ اور یوں کوئی روحانیت والا اللہ تعالیٰ پیدا کرے جو سارے عالم کو بدل ڈالے، تو اسے قدرت ہے جیسا کہ ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ اتنی عظیم روحانی قوّت ہوگی کہ پوری دنیا کا تمدّن بدل جائے گا اور انقلابِ عام پیدا ہوجائے گا، سب میں خوفِ خداوندی، خدا ترسی پیدا ہوجائے گی اور سب اتقیا بن جائیں گے۔ چناں چہ فرمایا گیا کہ آدمی زکوٰۃ کا مال لے کر نکلے گا تو کوئی قبول کرنے والا نہیں ملے گا کہ میرے گھر میں خوب تموّل ہے۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک انگور کے خوشے میں پورا کنبہ سیر ہوجائے گا۔ تو عدلِ کامل جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو پھر دنیا میں برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ ظلم کے ساتھ برکات کا ظہور نہیں ہوتا۔ غرض خلافتِ عامّہ اور چیز ہے۔ اسے خلافتِ کبریٰ کہتے ہیں۔ خلافتِ صغریٰ یہ ہے کہ ایک شخص پر آپ کو اطمینان ہوا کہ اس کا قلب صحیح ہوگیا اور یہ اپنی حد تک دوسروں کو بھی صحیح بنائے گا۔ آپ نے خلافت دی تو یہ خلافتِ باطنی ہے خلافتِ عامّہ نہیں ہے۔

علامتِ ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ...... ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ کا وقت تو متعیّن نہیں کیا گیا، اس کی علامتیں بتلائی گئی ہیں، جب یہ علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوں سمجھو کہ ظہورِ مہدی قریب ہے۔ پہلی علامت یہ ہے کہ ”مُلِئَتِ الدُّنْيَا ظُلْمًا وَّجَوْرًا۔“ ① پوری دنیا ظلم وستم سے لبریز ہوگی۔ عدل اور سکونِ قلب کا کہیں نشان نہیں ہوگا۔ آثار تک نہیں ہوں گے، ظلم وزیادتی سے دنیا بھری ہوئی ہوگی اور یہ حالت عام ہوگی۔ کسی خطے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یا جیسے فرمایا گیا کہ عرب میں سونے کا ایک پہاڑ ظاہر ہوگا۔ وہ ظہورِ مہدی کا وقت ہوگا۔ تو ایسی کچھ علامتیں بتلائی گئی ہیں۔ مدت متعیّن نہیں کی گئی، وہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ جانتے ہیں کب ظہور ہوگا۔ جیسے قیامت کی علامات بتلائی

① السنن لابی داؤد، کتاب المهدی، ج: ۲، ص: ۵۰۹، رقم: ۳۴۲۸.

گئیں، وقت نہیں بتلایا گیا۔

ذرائع یقین...... جس درجے میں آپ پہنچ سکتے ہیں پہنچیں، یہ جو منجم ہیں، یہ اٹکل پچو کے تیر لڑاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جوانمردی تو یورپ والوں نے کی کہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر چاند پر پہنچ گئے۔ یا تو طاقت ہو وہاں پہنچ کر حالات معلوم کیجئے۔ باقی فنی اصول سے جو اٹکل پچو حالات بیان کرتے ہیں، وہ ظنی چیزیں ہیں، کوئی قطعی چیز نہیں ہے۔ اس سے روک دیا گیا۔ اس لئے کہ یقین کا ذریعہ یا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آنکھ سے دیکھ لے یا مخبرِ اسلام صادق کی خبر ہوتی ہے۔ جو آنکھ سے زیادہ یقینی ہے، تو یا تو انبیاء علیہم السلام خبر دیں یا پھر آنکھ سے دیکھ لیں۔ باقی یہ کہ فلاں فلسفی یوں کہتا ہے، فلاں یوں کہتا ہے، یہ کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کہے گا تو ہم بھی اس کے مقابلے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری رائے دوسری ہے۔ تو رائے پر دین کا مدار تھوڑا ہی ہے۔ یہ چیز فنِ نجوم سے تعلق رکھتی ہے اور اسے ظنی کہا گیا ہے کہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ صحیح بھی ہو جاتی ہے، غلط بھی ہو جاتی ہے۔ قطعی بات وہی ہے جو اللہ و رسول فرمائیں یا پھر آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ آدمی کیوں مخمصہ میں پڑے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے کا حکم...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ ① دین کی جو بات بھی اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دیتے ہیں، وہ وحی ہوتی ہے، اس کا ماننا فرض ہے، اس میں اس چیز کی نفی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے بھی نہیں ہوتی تھی بہت سی چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی رائے بھی دی ہے جس کا تعلق وحی سے نہیں تھا۔ بہت سی تدابیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عقلی طور پر بتلائی ہیں بہت سے مشورے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر دیئے ہیں۔ اصول تو یہ ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے فرمائیں وہ واجب العقیدہ ہے۔ ماننا فرض ہے اور جو رائے سے فرمائیں اس کا ماننا فرض نہیں ہے، یہ الگ چیز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور محبت کی وجہ سے آپ اسے بھی حکم ہی سمجھیں لیکن قانوناً اس کا ماننا واجب نہیں ہے۔

اس رائے پر عمل نہ کرنا یہ تو ممکن ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ رائے معاذ اللہ غلط تھی، یہ بے ادبی ہے۔ اس سے بچنا لازمی ہے، ماننا نہ ماننا اختیاری ہے۔ لیکن تنقید، توہین یا تنقیص، وہ کسی طرح سے جائز نہیں خواہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہی ہو، وہ بھی عظمت کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے۔

جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باندی تھیں، ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے تھا۔ خاوند بیوی میں موافقت ہوتی نہیں تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں آزاد کر دیا اور مسئلہ یہ ہے کہ منکوحہ باندی آزاد ہو تو نکاح اس کے قبضے میں آ جاتا ہے چاہے نکاح باقی رکھے چاہے فسخ کر دے۔ مناسبت تھی نہیں، بریرہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ میں نکاح فسخ کروں اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ ان کے سوجان سے

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳، ۴.

عاشق تھے، وہ جگہ جگہ روتے پھرتے کہ نکاح فسخ نہ کرے مگر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہ نے نہیں مانا۔ اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یارسول اللہ! آپ ہی نے نکاح کیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بریرہ کو حکم دیں کہ نکاح فسخ نہ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ اے بریرہ! نکاح فسخ نہ کرو۔ وہ بہت ذہین تھیں، انہوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کی ذاتی رائے؟ فرمایا! حکم شرعی نہیں۔ مشورہ ہے عرض کیا۔ میں تو نہیں مانتی۔ چناں چہ نکاح فسخ کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے پیش کریں تو ماننے نہ ماننے میں آدمی مختار رہتا ہے۔ ایک ہے محبت کا تقاضا، رائے کو بھی آپ حکم کے درجے میں مانیں مگر قانوناً ماننا لازم نہیں۔ ①

تمدنی چیز کے بارے میں آپ کی رائے کا حکم ...... بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کی باتیں ثابت ہیں۔ مشورے اور ذاتی رائے بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ظاہر بھی فرمایا۔ حدیث میں ارشاد ہے: ''أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ'' ② مجھے بھی ایسے بھول چوک ہوتی ہے۔ جیسے تمہیں ہوتی ہے، میری ذاتی رائے میں تو آپ مختار ہیں لیکن وحیِ خداوندی سے جو کہوں گا. وہ قطعی ہے۔ اس میں غلطی ناممکن ہے۔ اس کا ماننا فرض ہے۔ جیسے ''تابیرِ نخل'' کے بارے میں عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ پیوند لگاتے تھے۔ اور انہوں نے نر و مادّہ سمجھ رکھے تھے۔ اور جب پیوند لگاتے تھے تو پھل آتا تھا۔ پیوند نہ لگائیں تو پھل نہیں آتا تھا۔ آپ نے خیال فرمایا کہ یہ کوئی عقیدہ ہے جو انہوں نے جما رکھا ہے کہ یہ نر ہے یہ مادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قلم مت لگاؤ۔ اس کے بعد پھل نہ آیا۔ عرض کیا گیا۔ یارسول اللہ! اس دفعہ تو پھل نہیں آیا؟

تب معلوم ہوا کہ معاشرے کی ایک تمدّنی چیز ہے کہ درخت کو درخت سے ملا کر جو قلم باندھتے ہیں تو پھل پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسبابِ حسّیہ میں سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ......'' ③ بھائی! یہ دنیوی معاملہ ہے۔ تم اس میں زیادہ بصیرت رکھتے ہو۔ جو مناسب سمجھو کر لیا کرو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی ٹوٹکا یا عقیدہ ہے۔ معلوم ہوا عقیدہ نہیں بلکہ یہ حسی اسباب میں سے ایک چیز ہے، اس لئے اجازت دے دی۔ غرض ایک انبیاء علیہم السلام کی رائے اور ذاتی مشورہ ہے، اس میں انسان ماننے نہ ماننے میں مختار ہے۔ اور ایک ہے حکمِ شرعی۔ جو وحی سے ہوتا ہے۔ وہ واجب الاطاعت ہے۔ تو بعض دفعہ انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے سے بھی عمل فرماتے ہیں مگر جب وحی روک دیتی ہے، رک جاتے ہیں۔

نبوّت، مجموعۂ بشریّت وملکیّت ...... انبیاء علیہم السلام میں ایک حیثیت بشریّت کی ہے اور ایک ملکیّت کی۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی فی زوج بریرة . ج:١٦، ص: ٣٣٢.

② الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوة ،باب السھو فی الصلوة ص: ٢٧٦،رقم: ١٢٧٤ .

③ الصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا دون ماذکره من معایش الدنیا،ص:١٠٩٣، رقم: ٢١٢٦.

بشریت میں جو عوارض بشر پر آتے ہیں، ان پر بھی آتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت ومرض وغیرہ۔ اور ایک ملکیت ہے کہ حق تعالیٰ وحی اتاریں، اپنا مقرب بنالیں، وہاں انبیاء علیہم السلام فرشتوں سے بھی بالاتر ہیں کہ فرشتوں کا بھی وہ مقام نہیں، ان دونوں مقاموں کو فرمایا گیا کہ:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ ① میں تمہارے جیسا بشر ہوں، ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ نبوت کی عظمت ہے۔ ایک بشری حیثیت ہے۔ ایک نبوت کی حیثیت ہے۔ بشری حیثیت میں سب لوازم بشریت ان پر آتے ہیں اور ملکیت کی حیثیت میں وحیء خداوندی آتی ہے۔ اور وہ مقربانِ الٰہی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بشریت کو تو لے لے اور یوحی الی کو نہ لے اور معاذ اللہ گستاخی کرنے لگے یہ عینِ کفر ہے۔ اور اگر کوئی شخص محض یوحیٰ الی کو لے لے اور بشریت کی نفی کر دے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں تھے۔ یہ بھی کفر ہے۔ درمیان میں بات ہے کہ بشر بھی مانے مگر عام بشروں جیسا بشر نہیں صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص بشر جس پر اللہ کی عنایات نازل ہیں، وحی ہے، معجزات ہیں۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں پیدائش کے لحاظ سے اور نبی ہیں عطائے خداوندی کے لحاظ سے، اس کی عظمت فرض ہوگی اور بشریت کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ماننا بھی فرض ہوگا۔ دونوں چیزیں ہیں۔

حدیثِ ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ..... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: ”قَالَ اَضَافَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْاَسْوَدَيْنِ التَّمْرِ وَ الْمَآءِ“ (اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ) ② ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ضیافت کی دو اسودین پر۔ کھجور اور پانی پر، کھجور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھا کر اُس مجھے کھلایا اور پانی پی کر مجھے پلایا اور یہ حدیث بیان فرمائی“۔ ”مَنْ اَضَافَ مُؤْمِنًا فَكَاَنَّمَا اَضَافَ اٰدَمَ.“ جس نے اخلاص کے ساتھ کسی ایک مومن کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے کسی نے حضرت آدم علیہ السلام کی ضیافت کی، اس پر جو اجر ملتا وہ اسے اجر ملے گا۔ آگے فرماتے ہیں۔ ”وَمَنْ اَضَافَ مُؤْمِنَيْنِ فَكَاَنَّمَا اَضَافَ اٰدَمَ وَحَوَّآءَ.“ ”جس نے دو مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے آدم وحوا علیہما السلام دونوں کی ضیافت کی“۔

اس کے بعد فرمایا جس نے تین مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسا جبریل ومیکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کو مہمان بنایا۔ اور جس نے چار کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کریم کو پڑھ لیا، یہ کتابیں پڑھنے پر اس کو جو اجر ملتا۔ اس نوعیت کا اجر اس کو ملے گا۔ جس نے پانچ آدمیوں کی مہمانی کی وہ ایسا ہے جیسے اس شخص کو اجر ملتا جو اوّلِ خلق سے برابر جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھتا رہا۔ ہزاروں برس نماز پڑھنے پر جو اجر مرتب ہوتا، وہ اجر پانچ آدمیوں کی دعوت کرنے پر ملے گا۔

اس کے بعد فرمایا جس نے چھ آدمیوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے اولادِ اسماعیل میں سے چھ غلام شدہ

① پارہ: ۱۶ سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۱۰. ② الحدیث اخرجہ علی المتقی الھندی، وضعفہ، کنز العمال، ج: ۹ ص: ۲۶۹.

انسانوں کو آزاد کر دیا۔ جس نے سات آدمیوں کی دعوت کی تو گویا جہنم کے سات دروازے اس پر بند کر دیئے گئے۔ گویا اس کا جہنم میں داخلہ نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اجر مرتب ہوا۔ اور جس نے آٹھ آدمیوں کی ضیافت کی، اس کے لئے گویا جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے اور جس نے نو آدمیوں کی دعوت کی وہ ایسا ہے جیسے اوّلِ خلق سے گناہ گاروں سے جتنے گناہ ہوئے ہیں، اس نے اتنے اجر کما لئے گناہوں کی قید اس لئے لگائی کہ نیکیاں کرنے والے کم ہوتے ہیں، گناہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ تو مبالغہ اسی میں تھا۔ اور فرمایا جس نے دس کی ضیافت کی تو حق تعالیٰ اس کے لئے ان لوگوں کا اجر لکھیں گے جنہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، حج کیا، عمرہ کیا اور قیامت تک کرتے رہیں گے، اتنا عظیم اجر دیا جائے گا۔

گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ: مسلمانوں میں باہمی تعاون اور باہمی امداد اور اعانت کا جذبہ پیدا ہو۔ ایک ہے خود تنہا نماز پڑھ لینا، وہ سب اپنے لئے ہے۔ گویا نماز پڑھ کر اپنی نجات کمالی، اور ایک مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کا سامان کیا جس سے پوری امت میں قوت پڑتی ہے۔ اس کے اسباب میں سے بھی ہے کہ ضیافت و مہمانداری بھی ہو۔ تعاون اور ایک دوسرے سے ہمدردی ہو۔ جیسے کہ فرمایا گیا: ''وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ۔'' ① اللہ اپنے بندے کی مدد پر رہتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے۔ تو نماز تو ذاتی فعل ہے اور دوسرے کی مدد کرنے کا تعلق امت سے ہے اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت پیدا ہو۔ تفریق کی بجائے اتحاد باہمی ہو۔ جس سے قوت پیدا ہو۔ اعداء اللہ مغلوب ہوں، دین کا کلمہ بلند ہو۔ اس واسطے اس عمل کی زیادہ قدر و قیمت بیان کی گئی۔ ورنہ بظاہر دیکھنے میں سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے حج کیا، عمرہ کیا اور ایک نے دس آدمیوں کو کھانا کھلا دیا۔ بظاہر تو بڑی بات نہ تھی لیکن اگر بنیاد پر نظر ڈالی جائے تو ہزار نمازیں بھی پڑھے گا تو اس کی ذات کے لئے ہیں۔ مہمانداری، تعاون اور ہمدردی کرے گا، اس سے امت میں اجتماعیتِ عامہ پھیلے گی اور مقصودِ شریعت سے یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت، باہمی اخوت رہے تا کہ اعداء اللہ ضعیف ہوں اور ان کے سامنے قانونِ الٰہی پیش کیا جا سکے، اور اگر خدانخواستہ اعداء اللہ غالب آ جائیں تو وہ اپنا کلمہ آپ کے سامنے پیش کریں گے، آپ کا کلمہ تھوڑا سنیں گے قوت کی وجہ سے آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے۔ تعاون تناصر اور باہمی قوت کا اثر پوری امۃ تک پہنچتا ہے۔ اور حج و عمرہ کا اثر ایک آدمی کی ذات تک پہنچتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا عمل ہو۔ اس واسطے اس اجر کو بڑھایا گیا، اگر ایک آدمی نے ہزار حج کئے لیکن ایک کام ایسا کیا کہ اس سے امت مل گئی، اس کا اجر ہزار حج سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ مقصود اجتماعیت ہے۔ اس واسطے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ کھانا کھلانا کیسے بڑھ گیا؟

غرض یہ حدیثِ ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مذکور ہے کہ کھجور کھا کر باقی انہیں کھلائی اور پانی پی کر بقیہ انہیں پلایا۔ پھر حدیث بیان فرمائی۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر و الدعا، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر، ص: ۱۱۴۷، رقم: ۶۸۵۳۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آپ میری ضیافت کریں اور یہ حدیث مجھے سنائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی ضیافت کی، کھجور کھلائی۔ پانی پلایا اور حدیث بیان کی۔ آگے شاگرد در شاگرد مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلہ پہنچ گیا۔ تو مولانا عبدالقیوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی ضیافت کی کھجور کھا کر انہیں کھلائی اور پانی پلایا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میرے ساتھ یہی معاملہ کیا کہ کھجور کھا کے اُلس کھلایا اور پانی پی کر پلایا اور یہ حدیث سنائی اور اس کی اجازت دی۔

اب یہ دو حدیثیں ہوگئیں۔ ایک مسلسل بالمصافحہ اور ایک مسلسل بالماء والتمر۔ قولی طور پر آپ نے حدیث سن لی، اب عملی حصہ رہ گیا کہ ہر شخص جس کو اجازت دی جائے اس سے مصافحہ کیا جائے اور کھجور کھا کر کھلائی جائے اور پانی پی کر پلایا جائے۔ اب یہاں اتنے آدمی ہیں کہ اتنی کھجوریں تو میں نہیں کھا سکتا کہ آدھی کھا کر انہیں کھلاؤں۔ اس واسطے ایک آدھ کھجور کھا کے میں ان کھجوروں میں شامل کردوں گا، اس سے انشاء اللہ برکات شامل ہوں گی۔ پانی پی کر جگ میں ڈال دوں گا، اس میں سے سب حضرات پی لیں۔ ورنہ ہر گلاس میں سے ایک ایک گھونٹ پیوں تو پچاس گھونٹ میں معلوم نہیں پیٹ کہاں پہنچے گا۔

اسلام کا نظام اجتماعیت ...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ“ ① اسلام نہیں ہے مگر اجتماعیت کے ساتھ۔ اسلام نام ہی اجتماعیت کا ہے۔ اسی واسطے کوئی عبادت ایسی نہیں جس میں اجتماعیت نہ ہو۔ نماز رکھی تو اس میں امام رکھا۔ اقتدار رکھی۔ اجتماع رکھا۔ تا کہ مل کر نماز ادا کریں۔ اسی طرح اگر زکوٰۃ رکھی۔ تو اس میں اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہو تو اسے بیت المال میں داخل کیا جائے۔ وہ عام غرباء میں اس کو تقسیم کرے۔ تا کہ پوری امت تک اس کا اثر پہنچے۔ اب حکومت اسلامی نہیں ہے تو علماء اور اہلِ فتویٰ کو اس کا قائم مقام بنادیا گیا تا کہ ان کے فتویٰ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

اسی طرح حج ہے تو وہ بھی اجتماعیت کا نام ہے۔ اس میں بھی امام ہے۔ اور امام کے اشاروں پر سب حج کے افعال ادا ہوتے ہیں جہاد ہے، اس میں امام وامیر رکھا گیا، جب تک وہ حکم نہ دے نہ آپ آگے بڑھ سکتے ہیں نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے عام گھروں کے اندر فرمایا گیا کہ: ”كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِه.“ ② تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا بادشاہ ہے۔ اسی سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعایا (گھر والوں) کا کس طرح سے بندوبست کیا، ان کی تربیت شرعی کی تھی یا نہیں؟ یہاں بھی اجتماعیت قائم کردی۔

اسی طرح سفر میں جائے تو اس بات کو سنت قرار دیا کہ چند آدمی ایک امیر بنالیں، اس کے احکام پر عمل کریں تا کہ سفر نظم کے ساتھ ہو۔ غرض اسلام نے ہر چیز میں نظم رکھا، تنظیم واجتماعیت رکھی ہے۔ اس لئے فرمایا: ”لَا اِسْلَامَ

① هذا من قول عمرؓ: السنن للدارمي، المقدمة، باب ذهاب العلم، ج: ١، ص: ٢٨٣، رقم: ٢٥٧.

② الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب في القرى والمدن، ص: ٧٠، رقم: ٨٩٣.

اِلَّابِالْجَمَاعَةِ." اسلام بن نہیں سکتا جب تک جماعتی رنگ نہ غالب آ جائے۔ جتنی چیزیں اجتماعیت سے متعلق ہیں ان کے اجر کو انفرادی عبادتوں سے زیادہ بڑھا دیا گیا ہے تا کہ پوری جماعت اس کی لپیٹ میں آ جائے۔

منصب افتاء کی نزاکت ...... بہت سی جزئیات ایک دوسرے کے مشابہہ ہوتی ہیں اور احکام جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس کے الگ اور اُس کے الگ۔ مفتی پہچان سکتا ہے کہ ان جزئیات میں کون سا باریک فرق ہے جو ان دونوں کا حکم الگ الگ ہو گیا ہے، چوں کہ مفتی کے سامنے تمام جزئیات ہوتی ہیں اور فن سے واقف ہیں تو جزئیات میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا اور عمل کے طور پر مسئلہ بتلانا ہے۔ ہر پڑھا لکھا بلکہ ہر مدرّس بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ یہ بصیرت دیتے ہیں۔ اسی لئے بزرگوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ فتویٰ دینے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا تو بتلا دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسئلہ غلط بتلا دیا گیا۔ سخت پریشان، گرمی اور بارش میں سارے شہر میں اسے ڈھونڈتے پھرے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شخص رات کو ملا۔ تب اس سے کہا کہ بھائی! میں نے مسئلہ غلط بتلایا تھا اصل مسئلہ یہ ہے، جب جا کے انہیں تسلی ہوئی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے یہاں رسالہ "النور" میں ایک مستقل باب "ترجیح الراجح" تھا۔ اگر کسی مسئلہ کے بیان میں کوئی غلطی ہوئی تو شائع کرتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، حکم یہ ہے اور یہی راجح ہے۔ لوگ اسی پر عمل کریں۔ بہر حال سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا ہے۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ ہر مدرس یا ہر عالم کا کام نہیں ہے۔

منصبِ تدریس وتبلیغ ...... اس سے زیادہ آسان درس دینا ہے۔ درس میں کتاب سامنے ہوتی ہے، کتاب کے مطابق مضمون بیان کر دیا، کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی، اس سے زیادہ آسان تقریر کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایک موضوع پر جو یاد تھا، علمی طور پر کہہ دیا۔ اور اس سے زیادہ آسان ہے وہ تقریر جو علمی نہ ہو۔ محض دنیاداری کی باتیں۔ اِدھر اُدھر کے واقعات لیکچر میں کہہ دیئے، یہ سب سے زیادہ آسان ہے۔ گزرے ہوئے واقعات یوں ہوا تھا، یوں ہوا تھا۔ بیان کر دیا، اور اس سے بھی زیادہ آسان اعتراض کر دینا ہے۔ اس کے لئے کسی تکلیف کی ضرورت نہیں، جس پر چاہا اعتراض کر دیا، جس پہ چاہا شبہ وارد کر دیا۔ جاہل سے جاہل اعتراض کر سکتا ہے۔ اس میں کسی علمیت کی ضرورت نہیں۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ بعض حضرات مسائل پوچھتے ہیں۔ میں عرض کر دیتا ہوں کہ بھئی مفتی صاحب سے پوچھو۔ میں نہیں بتلا سکتا۔ مسئلہ کا علم بھی ہو تب بھی جرات نہیں ہوتی کہ مسئلہ بیان کر دوں۔ مفتی کے سامنے سب چیزیں مستحضر ہوتی ہیں۔ بعض لوگ برا مانتے ہیں کہ مسئلہ نہیں بتلایا۔ اگر چہ مسئلہ نہیں بتلایا مگر حوالہ تو دے دیا کہ مفتی سے پوچھو۔ کیا ضروری ہے کہ ہر ایک مسئلہ بتلائے ہی۔ جو بتانے والے ہیں وہ بتلائیں گے، جن کو اس کا فن اور سلیقہ ہے۔ برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اس سے بچتا ہوں کہ فتویٰ دوں۔ یہ کام میرا نہیں ہے۔

علم وعمل کا امتیاز ...... ایک ہے کسی مسئلہ کی علمی تحقیق کر دینا، وہ الگ چیز ہے، اس سے انکار نہیں ہوتا، جو اپنے

ذہن میں ہو وہ تحقیق کردی۔ لیکن یہ کہ عمل کیا کرو؟ یہ کام مفتی کا ہے وہ فتویٰ دے گا کہ فلاں پہلو پر یوں عمل کرو، فلاں پہلو پر یوں عمل کرو۔ اس لئے اگر بعض حضرات سوال کریں اور میں مسئلہ نہ بتلاؤں، وہ برا نہ مانیں۔ ضروری نہیں کہ مجھے مسئلہ کا علم بھی ہو۔ اور اگر علم بھی ہو تو میں احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ فقہی جزئیات پر میری زیادہ نظر نہیں ہے۔ یہ اس کی ہو سکتی ہے جو رات دن اسی میں پڑا ہوا ہو۔ یہ میں نے بطور تنبیہ اور اصول کے عرض کر دیا۔ اس میں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کا ایک مقام ہوتا ہے۔ میں نہیں ہوں اس قابل کہ مسئلہ بتلاؤں۔ کیا ضرورت ہے زبردستی پوچھا ہی جائے، کسی اہل سے پوچھا جائے۔

حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اجماعی مسئلہ ہے...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا لوگ انکار کیوں کرتے ہیں؟ میرے خیال میں اجمالاً اتنی بات ہے کہ "حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا مسئلہ تو مجمع علیہ ہے۔ یعنی امّت کے اندر کوئی بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ اس کی کیفیت میں گفتگو ہے کہ حیات ہے تو کس کیفیت اور کس نوعیت کی ہے۔ تو کیفیات میں اگر کوئی اختلاف کرے تو اس کو اصل مسئلہ میں اختلاف کنندہ نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں تک انبیاء علیہم السلام کی حیات کا تعلق ہے تو صحیح حدیث موجود ہے۔ "اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ" ① "انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں"۔ یا فرمایا گیا: "وَنَبِیُّ اللّٰهِ حَیٌّ یُّرْزَقُ." ② اللہ کے نبی زندہ ہیں۔ ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس حیات سے مراد اگر وہ عمومی حیات ہے جو برزخ میں عام طور پر ہوتی ہے تو پھر اس تخصیص ذکری کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی پھر یہ کہنا کہ "نَبِیُّ اللّٰهِ حَیٌّ یا اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ" اس کی ضرورت نہیں۔ یوں کہا جا سکتا تھا۔ "اَلْمُسْلِمُوْنَ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یااَلنَّاسُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ......" اس لئے کہ حیات برزخی میں سب کے سب شریک ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص کیا جانا اور اس پر حیات کا لفظ بولا جانا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی حیات ہے جو عوام کو حاصل نہیں۔

حیاتِ کامل...... پھر یہ کہ "حیات" کے لفظ کو مقید کر کے نہیں لایا گیا، یہ نہیں کہا گیا کہ انبیاء علیہم السلام بحیثیت اس کے حیات ہیں۔ یا فلاں جہت سے حیات ہیں بلکہ مطلقاً حی کہا گیا، تو جب بھی کوئی چیز مطلق بولی جائی گی، اس کا فرد کامل مراد لیا جائے گا پھر فرد کامل کی صورت سمجھنے کی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم جسے دنیا میں زندگی کہتے ہیں وہی وہاں سمجھیں کہ وہ حی اور زندہ ہیں اور وہ اسی انداز کی زندگی ہے جیسے دنیا میں زندہ ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص اور حیات کے لفظ کا اطلاق۔ تو ایک تخصیص اور ایک اطلاق، تخصیص ذکر کی اور خصوصیتِ بیانی اور لفظِ حیات کا اطلاق۔ یہ دونوں مل کر یہ نتیجہ پیدا کرتے ہیں کہ کوئی خاص اور اعلیٰ قسم کی حیات ہے

① مسند ابی یعلی، ثابت البنانی عن انس، ج: ۷ ص: ۴۴۵. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للهیثمی، ج:۸، ص: ۱۴۴.

② السنن لابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاته ودفنه، ص: ۲۵۷۵، رقم: ۱۶۳۷.

جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ اب یہ کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟

قبضِ روح کا امتیاز..... تو ہم کیفیت سے واقف نہیں۔ نہ ہم اس کا پتہ دے سکتے ہیں۔ نہ ہمارے بس کی بات ہے۔ اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی ممات بھی ہماری جیسی نہیں، ان کی حیات بھی ہماری جیسی نہیں، ان کی ممات میں تو یہ بھی ہے کہ ملک الموت آ کر ان سے اجازت لیتے ہیں اور جب تک وہ اجازت نہ دیں اور ان کے علم میں نہ لایا جائے کہ وقت آ رہا ہے اور ہم قبضِ روح کے لئے آ رہے ہیں۔ اس وقت تک ممات کا آغاز نہیں کیا جاتا۔ عامۃ المؤمنین سے اس قسم کی کوئی اجازت یا استیذان نہیں کیا جاتا۔

دستِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... پھر یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں جو حیات ہے تو وہ اور لوگوں کی جو دنیوی حیات ہے، اس کے مشابہ نہیں۔ تو جب حیات مشابہ نہیں تو ممات بھی مشابہ نہیں ہوسکتی۔ یوں تو فرمایا گیا ﴿اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ① میں تم جیسا ایک بشر ہوں۔ لیکن اس مماثلت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور ہماری بشریت میں کتنا فرق ہے۔ یہ سیرت کے احوال دیکھنے سے واضح ہوگا۔ ہم بھی کہیں گے کہ ہمارے ہاتھ ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے بھی ہاتھ ہوتے ہیں اور جسمانی ہوتے ہیں کہ کوئی معنوی اور روحانی نہیں۔ لیکن ہاتھوں کے اندر خصوصیت سے امتیازی شان موجود ہے جو عام ہاتھوں کو حاصل نہیں۔ ہم اگر کسی کے چپت ماردیں تو چوٹ لگ جائے گی۔ انبیاء علیہم السلام اگر کسی کے چپت مارتے ہیں تو چوٹ لگے یا نہ لگے، لیکن اس سے معنوی حیات پیدا ہوجاتی ہے۔ ہم اگر آپ کے سینے میں ہاتھ ماردیں تو آپ چوٹ کھائیں گے اور ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا تو ان کو شرحِ صدر نصیب ہوگیا اور ان کے سامنے آسمانوں تک کی چیزیں روشن ہوگئیں۔

جیسے کہ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: غالباً حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہ اپنے محلّے کے امام تھے، انہوں نے نماز پڑھائی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی قرأت سنی، تو انہوں نے اپنے قبیلے کے لغت پر قرآت کی۔ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ لغتِ قریش کی قراءت جانتے تھے۔ وہ تو ''اَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ'' ہیں۔ تو خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشکیں کس کے کھینچتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا۔ ''یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے اس منافق کی گردن قلم کردوں، اس لئے کہ یہ قرآن کریم غلط پڑھتا ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ پڑھو۔ انہوں نے وہ آیت اپنی لغت پر سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''هٰكَذَا اُنْزِلَتْ...... '' یوں ہی نازل ہوا ہے۔ ''اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ. '' ② سات لغت پر قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جس

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۱۱۰۔

② السنن للنسائی، کتاب الافتتاح، باب جامع ماجاء فی القرآن، ص: ۲۱۴۷، رقم ۹۳۹.

میں بنی تمیم، طے قریش وغیرہ کی لغات شامل ہیں۔ یہ جو عرب میں سات فصیح لغات ہیں، ان ساتوں میں پڑھنے کی اجازت تھی۔ اس میں لفظوں میں تغیر ہوتا تھا۔ معنی اور مفہوم میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا تھا۔ تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پڑھا فرمایا: ''ھٰکَذَا اُنْزِلَتْ.......'' ''یوں ہی نازل ہوا ہے''۔

اس سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سینے میں کچھ ریب اور شک کی سی کیفیت پیدا ہوئی کہ یہ کس قسم کا قرآن ہے۔ جس طرح جو پڑھے اسے کہہ دیا جاتا ہے ھکذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔ جیسے شبہ یا وسوسہ پیش آتا ہے۔ ایسی کیفیت پیدا ہوئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''یَا ابْنَ الْخَطَّابِ!'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ سینے پر ہاتھ لگتے ہی اتنا عظیم شرح صدر ہوا گویا آسمان میرے اوپر روشن ہوگئے۔ اور وہ جو ریب وشک اور وساوس گزر رہے تھے وہ قطعاً ختم ہوگئے۔ تو میں اور آپ کسی کے ماردیں تو چوٹ لگے گی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ مارا تو شرحِ صدر کی دولت نصیب ہوگئی۔ ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ '' بھی صحیح ہے۔ لیکن یہ مماثلت نوعیت کے اندر ہے۔ مگر شخصی فرق وہ اتنا ہے کہ ہاتھوں تک میں نمایاں ہے۔ ①

لسانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... میری اور آپ کی زبان گوشت پوست کی ہے، انبیاء علیہم السلام کی زبان بھی گوشت پوست کی ہوتی ہے۔ لیکن میں اگر کوئی غذا کھاؤں تو اس سے کھٹے اور میٹھے کا پتہ چل جائے گا۔ جو ایک مادّی ذوق ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تناول فرماتے تھے تو زبان حلال وحرام کا بھی پتہ چلا لیتی تھی۔ حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ انصار میں کہیں میت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنازے میں تشریف لے گئے۔ جب دفن سے فارغ ہوئے تو میت کے وارثوں نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ! ہمارے گھر جا کر کچھ تناول فرمالیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا، تشریف لائے، گوشت لا کے رکھا گیا اور لوگ بھی کھانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چکھا۔ اور ارشاد فرمایا یہ غصب کا مال معلوم ہوتا ہے۔ بات یوں کھلی کہ جس نے دعوت دی تھی اس عورت نے کہا، میں نے خاوند کو بھیجا کہ فلاں جگہ سے جا کر بکری خرید لا، تا کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کروں۔ لیکن وہاں سے بکری دستیاب نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد میں نے ایک پڑوسی کے پاس دام بھیجے کہ تو خرید کر لا۔ اس کو بھی دستیاب نہ ہوسکی۔ تو میں نے پڑوسی کی بیوی سے کہا کہ تو کہیں سے بکری لا دے۔ اس نے خاوند کی بکری جو اس کی ملک تھی، پکڑ کر بلا اجازت بھیج دی۔ میں نے ذبح کر کے پکا دی، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک نے پہچانا کہ مال مغصوبہ ہے۔ جو بلا اجازت کے ذبح کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ''قیدیوں کو کھلا دو، ہم یہ کھانا نہیں کھائیں گے''۔

تو زبان کے اندر مماثلت بھی ہے یعنی گوشت پوست اور مادّی ہونے میں، اور عدم مماثلت بھی ہے اس چیز میں کہ ہماری زبان فقط حاسۂ ذوق رکھتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک ذوق کے ساتھ ساتھ حاسۂ

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب من لم یر بأسا أن یقول......ص: ۲۳۶، رقم: ۵۰۴۱.

معنویّت بھی رکھتی ہے جس سے حلّت وحرمت، جائز وناجائز یا افضل وغیر افضل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تو مماثلت بھی ہے مگر مماثلت کے ساتھ عدمِ مثلیت بھی ہے۔

صومِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ......'' میں تم جیسا ایک بشر ہوں لیکن حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امت کو صوم وصال رکھنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی کہ بلا افطار روزہ مت رکھو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ پر روزہ رکھتے چلے جاتے، متعدد روزے رکھتے۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی اور خود آپ رکھتے ہیں''۔ فرماتے ہیں: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ. ''① تم میں مجھ جیسا کون ہیں۔ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے، تو آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے۔ ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ...... ''میں تم جیسا بشر ہوں اور حدیث بالا میں فرماتے ہیں: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ '' تم میں مجھ جیسا کون اور کون میرا مثل ہے۔ میرے ساتھ پروردگار کا دوسرا معاملہ ہے تو مماثلت بھی ہے اور عدمِ مماثلت بھی ہے۔ مماثلت بھی ہے اور امتیازی شانیں ہر ہر عضو کے اندر بھی ہیں۔

چشمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... میری اور آپ کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مادّی آنکھ ہے، شکلیں، صورتیں ہمیں نظر پڑتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مادّی آنکھ دی گئی۔ لیکن حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نماز میں بعض لوگوں سے کچھ غلطیاں ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا۔ اور فرمایا: ''اِنِّیْ اَرٰی خَلْفِیْ کَمَا اَرٰی بَیْنَ یَدَیَّ...... '' تم یہ سمجھتے ہو میں دیکھتا نہیں۔ میں پشت کی جانب سے دیکھتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بینائی دو طرف کام کرتی تھی پیچھے سے بھی دیکھتی ہے اور آگے سے بھی دیکھتی ہے۔ تو آنکھ آنکھ ہونے میں تو مماثلت ہے مگر آنکھ کی خصوصیات میں کوئی مماثلت نہیں۔ پیغمبر کی آنکھ دوسری ہے، امتی کی آنکھ دوسری ہے۔

حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... اسی طرح جب ایک ایک جز اور زندگی کے ایک ایک شعبے میں مماثلت کے دعوے کے ساتھ عدمِ مماثلت اور امتیازی شان بھی موجود ہے۔ تو اگر ہم یوں کہیں کہ مجموعۂ حیات میں بے شک مماثلت ہے کہ ہم بھی زندہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو خصوصیات ہیں وہ ہمیں میسّر نہیں۔ تو یہ ہم کہہ سکتے ہیں کیوں کہ زندگی کی ایک ایک جزئی میں امتیازی شان موجود ہے۔

حیات بعد الوفات کا امتیاز...... اسی طرح سے ممات کے بارے میں بھی ہم کہیں گے کہ ممات اور موت کے بعد جو حیات آتی ہے اس میں بظاہر مماثلت ہے لیکن پھر امتیازات ہیں، مرنے کے بعد ہمیں وہ حیات میسر نہیں آسکتی جو انبیاء علیہم السلام کو برزخ کی حیات میسّر آتی ہے۔

علاماتِ حیات...... اور اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ حیات اور زندگی کو پہچاننے کے لئے دو چیزیں ہیں جس سے آدمی

① الصحیح للبخاری، کتاب المحاربین، باب کم التعزیر والادب، ص: ۵۷۱ رقم: ۶۸۵۱.

پہچانا جاتا ہے کہ آدمی زندہ ہے۔ یعنی حسّی زندگی، ایک تو معنوی زندگی ہے کہ روح موجود ہے، وہ تو ہر انسان کو حاصل ہے، جس کی روح موجود ہے، بس وہ زندہ ہے اور روح کسی کی بھی مردہ نہیں۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے۔ یعنی ہمیشہ سے تو نہیں تھا، پیدا کیا گیا، لیکن پیدا ہونے کے بعد اب مٹے گا نہیں بلکہ وہ زندہ رہے گا، اس کی حقیقت اور روح قائم رہے گی، چولے اور جسم بدل جائیں گے مگر اصل نفس قائم رہے گا۔ تو زندگی کے پہچاننے کی دو ہی علامتیں ہیں ایک کھانا پینا، کھاتا پیتا دیکھ کر ہم کھلے بندوں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی زندہ ہے، اور جس کا کھانا پینا بالکل چھوٹ جائے تو ہم یہی کہا کرتے ہیں کہ بھائی! اس کی زندگی کیا، یہ تو عنقریب مرنے والا ہے، اس لئے کہ اس کی زندگی کے اسباب جب مفقود ہو گئے تو زندگی کیا رہے گی، آج مر جائے، تو کھانا حسی اسباب میں بقائے حیات کی علامت ہے۔

دوسری علامت زندگی کی یہ ہے کہ ہم نقل وحرکت دیکھیں۔ اگر ایک شخص بے حس وحرکت پڑا ہوا ہے۔ ہم اوّل وہلہ میں یہی سمجھیں گے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن اگر وہ ہل رہا ہے، حرکت کر رہا ہے، چلتا ہے پھرتا ہے، کبھی یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے کہ یہ میّت ہے، اس لئے نقل وحرکت زندگی کی بڑی علامتوں میں سے علامت ہے۔ تو زندگی کی دو علامتیں ہوئیں۔ ایک خورد ونوش، کھانا اور پینا، ایک نقل وحرکت چلنا پھرنا، یعنی مختلف افعال کا سرزد ہونا جو حرکت کی علامت ہے اور یہ زندگی کی علامت ہے۔

اب دیکھئے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا: "اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ." انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں حیات ہیں۔ کیوں حیات ہیں؟ اس کی علامت بتلائی گئی کہ نقل وحرکت پائی جاتی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ تو ایک نقل وحرکت مادی ہے کہ ہم ترکاری خریدنے کے لئے بازار میں جائیں یا پڑھنے کے لئے کسی مدرسے میں جائیں، یہ مادّی حرکت ہے اور نماز پڑھنے لگیں، حرکت یہ بھی ہے مگر یہ روحانی عباداتی حرکت کہی جائے گی جو بازار میں جانے کی حرکت سے یقیناً افضل حرکت ہے۔ اور جو کھانے پینے کی حرکت سے یقیناً افضل ہے، کہ اللہ کے آگے جھک رہے ہیں۔ تو اس حدیث نے ثابت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں، اس لئے کہ حرکت بدن حیات کے آثار میں سے ہے۔ تو حرکت وہ ہے جو کامل ترین حرکت ہے، تو عباداتی حرکت ثابت ہوئی، محض کھانے پینے کی حرکت ثابت نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ: "کَاَنِّیْ اَنْظُرُ مُوْسٰی یُلَبِّیْ." ① میں موسیٰ علیہ اسلام کو دیکھتا ہوں کہ "لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ" کہتے ہوئے میدانِ عرفات میں جا رہے ہیں تو انبیاء علیہم السلام گویا حج کرتے ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھتا ہوں کہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اور اون اور صوف کی لگام ہاتھ میں ہے اور "لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ" پڑھتے ہوئے جا رہے ہیں اور حج کر رہے ہیں۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول. ص: ۷۰۷، رقم ۳۲۱.

حدیث میں ہے کہ مطاف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص طواف کررہے ہیں: ''مَرْبُوْعُ الْخَلْقِ ''یعنی چوڑے چکلے بدن ان کا سینہ نہایت چوڑا اور اس قدر خوبصورت اور اتنا شاداب رنگ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''کَاَنَّہٗ خَرَجَ مِنْ دِیْمَاسٍ...... '' کہ یہ شخص ابھی غسل کرکے حمام سے آیا ہے اور گویا پانی اس کے بالوں سے ٹپک پڑے گا، تو اتنی تروتازہ اور شاداب صورت، چوڑے بدن، میانہ اور ذرا پستی مائل قدر اور طواف میں مشغول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہے؟'' عرض کیا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں''۔ ①

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طواف کرتے ہوئے دیکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ'' پڑھتے ہوئے دیکھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو سرخ اونٹنی پر دیکھا کہ ''لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ ''پڑھتے ہو جارہے ہیں۔ اور عام طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ .'' انبیاء اپنی قبور میں سب زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں۔ تو نماز بھی ثابت ہوئی، حج بھی ثابت ہوا۔ تو بدن کی نقل وحرکت ثابت ہوئی اور وہ حرکت جو عباداتی حرکت ہے، محض آنے جانے کی حرکت نہیں، اس سے کہیں مکمل عباداتی حرکت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: وَنَبِیُّ اللّٰہِ یُرْزَقُ. اللہ کا نبی زندہ ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ تو رزق کا دیا جانا خود دلیلِ حیات ہے کیوں کہ کھانا پینا دوسری علامت ہے، اب یہ کہ وہ رزق کیسا ہے؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس انداز کا تھا، اس کی کیا کیفیت تھی؟ اس میں پلاؤ زردہ؟ یہ اللہ جانے۔ لیکن رزق بتلایا گیا۔ تو رزق تناول کی چیز ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام گویا تناول بھی کرتے ہیں اور حرکاتِ بدنی بھی ہوتی ہیں۔ تو جیسے حرکات بدنی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں، جو عباداتی حرکت ہیں، ممکن ہے کھانا پینا اعلیٰ ہی قسم کا ہو جو جنّت کی غذا ہو۔ اس دنیا کی مادی غذا نہ ہو۔ تو جب نقل وحرکت بھی ثابت، خورد ونوش اور غذا بھی ثابت ہو تو اب حیات میں کوئی تامل باقی نہیں رہتا، کیوں کہ آثار میں سے یہی دو چیزیں ہیں جو موجود ہیں۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی حرکتِ بدن اور ان کی حیات ہے۔

حیاتِ شہداء...... اسی طرح سے قرآن کریم نے شہداء کی بھی حیات ثابت کی ہے۔ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ ② جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں انہیں مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ یعنی مردہ تو ہیں نہیں، تمہیں کہنے کی بھی اجازت نہیں کہ یہ ان کے حق میں بے ادبی ہے، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کی حیات کا شعور نہیں رکھتے۔ یعنی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے کہ کس کیفیت کی زندگی ہے۔ تو قرآن کریم میں شہداء کی زندگی ثابت کی گئی۔

اب کسوٹی پر جانچئے جو ہم نے عرض کی تھی کہ حیات کے پہچاننے کے دو طریقے ہیں، خورد ونوش اور نقل و

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم، ص: ۱۲۸۱، رقم: ۳۴۳۷۔

② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۴.

حرکت کرتے ہیں اور وہاں کی غذائیں کھاتے ہیں۔ تو رزق بھی دیا گیا اور نقل وحرکت بھی پائی گئی۔ مگر فرق کیا ہے۔؟ انبیاء علیہم السلام کی نقل وحرکت عباداتی تھی، معاشی نہیں تھی کہ کھانے پینے کے لئے جائیں، شہداء کی نقل و حرکت کھانے اور پینے کی ہے کہ جاؤ اور جنتوں میں جا کے چرو۔ انبیاء علیہم السلام کو ان کی غذا وہیں پہنچتی تھی، شہیدوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے جنتوں کے میدان میں جانا پڑے گا۔ اور چوں کہ بطور جزاء کے جنت میں بھیجا جا رہا اس واسطے پرندوں کا خول دیا گیا، ان کا اصلی بدن نہیں دیا گیا، وہ قیامت کو دیا جائے گا جب بطورِ جزاء کے ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا، تو دونوں چیزیں شہداء کے حق میں بھی ثابت ہوئیں، نقل وحرکت بھی اور خورد و نوش بھی۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں معاشی نقل وحرکت نہیں تھی بلکہ عباداتی تھی، یہاں معاشی نقل وحرکت ہے کہ کھانے پینے کے لئے جائیں وہاں انبیاء علیہم السلام کے پاس رزق پہنچتا تھا، شہداء کے پاس رزق نہیں پہنچتا، رزق کے پاس انہیں پہنچنا پڑتا ہے، چوں کہ انہیں جانا پڑتا ہے تو یہ نمبر دو ہو گئے۔

حیاتِ صلحاء...... اب ایک عامۂ مؤمنین ہیں جن کو صلحاءِ امت کہا جائے گا، اس میں درجہ بدرجہ کچھ گناہ بھی ہیں کچھ نیکیاں بھی ہیں مگر ان پر غلبہ نیکیوں کا ہے، ان کے بارے میں کیا فرمایا گیا؟ ان کو نقل وحرکت کی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ علیین کے مقام پر اپنی جگہ موجود ہیں، ان کو جانے آنے کی اجازت نہیں ہے اور روزق کھانے کی بھی ان کو اجازت نہیں، ثابت کیا ہوتا ہے؟ ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب ایک میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور سوال وجواب میں وہ پورا اترتا ہے، تو پہلے جہنم کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے وہ ٹھکانا نظر پڑتا ہے، اسے بتلایا جاتا ہے کہ تیرا یہ ٹھکانہ تھا لیکن تو نے چوں کہ صلاح اور نیکی اختیار کی، اللہ نے ہمیشہ کے لئے یہ تجھ پر بند کر دیا۔ پھر ملائکہ جنتوں کا دروازہ کھولتے ہیں، دور سے ان کی رُوح وریحان اور نعمتیں نظر پڑتی ہیں اور اس کی خوشبوئیں اور لپٹیں آتی ہیں جو دماغ کو معطر کرتی ہیں اور قوت بخشتی ہیں، تو صلحاءِ مؤمنین کو کھلایا پلایا نہیں جاتا تو دور سے دکھلایا جاتا ہے، کھانے پینے کی امید بندھ جاتی ہے اور کچھ خوشبوئیں آتی ہیں جن سے دماغ میں تاثر پیدا ہوتا ہے، تو معدے کے راستے سے کوئی غذا نہیں جاتی بلکہ دماغ میں بسادی جاتی ہے تاکہ دماغ میں اس سے عطریت اور خوشبوئیں پیدا ہو جائیں، نقل وحرکت نہیں کر سکتے کہ جنتوں میں جائیں لیکن دروازے کھولدئے جاتے ہیں کہ دور سے دیکھتے رہیں تاکہ امید قائم رہے، تو یہ حیات ہے مگر یہ بہت ادنیٰ درجے کی حیات ہے۔

موتِ کفار...... اب ایک کفار ہیں، ان پر اتنی پابندی عائد ہے کہ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتے ہیں، نہ ان کو حرکت دی جاتی ہے۔ نہ غذا۔ حتیٰ کہ ان کے خیال میں بھی حرکت نہیں، یعنی ان کی قوت خیالی بھی حرکت نہیں کرسکتی۔ قوّتِ خیالیہ اگر حرکت کرے تو کم سے کم آدمی بیٹھ کر سوچتا ہے کہ میں گرفتار ہوں، میری رہائی کی یہ صورت نکل سکتی ہے تو چاہے نہ نکلے، مگر دل میں ایک گونہ تسلی ہوتی ہے، کچھ امید کی رمق ہوتی ہے، اگر میں نے یوں کرلیا تو شاید میں چھوٹ جاؤں۔ تو جہنمیوں کو اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی کہ قوتِ فکریہ کو بھی حرکت دے سکیں۔ ان کا خیال بھی محبوس

اور مقید ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ رہائی کیا صورت ہوسکتی۔ تو نہ بدن نقل وحرکت کرے گا، نہ خیال نقل و حرکت کرے گا۔ نہ غذا ملے گی اور نہ غذا کا تصوّر ملے گا۔ تو حقیقی معنی میں اگر میت کہا جائے، تو کفار کو کہا جائے گا۔ کہ وہ صحیح معنی میں میت ہیں کہ نہ نقل وحرکت کی اجازت، نہ معنوی، نہ مادی، نہ حسی، اور نہ کھانے پینے کی اجازت۔

مراتبِ حیات...... باقی حیات عوام مومنین کے لئے ثابت۔ شہداء کے لئے بھی اور انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی، لیکن درجہ بدرجہ، غرض حضرات انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ ان کی نقل وحرکت عباداتی ہے اور غذا ان کی خدمت میں پہنچائی جاتی ہے۔ شہداء زندہ ہیں، ان کی نقل وحرکت مادی ہے، ان کو غذا دی جاتی ہے، مگر غذا کے پاس ان کو جانا پڑتا ہے، عوام مومنین کو نقل وحرکت کی اجازت نہیں۔ وہ اپنے مقام پر رہیں۔ مگر احترام سے رکھے جاتے ہیں اور جنت کی نعمتیں دکھلا دی جاتی ہیں تا کہ ان کی قوت خیالیہ منبسط ہو جائے اور اعلیٰ درجے کی توقعات باندھیں کہ اب قریب میں وہ وقت آنے والا ہے کہ انشاء اللہ ہم ان نعمتوں میں پہنچیں گے۔ تو نعمت سے بڑھ کر امیدِ نعمت ہوتی ہے، توقع لگی ہوئی ہے کہ اب وہ نعمت چند منٹ کے بعد ملی، اب وقت آیا کہ یہ نعمت مجھے ملی، تو مومنین کی قوتِ خیالیہ پر پابندی عائد نہیں ہے۔ ان کی قوت خیالیہ آزاد ہے، وہ اس سے لذت لیتے ہیں۔ تو یہ لذت انہیں ملتی ہے۔ یہ حیات کے تین درجے ہو گئے، اس معیار سے کہ زندگی کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی نقل وحرکت اور خورد ونوش ہے تو اقویٰ ترین حیات انبیاء علیہم السلام کی ثابت ہوئی۔

متوسط حیات شہداء کی ثابت ہوئی۔ ادنیٰ حیات صلحاء کی ثابت ہوئی، جس جس درجے کی یہ حیات ہے، اسی درجے کے اثرات بھی ہیں، دنیا تک اس کے اثرات پہنچے ہوئے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات اتنی کامل ہے کہ اقویٰ ترین ہے، دنیا میں اس کا اثر یہ ہے کہ دنیا سے جاچکے ہیں لیکن ان کی بیویاں بیوہ نہیں ہوئیں، دوسرے خاوندوں سے نکاح نہیں کرسکتیں۔ دنیا سے جاچکے ہیں لیکن ان کے مالوں میں میراث تقسیم نہیں ہوسکتی، کیوں کہ زندہ کے مال میں میراث تقسیم نہیں ہوتی، تو ان کے مال بھی میراث سے مستثنیٰ اور ان کی بیویاں بھی زوجیت اور نکاح سے مستثنیٰ۔

شہداء کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ ان کی بیویوں کا نکاح نہ ہوسکے۔ ان کے مال میں میراث تقسیم نہ ہوسکے، یہ تو سب ہوگا۔ لیکن ان کے بدنوں کو کچھ ایسی قوت دی جاتی ہے کہ دنیا کے اندر بھی ان کے کچھ ابدان محفوظ رہتے ہیں اور اگرچہ نصِ صریح سے ثابت نہیں مگر تم بات سے اتنا ثابت ہے کہ اصلحاء کے بدن بھی محفوظ رہتے ہیں ان میں تغیر بہت کم سے کم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔

اور عوام مومنین کا دنیا کے اندر کوئی اتنا اثر نہیں ہے۔ ان کے بدن بھی مٹی ہوجاتے ہیں اور گل جاتے ہیں۔ تو جس جس درجے کی حیات برزخ میں ہے، اسی اسی درجے کے آثار دنیا کے اندر پائے جاتے ہیں، اس لئے دنیوی معیار سے دیکھا جائے تو حیات کے مراتب ہیں اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی حیات سب سے زیادہ قوی ہے۔

اس سے اتنا معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی سی حیات برزخ میں نہیں ہے، جب کہ دنیا کے اندر بھی انبیاء علیہم السلام کی حیات عام لوگوں جیسی نہیں تھی۔ یہاں حیات کی نوعیت دوسری ہے۔

ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... عام طور سے ولادت ہوتی ہے، بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آیا، روتا ہوا اور اوندھا نکلا۔ اور حدیث میں ہے کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس طرح سے ہوئی کہ ماں کے پیٹ سے برآمد ہوئے، چہرۂ مبارک آسمان کی طرف تھا، شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی تھی، گویا وحدانیت کا اعلان فرماتے ہوئے تشریف لائے۔ کوئی آلائش نہیں ہوئی۔ نو کے نو مہینے ماں کے پیٹ میں کوئی بوجھ نہیں رہا۔ ہلکا پھلکا رہا، پھر انوار و برکات ظاہر ہوئے کہ پیدائش کے وقت اتنا نور نکلا کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے اس نور اور چاندنے کی روشنی میں شام کے محل دیکھ لئے، تو عام طور سے ولادت کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ ولادت آپ کی بھی ہوئی۔ لوگوں کی بھی ہوتی ہے، مگر باوجود اس مثلیت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت میں اور عام لوگوں کی ولادت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

طفولیت کا امتیاز...... اسی طرح سے طفولیت کی زندگی عام بچوں کی بھی ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہوئی۔ لیکن اس طفولیت میں بھی وہ امتیازات ہیں کہ دنیا کے اطفال کو وہ نصیب نہیں۔ کہیں شقِ صدر ہو رہا ہے۔ کہیں برکتوں کے آثار نمایاں ہیں کہیں حلیمہ سعدیہ کی وہ اونٹنی جس پر وہ سوار ہو کر جا رہی تھی، باوجود لاغر ہونے کے اتنی تیز دوڑنے لگی کہ بڑے بڑے گھوڑے پیچھے رہ گئے۔ قحط سالی عام تھی، دودھ پلانے کے لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر پہنچیں تو اس سال اتنے پھل آئے کہ اس سے پہلے اتنے پھل کبھی نہیں آئے تھے۔ تو یہ برکات بھی ہیں جو عام نہیں ہیں۔

حیاتِ برزخ کا امتیاز...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی دیکھی جائے تو جوان اور بھی ہوتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہوئے لیکن پھر جوانی میں زمین آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے کہ اس کے آثار و برکات جداگانہ ہیں۔

حواس کو دیکھا جائے تو جیسے میں نے عرض کیا کہ ہم حاسۂ بصر سے سامنے کی چیز دیکھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آمنا سامنا اور پیچھے دونوں کی چیزیں دیکھتے تھے۔ ہمارا حاسۂ بطش اور ہاتھ کی قوت فقط سختی اور نرمی کو پہچانتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی قوت معنویت اور شرح صدر کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی تھی۔ ہماری زبان مادّی زبان ہے مگر چکھتی ہے تو کھٹا میٹھا محسوس ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک حلال وحرام کا بھی پتہ چلا لیتی ہے۔ تو باوجود مثلیت کے بہت سی خصوصیات ہیں کہ جن پر نبی کو غیر نبی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سے برزخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات نہایت قوی اور اکمل ہے کہ دنیا سے بھی قوی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ احادیث سے جتنے قرائن بیان کر سکتے ہیں، وہ بیان کر دیئے گئے۔ اب اس کا ادراک کرنا کہ نوعیت کیا ہے۔ یہ ہماری قدرت سے خارج ہے، یہ خلاصہ ہے۔

نوعیتِ حیات...... اب اس میں علماء کے دو مسلک ہیں۔ اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں، لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے بعد پھر حیات دی گئی ہے، اور وہ ایسی دی گئی جیسے دنیا کی حیات تھی لیکن وفات اور قبضِ روح کے بعد دی گئی۔

اور وہ یہ کہ ہر انسان کو وفات دے دی جاتی ہے اور روح قبض ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وفات دی گئی۔ اور روح قبض ہوئی، اب جب قبر مبارک میں پہنچے تو وہاں جا کر عامۂ مومنین کی شان یہ ہے کہ انہیں پھر زندہ کیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کو بھی کہتے ہیں کہ قبر میں پھر زندہ کئے گئے۔ عامۂ مومنین کا یہ حال ہے کہ اس زندگی کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے۔ پھر قیامت کو حیات دی جائے گی۔ انبیاء علیہم السلام اس موت سے مستثنیٰ ہیں، جب قبر میں زندہ ہوئے، اب قیامت تک بلکہ ابدالاباد تک زندہ رہیں گے۔ اب موت نہیں آئے گی۔ اسی کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اللہ نے آپ کو اس سے مکرّم بنایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر دو موتیں طاری کرے، بس وہ ایک ہی موت ہے جو آئی۔ اس کے بعد اب جو زندگی آئی ہے تو ابدی زندگی ہے، پھر موت نہیں ہے"۔

اور عوام مومنین پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ ایک یہاں جس کو ہم موت کہتے ہیں، ایک عالم برزخ میں کہ زندہ کرنے کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے، اور فرما دیا جاتا ہے: "نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ" ① اس طرح سو جاؤ جس طرح دلہن سوتی ہے۔

تو ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام حیات ہیں، ان کی بالکل دنیوی حیات ہے، مگر موت سے انقطاع واقع ہوا اور بعد میں جو حیات آئی، وہ ویسی ہی تھی جیسی دنیا میں تھی مگر وہ ابدی ہے۔ اور ایک جماعت علماء کرام کی یہ کہتی ہے کہ بیچ میں موت کا واسطہ آیا۔ لیکن اس سے سلبِ روح نہیں ہوا۔ یعنی موت واقع ہوئی۔ اس واسطے کہ موت تو قطعی ہے قرآن کریم نے شہادت دی ہے: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ ②

تو موت واقع ہوئی۔ لیکن موت واقع ہونا اور ہے اور سلبِ حیات اور ہے۔ موت واقع ہوا اور حیات کلیۃً سلب نہ ہو، یہ ممکن ہے، اس واسطے کہ موت عارضی طور پر واقع ہوئی۔ اور حیات انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں ڈال دی گئی تھی، تو وہ کلیۃً سلب نہیں ہوئی گو موت بھی واقع ہوئی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کہ پانی۔ تو پانی کی ذات میں ٹھنڈک ہے کہ وہ آگ آئے تو اسے بجھا بھی دیتا ہے۔ لیکن پانی میں عارضی طور پر حرارت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اسے آگ پر تپا دیں تو وہ کھول کر اتنا گرم ہو جائے گا کہ جو کام آگ کرتی ہے وہ پانی کرے گا، لیکن اس حالت میں بھی اگر اسے آگ کے اوپر ڈال دیں تو آگ کو بجھا دے گا، معلوم ہوا پانی کے اندر ذاتی برودت باوجود انتہائی گرم ہونے کے موجود ہے، اگر انتہائی گرم ہو کر پانی کی حقیقت اس کے اندر سے نکل جاتی تو آگ کو بجھا نہ سکتا،

---

① جامع الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر، ج: ۴ ص: ۲۳۷. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی، ج: ۳، ص: ۷۱، رقم: ۱۰۷۱. ② پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۳۰.

لیکن کھولتا ہوا پانی بھی آگ کو بجھاتا ہے، معلوم ہوا کہ برودت کا مادہ موجودہ ہے، جو اس کے اصل جوہر میں قائم تھا، وہ نہیں نکلا اور اوپر سے حرارت بھی موجود ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں حیات رکھی جاتی ہے۔ موت جب طاری ہوتی ہے تو کلیتہً حیات سلب نہیں ہوتی۔ تو موت بھی ہے اور حیات بھی ہے۔ دونوں جمع ہیں جیسے گرم پانی میں برودت بھی اور حرارت بھی دونوں جمع ہیں، ایک اصلی ہے اور ایک عارضی ہے۔ غرض ایک جماعت علماء کرام کی اس کی قائل ہے کہ موت واقع ہوئی مگر سلبِ حیات واقع نہیں ہوا بلکہ حیات موجود رہی۔ اس کے آثار موجود رہے کیوں کہ وہ اصلی تھی اور موت صرف عارضی طور پر طاری ہوئی۔ تو اس میں دونوں کا اتفاق ہے کہ برزخ کے اندر حیات ہے اور ویسی ہے جیسے دنیا کی لیکن ایک کہتے ہیں کہ وہ مستمر حیات ہے اور ایک کہتے ہیں کہ وہ منقطع ہو کر پھر پیدا ہوئی ہے، نتیجہ دونوں ایک رائے رکھتے ہیں کہ حیات وہی ہے جو دنیوی حیات ہے۔

سلامتی کا راستہ...... یہ علماءِ کرام کا اختلاف ہے، اس میں ہمیں نہیں پڑنا چاہئے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم یوں کہیں کہ برزخ میں انبیاء علیہم السلام اسی طرح حیات ہیں، جس طرح ہم دنیا میں حیات ہیں۔ اب یہ کہ وہ حیات از سرِ نو آئی یا وہ پہلی ہی چل رہی ہے، یہ علماء پر موقوف ہے، ان کی آراء ہیں، ان کی وجوہ ہیں۔ ان کے قرائن اور دلائل ہیں، نہ ہم انہیں توڑ سکتے ہیں نہ ان کا خلاف کر سکتے ہیں، ہم گردن جھکائیں گے۔ بس اس قدرِ مشترک کے قائل ہو جائیں گے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں، کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس طرح سے زندہ ہیں۔

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی موت طاری ہوئی اور اس کے بعد جو حیات آئی وہ مستمر اور دائمی ہے جیسا کہ وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مقولے سے استناد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے، عوام مومنین کی یہ صورت نہیں ہے، ان پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ پہلی موت تو وہ جس کہ ہم احتضار کہتے ہیں کہ ایک آدمی انتقال کر جائے۔ دوسری موت وہ جو قبر میں سوال و جواب کے بعد کہ دیا جاتا ہے۔ ''نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ'' اور قرآن کریم میں جو فرمایا گیا: ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ﴾ ① یہاں موت کے معنی سلبِ حیات کے نہیں ہیں، یہاں موت کے معنی عدمِ ایجاد کے ہیں، یعنی تمہیں وجود نہیں ملا تھا۔ عرفِ عام میں تو موت اسی کو کہتے ہیں کہ حیات چھین لی جائے یا اس میں کمی کر دی جائے، تو ظاہر ہے جو ابتدائی موت ہے وہ عدم ہے، اس کو آپ موت کہہ رہے ہیں اور قرآن کریم نے جو موت کہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ حیات چھینی گئی بلکہ یہ ہیں کہ اس وقت تک حیات دی نہیں گئی تھی، البتہ۔ ﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ﴾ ② ''دو موتیں مراد ہیں، ایک دنیوی موت اور ایک وہ جو قبر کے اندر حیات کے بعد واقع ہوگی''

انکشافِ برزخ...... شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''اَنْفَاسُ الْعَارِفِيْنَ'' میں اپنے والد بزرگوار شاہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۔ ② پارہ: ۲۴ سورۃ الغافر، الآیۃ: ۱۱۔

عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سے ایک خادم جن کا نام عاشق ہے، کے بارے میں لکھا۔ یہ وہی عاشق ہیں جو "حُجَّةُ اللّٰہِ الْبَالِغَة" کے لکھنے کے محرّک بنے ہیں۔تو"اَنْفَاسُ الْعَارِفِیْن" میں ایک واقعہ لکھا ہے جو شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں جنگل میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ چند سوار گھوڑوں پر اچھا فاخرہ لباس پہنے ہوئے اور بڑے اچھے شاندار گھوڑے اور چلے آرہے ہیں مگر ہر سوار کی کچھ ایسی شکل ہے جیسے کوئی متجسّس ہوتا ہے اور ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ میں قریب سے گزرا تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر تشریف لائے ہیں؟ میں نے عرض کیا۔کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔آپ کون ہیں؟ اس نے کہا۔میرا نام ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے اور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں عاشق کا قرآن کریم سننے کے لئے جارہا ہوں۔ان کی تلاش میں ہم نکلے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ سوار غائب ہوگئے۔تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ اپنے والدِ بزرگوار کی طرف منسوب کیا۔ ہوسکتا ہے کہ واقعہ عالم برزخ میں پیش آیا ہو۔لیکن بعض دفعہ عالم برزخ منکشف ہو جاتا ہے اور اس کی صورتیں ہمیں اس جہان میں بیٹھ کے نظر آتی ہیں۔تو یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ برزخ سے نکل کر یہاں پہنچتے ہیں۔ بلکہ ہماری نگاہ برزخ تک پہنچ جاتی ہے۔اور وہاں کے احوال منکشف ہو جاتے ہیں۔

انکشافِ سجّین...... جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بہت محدّثانہ روایات سے اس قسم کے واقعات "کتاب الروح" میں نقل کئے ہیں۔ایک جگہ مثلاً لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک اونٹنی پر سوار ہو کر سفر کر رہے تھے،جس وقت بدر کے اس مقام کے قریب پہنچے جس میں کفار کی لاشیں ڈالی گئی تھیں تو مغرب کا سا وقت ہو گیا تھا۔تو دیکھا کہ بدر کے کنویں میں سے ایک نہایت ہی سیاہ فام اور بدہیئت شخص نکلا اور اس شان سے نکلا کہ بے حد ہی کریہہ المنظر اور ڈراونی صورت۔اور وہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف دوڑا اور کہا۔ "یَا عَبْدَاللّٰہِ اِسْقِنِیْ......" یہ کہہ رہا تھا کہ کنویں کے اندر سے ایک زنجیر پیدا ہوئی اور اس کے پیروں میں جکڑی گئی اور اسے نیچے کی طرف جذب کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس واقعہ کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئے،اور اونٹنی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بالکل حمائل ہوگئے۔اونٹنی وہاں سے بھاگی اور انہیں مدنیہ لے کر پہنچی۔ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہوش میں لائے گئے تو واقعہ سنایا۔تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آرڈر جاری کیا کہ کوئی شخص رات کے وقت بالکل تنہا سفر نہ کرے۔بالخصوص جب کوئی رفیق سفر ساتھ نہ ہو۔اس قسم کے واقعات پیش آجاتے ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ سجّین سے نکل کر دنیا میں آگیا،لیکن سجّین منکشف ہو گیا۔اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وہ سارا واقعہ دیکھا جو سجّین میں پیش آرہا تھا۔غرض اس قسم کے واقعات حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بکثرت نقل کئے ہیں۔اور

محدّثانہ انداز سے بھی نقل کئے ہیں۔

عالمِ منام...... نیز بہت سے منامات بھی نقل کئے ہیں۔ جیسے ابن ابی الدنیا جو مشہور محدّث ہیں، ان کا واقعہ نقل کیا ہے، کسی عارف نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا۔ اور وہ شخص بھی عارفین سے میں تھا۔ ان سے پوچھا کہ تم پر کیا گزری؟ اور تم پر کیا گزری ہے تو انہوں نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو جزائے خیر دے کہ اجر وثواب کے ڈھیر کے ڈھیر ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ جو ہمارے پاس پہاڑوں کی طرح لگ جاتے ہیں''۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا۔ ہمارا معمول یہ ہے کہ ہم ہفتے میں ایک بار ابن ابی الدینا کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور وہاں پہنچ کر یہ تحائف ہم کو ملتے ہیں جو دنیا والے ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ غرض کچھ خوابیں اور منامات اور کچھ محدثانہ روایتیں، ان سے اس قسم کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

مقامِ میّت کا انکشاف...... ایک واقعہ میں نے اپنے فارسی کے استاذ مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم سے خود سنا، جو آپ کے پاکستان کے مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب (مرحوم) ان کے والد ماجد تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے استاذ تھے اور فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ تو وہ ہمارے بھی استاذ بھی تھے۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ اس واقعہ کا حاصل یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدرس تھے اور عالم جید تھے کہا جاتا تھا کہ وہ فنونِ معقولہ کے امام تھے اور بہت ہی ذکی تھے۔ آپ چھ مہینے تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس بھی رہے۔ ان کے صاحبزادے تھے جن کا نام مولوی مصطفیٰ تھا۔ اور ہمارے ہی استاذ حضرت مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم جماعت تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ مولوی مصطفیٰ صاحب نے ان سے اپنا واقعہ بیان کیا اور مولانا محمد یسین صاحب مرحوم نے مجھ سے بیان کیا۔ بس راوی بیچ میں ہمارے اور صاحبِ واقعہ کے مولانا محمد یسین صاحب ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ: ''مولوی مصطفیٰ جب دہلی وطن پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب جمنا میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ اور جمنا کے کنارے کچھ قبرستان تھے تو ان میں سے بہت سی قبریں بہہ گئیں، ایک قبر جو ٹوٹی تو اس کی مٹی بہہ گئی اور اس کی لاش نمایاں ہوگئی۔ پانی تو ہٹ گیا لیکن وہ لاش رکھی ہوئی ہے۔ مولوی مصطفیٰ صاحب کا بیان یہ ہے کہ اس لاش کے دیکھنے کے لئے آس پاس کے بہت سے دھوبی جو کپڑے دھو رہے تھے، وہاں آ کر جمع ہوگئے۔ اور شہرت جو ہوئی تو شہر سے بھی لوگ آئے''۔ ''اس کی کیفیت انہوں نے یہ دیکھی کہ اس لاش کی پیشانی پر ایک چھوٹا سا کیڑا بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ڈنک مارتا ہے، جب ڈنک مارتا ہے تو لاش ایک دم لرز جاتی ہے اور ایک رنگ آتا اور ایک جاتا ہے۔ اور کئی منٹ بعد لاش اصلی حالت پر آتی ہے۔ جب اصلی حالت پر آئی، پھر اس نے ڈنک مارا، پھر اسی طرح لرز گئی۔ یہ انہوں نے تماشا دیکھا۔ اس میں کسی دھوبی نے اس لاش پر رحم کھا کر ایک کنکری زور سے کیڑے کے ماری۔ وہ کنکری کیڑے کے تو نہیں لگی۔ لیکن کیڑے کے پاس جا کر لگی۔ تو ایک دم اچٹ کر کیڑا اٹھا اور اس دھوبی کی پیشانی پر آ بیٹھا اور اسے ڈنک مارا۔ اور اسے ڈنک مار کر پھر اس لاش کے اوپر جا بیٹھا''۔

مولوی مصطفیٰ صاحب کا بیان یہ ہے کہ وہ دھوبی چلایا اور اس نے کہا: کچھ عجیب قسم کی آگ میرے اندر ہے کہ نہ میں یہ کہہ سکوں کہ سانپ نے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ بچھونے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ آگ میں جلا، کہہ کچھ نہیں سکتا کہ وہ کس قسم کی گرمی ہے، مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر رگ میں ہزاروں بچھو پڑے ہوئے ہیں جو ڈنک مار رہے ہیں''۔ خیر اس کے ہاتھ وغیرہ باندھے گئے، اب مجمع بدستور ہے۔ تو مولوی مصطفیٰ صاحب کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے یہ سمجھا کہ کیڑا کوئی عالم مادّی کی چیز نہیں ہے، یہ کوئی عذاب خداوندی ہے جو اس میت پر ہے، تو بجائے اس کے کہ اسے کنکر مارتا۔ میں نے اس میت کے قریب بیٹھ کر سورہ یسین پڑھنی شروع کی۔ اس کے علاوہ کچھ قرآن شریف کی آیتیں اور سورتیں جو مجھے یاد آئیں، جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں۔ وہ کیڑا مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ میں نے تلاوت کی۔ وہ کیڑا بالکل مضمحل ہو کر ایسا رہ گیا جیسے راکھ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس میت کو دفن کر دیا۔ اور وہ دھوبی دو تین دن زندہ رہا اور یہ کہتا تھا کہ میں اپنے کرب و بے چینی کا بیان نہیں کر سکتا۔

تو یہ اسی قسم کے واقعات ہیں کہ یہ معاملات تو برزخی ہیں لیکن برزخ دنیا میں نہیں آتا۔ نہ میت اپنے مقام پر چھوڑ کر آتی ہے۔ وہ اپنے مقام پر رہے لیکن کبھی کبھی حق تعالیٰ عالم برزخ کی چیزیں منکشف فرما دیتے ہیں اور انسان واقعات دیکھنے لگتا ہے۔ تو وہ برزخ کی چیزیں اسی طور پر دیکھ رہا ہے جیسا کہ خواب میں ہم دوسرے عالم کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ جیسے عالمِ مثال خواب میں دنیا میں نہیں آتا۔ لیکن دنیا والے بعض اوقات سو کر عالمِ مثال کے اندر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے واقعات دیکھتے ہیں۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ ① نیند جو ہے یہ موت کی بہن ہے، یعنی جو کیفیات موت میں آتی ہیں، وہی نیند میں طاری ہوتی ہیں قوّت وضعف اور دوام وعدمِ دوام کا فرق ہے۔ تو سونے والا جب خواب دیکھتا ہے اور یہ دیکھے کہ میں کسی شدید عذاب میں مبتلا ہوں اور لوگ مجھے مار رہے ہیں اور ڈنڈوں سے خبر لے رہے ہیں۔ بعض مرتبہ وہ خواب میں چلاتا ہے اور چلاتے ہوئے بعض اوقات اس کی آواز جاگنے والے سن لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں! کیا ہوا؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا۔ تو ہم نے نہیں جانا وہ کہاں گیا تھا حالاں کہ وہ اس عالم میں گیا اور وہاں تکلیف اٹھائی مگر اس عالم میں اتنا چلایا کہ اس عالم کے اندر اس کی آواز منتقل ہو گئی۔ اور اس عالم والوں نے اس کی آواز کو سن لیا، اس لئے بعض برزخ کی آوازیں شروع وہاں سے ہوتی ہیں مگر ہمارے کانوں تک آ کر منتہی ہو جاتی ہیں۔ تو جب بیداری میں یہ صورت ممکن ہے کہ عبرت کے طور پر خواب والا ایک دوسرے عالم میں ہو اور وہاں کی چیزیں ہم یہاں دیکھ لیں یا سن لیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ میت اپنے مقام پر ہو اور اس کا عذاب یا ثواب بعض دفعہ دیکھنے والے دیکھ لیں۔ خواہ خواب میں دیکھیں یا کشفی نگاہ سے

---

① البعث والنشور للامام البیهقی، باب قول اللہ تعالیٰ: لا یذوقون فیها الموت، ج: ١، ص: ٤٥٢، رقم: ٤٢٤.

دیکھیں۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ تو اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عالم برزخ سے کسی کی روح منتقل ہو کر دنیا میں آ گئی۔ یا کوئی یہاں چلا آیا۔ یہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقام پر ہے، البتہ اس کا مقام یہاں منکشف ہو گیا۔

تعدّدِ ارض وسماء...... ﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ ① اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کئے اور اس کے مثل سات زمینیں پیدا کیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر میں یہ بات بھی ہے کہ ہر زمین میں آبادی ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی آتے ہیں۔ یہ روایت ہے، اب یہ کہ وہاں یہی چاند سورج کام دیتا ہے یا وہاں کا چاند سورج الگ ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانے۔ جب کہ دنیا کے بہت سے خطوں کے بارے میں بھی آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہاں اسی سورج کی روشنی پہنچتی ہے یا نہیں۔ اگر آپ قطبین کے قریب آبادیاں دیکھیں، وہاں چھ چھ اور نو نو مہینے کی رات ہوتی ہے۔ سورج نکلتا ہی نہیں۔ وہاں لوگ اندھیرے میں بسر کرتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ وہ چراغ جلاتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی کرتے ہوں بہر حال اس زمین پر بھی ایسے مواقع ہیں کہ وہاں اس سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ یا پہنچتی ہے تو کئی مہینوں میں جا کر۔ جو سورج اس زمین پر پورا کام نہ دے سکے، اس کے بارے میں آپ یہ کہیں کہ ساتوں زمین میں وہی کام دے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ کام دے۔ اللہ کے علم میں ہے کہ وہاں شاید کوئی اور سورج ہو۔

میّت کا علم وادراک...... مسند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود روایت ہے۔ جہاں قبور کے آداب زیارت لکھے ہیں کہ میت کی زیارت اس طرح کی جائے کہ قبلہ کو پشت کی جائے اور میت کی طرف رخ کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے۔ اور درجہ بدرجہ تعارف بھی ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں وہ شخصی طور پر پہچانتا تھا تو وہاں بھی شخصی طور پر پہچانے گا۔ کوئی عمومی طور پر پہچانتا ہے تو وہاں بھی عمومی طور پر پہچانے گا۔ جہاں مواجہہ ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کے ذریعے روح کو متوجہ کرا دیا جاتا ہوگا۔ جیسا کہ آپ مثلاً جاگ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی ہوئی ہے مگر خیال دوسری طرف ہے تو باوجود یہ کہ آنکھ کھلی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے۔ بعض دفعہ ہم بازار جاتے ہیں، آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور ایک بڑا تماشا گزر رہا ہے۔ جب گھر آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا گزرا؟ آپ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا؟ کہ وہی جو بازار میں تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں۔ میاں تم آنکھیں کھولے ہوئے تو جا رہے تھے۔ آپ کہتے ہیں۔ واللہ، مجھے تو خبر نہیں۔ اس وقت آپ کہتے ہیں کہ اوہ! میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے بلکہ دھیان دیکھتا ہے۔ اگر دھیان دوسری طرف ہو آنکھ کھلی رہے گی۔ آپ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے، متوجہ ہو جائیں، وہی آنکھ دیکھنے لگے گی۔ اگر آپ غیر متوجہ ہیں۔ کان کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کو آواز نہیں آئے گی۔ توجہ کر لیں تو کانوں میں

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۱۲.

آواز آنی شروع ہو جائے گی، بعض اوقات آپ آذان کی آواز نہیں سن پاتے، خیال دوسری طرف متوجہ ہے، آپ اسی میں مستغرق ہیں، تو قوتِ خیالیہ کو اگر ان حواس کی طرف متوجہ کرلیا جائے تو وہ ادراک کرنا شروع کرتی ہے۔ اگر متوجہ نہ کیا جائے تو وہ ادراک نہیں کرتی تو ہو سکتا کہ ملائکہ کے ذریعے سے میّت کو توجہ دلادی جاتی ہو جب متوجہ ہوا تو اس کی قوت خیالی اور حسّی کام کرنے لگتی ہے، نہ متوجہ ہوا، نہیں کرتی اور یہ جب ہوتا ہوگا جب کوئی جا کر سلام کرے۔ مطلقاً نہیں کہ جو قبرستان سے گزرے میّت متوجہ ہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔

علیّین و سجّین کا مقام...... علیّین کا آپ اپنے ذہن میں یہ جغرافیہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ ساتویں آسمان میں ہے۔ علیّین اور سجّین یہیں چھپا ہوا ہے، جیسا کہ ہماری روح بدن میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن کو الگ کر دیا جائے اور روح دیکھنے کا کوئی آلہ ہو تو روح کے واقعات آپ کو یہیں نظر آئیں گے۔ اسی طرح علیّین اور سجّین کے مقامات اسی عالمِ عنصری میں عالمِ روح کی طرح چھپے ہوئے ہیں۔ حجابات پڑے ہوئے ہیں۔ اگر حجابات اٹھا دیئے جائیں۔ وہ سارا ثواب وعذاب آپ کو یہیں نظر پڑے گا۔ اوپر نہیں جانا ہوگا۔ غرض یہ تو ایک نگاہ کی چیز ہے کہ نگاہ جغرافیہ بنا لیتی ہے کہ جب علیّین اور سجّین ہیں۔ تو وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہوں گے، یہ ضروری نہیں، وہ یہیں چھپے ہوئے ہیں، مادّی حجابات میں غرق ہیں۔ اگر وہ اٹھا دیئے جائیں آپ دیکھنے لگیں گے۔

حجیتِ کشف...... بعض اہل اللہ پر عذابِ قبر منکشف بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو اتنی مقبولیت تھی کہ مجھے منکشف ہوا کہ اس روز دہلی کی ساری قبروں میں سے عذابِ قبر اٹھا دیا گیا تھا۔ اتنی تکریم ہوئی۔ اب یہ انکشاف کی بات ہے، کوئی حجتِ شرعی تو نہیں تھی۔ آخر انکشاف ہے۔ کشف بھی کوئی رد کرنے کی چیز تو ہے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ حجتِ شرعی نہیں۔ نفس وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور صوفیاء تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کشف دوسرے کے لئے حجت نہیں مگر اپنے نفس کے لئے حجت ہے، جب آدمی قطعی طور پر دیکھ رہا ہے۔

نیز یہ کہتے ہیں کہ اس حجت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس کے مقتضٰی پر عمل نہ کیا تو آخرت کا کوئی نقصان نہیں۔ اس لئے کہ آخرت کے نفع ونقصان کا تعلق نصوص سے ہے، کشوف سے نہیں، لیکن دنیا میں کوئی نقصان ضرور پہنچ جائے گا۔ ایک چیز واقعی تھی، اس کو دکھلائی گئی۔ اس کے تقاضوں پر عمل نہ کیا تو اس کا نقصان پہنچے گا مگر دنیوی۔ اخروی کوئی ادنیٰ نقصان نہیں ہوگا۔ یہ علیّین اور سجّین کی بارے میں جغرافیہ کی بحث ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلام کا تو یہ موضوع نہیں البتہ اربابِ کشوف اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں، وہ اگرچہ حجت تو نہیں۔ لیکن اگر خلاف میں کوئی دلیل قائم نہ ہو تو قابلِ رد بھی نہیں مانی جاسکتی ہے۔

جنت وجہنم کا جغرافیائی مقام...... حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں اتنا لکھا ہے کہ یہ آسمان سے لے کر زمین تک اور نچلی زمین تک، یہ سارا علاقہ جہنم کا ہے اور قیامت کے دن آگ سے یہی

علاقہ تپے گا۔ اور اسی میں وہ سانپ اور بچھو اور وہ سارے عذابات ہوں گے۔ اور آسمانوں سے اوپر جنتیں رکھی جائیں گی۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان جو پانچ سو میل کی مسافت ہے، یہ اعراف ہے۔ تو قیامت کے دن اوپر جنت، نیچے نار ہوگی، اب تو جنت ساتویں آسمان میں ہے۔

اس لئے کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ "سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی" پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو، وہ ساتویں آسمان پر تھی جو مقامِ جبریل علیہ السّلام ہے۔ تو سدرۃ المنتہٰی کا ساتویں آسمان پر ہونا حدیث سے ثابت ہوا۔ اور قرآن کریم کہتا ہے۔ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى﴾ ① ② ''سدرہ المنتہٰی کے پاس ''جَنَّةُ الْمَأْوٰى'' ہے''۔

تو اس آیت اور روایت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ جنتوں کی ابتداء ساتویں آسمان سے ہے۔ اور اوپر نیچے جنتوں کے سو درجے ہیں۔ گویا جنتوں کا علاقہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور جہنم کا علاقہ ساتویں زمین کے نیچے تحت الثریٰ میں ہے۔ قیامت کے دن جہنم کو کھینچ کر اوپر لایا جائے گا۔ جیسے حدیث میں ہے کہ ستر ہزار ملائکہ ایک ایک باگ کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور ستر ہزار ہی اس کی باگیں ہوں گی۔ اس کو کھینچ کر اوپر لائیں گے۔ اور جنت کو کچھ نیچے اتار اجائے گا۔ اور اگر نہیں اتارا جائے گا تو آسمان توڑ پھوڑ دیئے جائیں گے۔ تاکہ جنت کے وہ پورے مقامات نظر پڑ سکیں جواب تک حجابات میں ہیں۔ تو وہ بالاتر رہے گی۔ مگر نظر پڑے گی۔ اور جہنم اس زمین کے اوپر لائی جائے گی۔

اسی واسطے حدیث میں ہے کہ میدان محشر میں ہر انسان کے آگے دو چیزیں ہوں گی ایک جہنم کی ہولناک آوازیں جو آرہی ہوں گی اور ایک اپنے اپنے اعمال جو مجسم کر دیئے جائیں گے۔ قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ دو چیزیں ہر انسان کے سامنے ہوں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہنم کو قریب لایا جائے گا۔ اور اس کی آوازیں ہیبت کے لئے سنوائی جائیں گی۔ غرض قیامت کے دن کچھ تغیر کیا جائے گا کہ جہنم کو اوپر لائیں گے اور جنت کو کچھ نیچے لائیں گے یا اوپر ہی رہے گی، مگر بیچ میں سے آسمان توڑ دیئے جائیں گے تاکہ وہ حجابات ختم ہوں۔ ادھر جہنم نظر آئے۔ ادھر جنت نظر آئے۔ اور ہر ایک کو اپنا ٹھکانہ محسوس ہونے لگے کہ، یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے۔ تو اس وقت یہ زمین و آسمان حائل نہیں رہیں گے۔ فی الحال زمین و آسمان حائل ہیں۔ اس لئے کچھ نظر نہیں آرہا۔ اور اگر فی الحال ہی نظر آجاتا تو عقیدہ باندھنے اور ایمان لانے کی کیا ضرورت تھی۔ عقیدہ تو اسی کو کہتے ہیں کہ آدمی غیب کو سمجھے اور اسی پر ایمان لائے۔

مقامِ ارواح...... جنت اور دوزخ میں داخلے سے پہلے پہلے ارواح اپنے اپنے مقامات پر رہیں گی اور وہ علیّین اور سجّین ہیں، اور اب یہ کہ شھدا ٔ کو جنت میں لے جائیں اور سبز پرندوں کے خول پہنائیں۔ یہ تو لے جانا ہوا۔ باقی

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۱۴، ۱۵۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتھی، ص: ۷۰۸، رقم: ۲۳۱۔

داخلہ تو جنت میں قیامت کے دن ہوگا۔ اب تو قبر سے اس کو ٹھکانہ دکھلا دیا جائے گا۔ اور روح و ریحان اور نعیم کی خوشبو اور تعطّر وہاں سے آنے لگیں۔

جنّیہ سے نکاح کا حکم...... حضرت حافظ ابن تیمیہ حرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب "اٰکَامُ الْمَرْجَانِ فِیْ أَحْکَامِ الْجَآنّ" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں جنّات کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ دنیا کے ہر مکان میں جنات بستے ہیں، کوئی مکان خالی نہیں ہے، فرق اتنا ہے کہ جو شرّی ہے، اس کے شر کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جن ہے اور آسیب کا اثر ہے، جو بے چارے صالحین ہیں، وہ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں محسوس نہیں کرتے۔ مگر ہر جگہ موجود ہیں۔ اور ان میں زیادہ شرّی ہوتے ہیں۔ نیک بہت کم ہوتے ہیں۔ ان میں شر کا مادّہ ہی غالب ہے جبکہ انسانوں میں شر کا غلبہ نہیں بلکہ مادّے برابر رکھے گئے ہیں۔ ان میں اکثریت شرّ والوں کی ہے۔ خیر والے اقلیت میں ہیں۔

فقہاء نے اس میں بحث کی ہے کہ جنّیہ سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ غیرِ جنس ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری یا گائے سے نکاح کرلے۔ وہ منعقد نہیں ہوگا۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ جب وہ صورتِ انسانی میں ہوں تو جنسیت کے اقرب ہوگئے، لہٰذا نکاح جائز ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدّس اللہ سرہٗ سے ایک جن کی ملاقات...... ایک جن سے تو خود ہماری ملاقات قندھاریہ میں ہوئی، وہاں کسی شخص کے اوپر جن کا اثر تھا اور اس کی نسبت مشہور یہ تھا کہ جب اس پر اثر ہوتا ہے تو باوجود یکہ بے پڑھا لکھا تھا۔ اس کے باوجود قرآن شریف کے متعدد رکوع پڑھتا۔ مسائل اور علوم بہت بیان کرنے لگتا تھا اور جب وہ اثر نہیں رہتا تھا تو جاہلِ مطلق ہوتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی کلام اس کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔

میرا وہاں جانا ہوا۔ صبح کی نماز کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ وہ جن ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ جن کو میرے سے کیا کام ہے؟ میرے اوپر کوئی اثر ڈالے گا؟ خیر میں نے کہا اگر ملاقات کرنا چاہتا ہے تو اسے بلالو۔ تو وہ شخص آیا۔ اس کی حرکات کچھ ایسی تھیں باہوش انسان کی نہیں ہوتیں۔ جیسے مدہوش سا ہو۔ اور پھر جب بیٹھا تو اس کی آنکھیں اتنی چڑھیں کہ پتلیاں بالکل غائب ہوگئیں۔ اتنی اوپر چڑھ گئیں کہ سفیدی سفیدی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر اس کا سانس کچھ چلا اور ابھرا اور وہ وہیں بے ہوش ہوکر گرا۔ اس کے بعد اٹھا تو اس کا سانس ٹھکانے پر نہیں تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس نے کچھ بولنا شروع کیا اور اس کی آواز میں بھی ایک قسم کا کچھ ڈراؤنا پن سا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا میں نے "وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ" کہہ کر جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے معانقہ کرنا چاہا۔ میں نے کہا "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......" میں جن سے کیا معانقہ کروں؟ لیکن "طَوْعًا وَّ کَرْهًا" میں نے معانقہ بھی کیا۔ کوئی اثر وغیرہ تو ہوا نہیں، اس کے بعد وہ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ آپ کا کیا نام ہے؟ اس نے شاید عباس یا ایسا کچھ نام بتایا۔ میں نے کہا آپ رہتے کہاں ہیں؟ اس نے کہا بمبئی

کے قریب ایک جزیرہ ہے، اس میں رہتے ہیں، میں نے کہا، آپ اس شخص کو کیوں ستاتے ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ میں تو نہیں ستاتا۔ مجھے اس سے تعلق ہے۔ اس کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے، جب میں نہیں آتا تو یہ خود مجھے ڈھونڈتا ہے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ ہمیں کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔؟ اس لئے کہ ہم نے آپ کو بہت نفع پہنچایا۔

اس نے کہا وہ کیا؟ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہمارے شاگرد ہیں۔ دارالعلوم میں ہمارے بزرگوں کے سامنے بہت سے جنات نے پڑھا ہے۔ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کچھ ظاہر بھی ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ ہمارے استاذ بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں۔ شاگرد تو یوں کہ دارالعلوم میں پڑھا۔ اور استاذ یوں کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے "حَدِيْثُ الْجِنِّ" نقل کی ہے، وہ قاضی جن سے سنی ہے۔ میں نے کہا آپ لوگ استاد بھی ہیں اور شاگرد کثرت سے ہیں۔ تو میں نے کہا آپ دارالعلوم کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں؟ وہ چپکا ہو گیا کہ میں تو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے کہا۔ پھر آپ جن ہی کیوں بنے؟ پھر وہ چپکا ہو کر بیٹھ گیا، کچھ بولا نہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اس نے اجازت چاہی، میں نے کہا جایئے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو تو بہت بولتا تھا، بولا کیوں نہیں؟ کہنے لگا بس کچھ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب واللہ اعلم وہ واقعی جن ہی تھا یا کیا تھا۔ مگر بہرحال قرائن تو ایسے تھے کہ وہ انسانی حرکتیں نہیں تھیں، اس لئے کہ جب اس کا اثر ختم ہوتا تھا، وہ آدمی بالکل اچھا خاصا ہوش وحواس قائم۔ اور جہاں وہ اثر شروع ہوا، کہیں قرآن پڑھتا ہے۔ حالاں کہ حافظ نہیں ہے۔ اسی طرح مسائل بیان کرتا ہے۔

اقسامِ محبت...... علماءِ کرام محبت کی تین قسمیں لکھتے ہیں۔ ایک محبت طبعی ہے۔ ایک محبتِ عقلی ہے اور محبتِ عشقی ہے۔ محبتِ طبعی تو مادّی محبت ہے جیسے باپ کو اولاد سے ہوتی ہے یا اولاد کو ماں باپ سے ہوتی ہے یا عزیزوں رشتہ داروں میں ہوتی ہے۔ اور ایک محبت عقلی ہے۔ اسی کا نام فی الحقیقت ایمان ہے، حدیث میں ہے کہ "لَا يُـؤْمِـنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ." ① تم میں کوئی بھی مومن نہیں بن سکتا جب تک میرے ساتھ اتنی محبت ہو، کہ نہ اتنی محبت اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اولاد سے ہو"۔

ظاہر بات ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے۔ وہ محبت عقلی ہوتی ہے۔ طبعی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ دلائل پر مبنی ہے۔ ایمان خود استدلالی چیز ہے اور ایمان کی حقیقت محبت ہے۔ تو وہ محبت عقلی ہے۔ اس محبت کی آدمی جب عملاً مشق کرے اور بڑھائے اور عشق کے درجے میں آ جائے تو وہ محبت عشقی کہلاتی ہے۔ جیسے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ② تو اشدِ حب ہی وہی عشق ہے۔ محبتِ طبعی تو غیر اختیاری ہوتی ہے۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول، ص: ۳، رقم: ۱۴.

② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۶۵.

جیسے اولاد سے محبت ہے اس میں ارادے اور اختیار کا دخل نہیں۔ خواہ مخواہ آدمی محبت کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن عقلی محبت وہ اختیاری ہے بایں معنی کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ جب اس کے اسباب اختیار کرے گا، وہ محبت پیدا ہوجائے گی اور اس محبت کو جب تمرین میں لائے گا، اس کی مشق کرے گا اور اس کے متعلقہ اعمال انجام دے گا، وہ محبت بڑھ کر عشق کے درجے میں پہنچ جائے گی جیسا کہ مجاہدہ اور ریاضت کرنے والے کی کیفیت ہوتی ہے۔ اصل ایمان وہ تو محبت عقلی ہے۔ جب مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں تو محبت حال کے درجے میں پہنچ جاتی ہے، وہ عشق کہلاتی ہے۔ یہ جو آپ نے سوال کیا کہ قیامت میں آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ محبت کرے۔ یہ درحقیقت محبتِ عقلی کی طرف اشارہ ہے، یعنی ایمان کی وجہ سے جس کے ساتھ محبت ہوگی۔ آدمی اس کے ساتھ ہوگا۔

مثلاً حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو محبت ہے، یہ طبعی محبت نہیں بلکہ عقلی محبت ہے۔ ان کے علوم اور کمالات کو دیکھ کر ہے۔ چوں کہ آپ کو کمالات سے محبت تھی تو صاحب کمال سے بھی محبت ہے۔ سارے انبیاء علیہم السلام اور سارے اولیاء نیز اھل اللہ سے محبت۔ یہ محبتِ عقلی ہے۔ آخرت کا تعلق زیادہ تر اسی محبت سے ہے جو امر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری امور پر تکوینی آثار مرتب ہوں گے، وہ دوسرا درجہ ہے۔ اختیاری محبت پر تشریعی آثار مرتب ہوں گے۔ اسی کے بارے میں ہے۔ ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ .'' ① اور اسی کو فرمایا گیا: ''مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ. ''② ''جس نے محبت کی تو اللہ کی خاطر، عدوات باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کے لئے، کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے، اس نے ایمان کو کامل کردیا۔ حبِ فی اللہ اور بغضِ فی للہ کے کمال پر ایمان کا کمال بتلایا گیا۔ یہ وہی اختیاری محبت ہے جو اعمال سے بڑھتی ہے۔ ترکِ عمل سے گھٹ جاتی ہے''۔

قیامِ میلاد اور عُرس کی تحقیق...... ایسا موقع تو میرے علم میں نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ان مسائل میں ابتداء حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے جواز کی تھی۔ قیام میلاد یا عرس ان چیزوں میں توسّع تھا۔ بعد میں جب تحقیق بدلی ہے، پھر شدت پیدا ہوگئی۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدّس سرہٗ جو گویا پوری اس جماعتِ دیوبند کے شیخ طائفہ ہیں۔ ان کے سلسلہء بیعت میں داخل ہیں۔ ان کے ہاں خود ان چیزوں میں توسّع ہے۔ لیکن جماعت دیوبند کا عمل حضرات فقہاء کرام کے اقوال اور نصوص پر اور کتاب وسنّت پر ہے۔

قیام میلاد کی جو اصل بنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو قیام ہے ایک حرکتِ وجدی ہے اور حرکتِ وجدی صرف اسی صورت میں معتبر ہے کہ کسی حال کے تابع ہو۔ اگر رسم یا نقالی کے تابع ہو، اسے حرکتِ وجدی نہیں کہتے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الادب، باب علامة حب الله عزوجل، ص: ۵۲۰، رقم: ۶۱۶۸.

② السنن لابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه، ص: ۱۵۶۷، رقم: ۴۶۷۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۱۸۱ رقم: ۴۶۸۱.

اگر کسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت متمثل ہوا اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے، پھر آگے یہ طریقت کا مسئلہ ہے کہ جتنے بھی اربابِ طریقت موجود ہوں، انہیں بھی کھڑا ہو جانا چاہیے۔ ورنہ اس پر قبض طاری ہو جاتا ہے۔

اب حقیقت میں یہ شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ذوقی اور وجدانی مسئلہ ہے اور طریق کا ایک معالجہ ہے، اس کو جائز وناجائز کے نیچے لانا یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک حرکتِ وجدی ہے۔ اب جو ناجائز کہتے ہیں وہ ان لوگوں کے قیام کو کہتے ہیں جو کہ وجدی نہیں ہے اور کسی کے تابع نہیں۔ محض نقالی ہے، رسوم کی اتباع ہے، کوئی صاحبِ حال نہیں ہے۔ تو جب رسم کی اتباع ہوگی تو رسم پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام اولیٰ ہے۔ اگر کسی پر حال طاری ہوگا، اور وہ مغلوب الحال ہے تو وہ عنداللہ معذور ہے۔ نہ آپ اسے کچھ کہہ سکیں گے نہ ہم کہہ سکیں گے۔ لیکن جو اپنے ہوش وحواس میں ہے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور آپ کے لائے ہوئے قانون کی اتباع کرنی پڑے گی۔ بحالتِ صحتِ حواس اگر رسوم کی اتباع کرنے لگے، وہ نقالی سمجھی جائے گی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کا تمثل ہوا اور مثالی صورت سامنے آئے۔ خواب میں بھی آپ دیکھ لیتے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ رَّانِیْ فِی المنام فَقَدْ رَانِیْ.''① 'جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا'۔

اسی طرح سے منام جو ہے وہ ایک ابتدائی درجے کا کشف ہے جو ہر انسان کو میسر آ سکتا ہے۔ لیکن مجاہدہ اور ریاضت کرنے والوں کا کشف، اس کا اور درجہ ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کسی مغلوب الحال کے سامنے آئے اور متمثل ہو اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے۔ اس پر نہ آپ دارو گیر کریں گے نہ ہم کریں گے کیوں کہ وہ اپنے حال میں نہیں، اپنے آپ میں نہیں ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا ناسور...... جامعہ ازہر میں شیعوں کے بارے میں مسئلہ تو چل رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ جو شیعہ سنی کے درمیان منافرت سی ہے، اس کو ختم کیا جائے۔ اور جامعہ ازہر میں شیعوں کو بھی داخلے کا حق دیا جائے۔ یہ مسئلہ وہاں چل رہا ہے۔ وہاں کے شیوخ میں شیخ عبدالواحد واصلی ہیں۔ ایک دعوت میں ہمارا ساتھ ہوا تو اس مسئلہ پر کچھ گفتگو آئی۔ اس پر انہوں نے یہی کہا کہ ایک شیعہ تو وہ ہیں جو بالکل اصول اسلامیہ سے منحرف اور بالکل مختلف ہیں جیسے کوئی تحریف قرآن کا قائل ہے یا بعض حلولِ خداوندی کے قائل ہیں۔ ان سے تو بحث نہیں۔ وہ اسلام سے خارج ہیں۔ لیکن جو لوگ محض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کے قائل ہیں، ان سے اگر منافرت باقی نہ رہے تو کیا حرج ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت الگ ہے۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر فقط اتنا ہی مسئلہ ہو، اہم تو یہ بھی ہے، اس واسطے کہ اب فضیلتِ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر اور ان کی خلافت پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اجماع کا خرق اور اس کا توڑ ڈالنا یہ بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو برداشت کیا جائے کہ ایک چیز پر اجماع ہو چکا ہے مگر اس کی جو جانب مخالف ہے وہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب مایقال فی الرکوع، ص: ۲۵۴، رقم: ۱۰۹۰.

کوئی حرام یا ممنوع نہیں ہے۔ اگر فقط ایک مسئلہ ہو تو کچھ صبر کر لیا جائے۔

لیکن ان کے ہاں سارے فرقوں کا قدرِ مشترک وہ ''مسئلہ امامت'' ہے اور وہ امامت کو نبوّت سے افضل جانتے ہیں۔ اور امام کو معصوم سمجھتے ہیں کہ امام کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ تو یہ مسئلہ سامنے آئے گا۔ کیا آپ اس کو برداشت کریں گے؟

ظاہر بات ہے کہ جب بنیاد کے اندر ہی اختلاف ہو گیا کہ ہم تمام مسلمان اس کے قائل ہیں کہ نبوّت سے اونچا کوئی مرتبہ نہیں۔ امامت توابعِ نبوّت میں سے ہے۔ جب نبوّت ختم ہو گئی تو وعدہ دیا گیا ''اَلْاَئِـمَّةُ مِـنْ قُـرَیْـشٍ.'' ① یا یہ کہ بارہ امام گزریں گے۔ یا آئمہ مجتہدین کے بارے میں کچھ پیشین گوئیاں آئیں۔ تو اس کا مطلب یہ کہ نبوّت ختم ہو جانے کے بعد نبوّت کی خلافت باقی رہے گی۔ وہ خلافت خواہ امامت کی صورت میں ظاہر ہو، خواہ علم کی صورت میں، خواہ کسی بھی کمال کی صورت میں ہو۔ بہر حال وہ فروعات نبوّت میں سے ہے۔

یہ امت کا ایک اجماعی مسئلہ ہے، اس کے اندر اگر ایک فرقہ آ کر یہ دعویٰ کرے کہ نبوّت افضل نہیں بلکہ امامت افضل ہے۔ تو پہلے تو اجماع کا خرق ہوا۔ پھر یہ کہ ان کے نزدیک امام کے لئے عصمت لازم ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عصمت لازم ہے۔ تو نبوت کے محاذ اور متوازی ایک دوسرا مقام لا کے کھڑا کر دیا۔ تو ہم اس کو شرک فی النبوّت سے تعبیر کریں گے۔ جیسا کہ شرک فی الالوھیّت ممنوع ہے، اسی طرح شرک فی النبوّت بھی ممنوع ہے۔ اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں۔ اس لئے کہ انبیاءِ سابقین میں چوں کہ نبوّت ختم نہیں ہوئی تھی تو حضرات انبیاء علیہم السلام کے آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اس میں اگر کوئی دعویٰ نبوت یا دعویٰ عصمت کرے تو کچھ مناسب بھی تھا۔

ختم نبوّت کے بعد جو بھی عصمت کا دعویٰ ہو گا یا نبوّت سے افضلیّت کا دعویٰ ہو گا۔ تو وہ ختم نبوّت کے ٹھیک منافی پڑے گا۔ ایک ادھر دعویٰ خرق اجماع اور ادھر ایک اسلام کا جو اجماعی مسئلہ ختم نبوّت کا ہے، اس کے بھی یہ منافی ہے، کیا آپ اسے برداشت کریں گے؟

تاریخی تخریبی فرقہ ...... پھر میں نے عرض کیا کہ دوسری بات یہ ہے کہ ان ساری چیزوں کو چھوڑ دیجئے، یہ دیکھئے کہ ہر فرقے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس فرقے کا مزاج تخریبی ہے۔ اور تاریخ اس پر شہادت دے گی کہ مسلمانوں کو جتنے بھی صدمات اٹھانے پڑے ہیں، سیاست کو یا خلافت کو جہاں جہاں تباہی ہوئی، نیچے سے یہی فرقہ نکلتا ہے، تو تاریخ کی روشنی میں یہ ایک تخریبی فرقہ ہے۔ جب اس کا مزاج یہ ہے تو ہو سکتا ہے کہ آج وہ آپ کی چاپلوسی کر کے آپ میں شامل ہو جائے۔ لیکن کل کو نوک۔ نیچے نکال کر آپ کو ہی بیخ دے۔ آپ کے اوپر غالب آ جائے اور آپ دیکھتے رہ جائیں۔ جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے، پھر آپ کیا کریں گے؟

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی، ص: ۱۲، رقم: ۱۱۰۔

ذوقِ دین کی کمی...... آپ نے محض ایک عقیدہ سامنے رکھ لیا یعنی تفضیلِ علی رضی اللہ عنہ یہ کوئی زیادہ اہم نہیں۔ اگر صرف اس مسئلہ تک بات ہوتی تو مضائقہ نہیں تھا مگر مسائل دوسرے بھی ہیں۔ پھر فرقوں اور طبقات کا مزاج ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کر لینا تو ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اخیر میں انہوں نے یہ کہا۔ میں تو انہیں چیزوں کا قائل ہوں، میں تو نمائندگی کر رہا تھا کہ یہ خیالات ہیں۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ اس کی نمائندگی کیجئے گا کہ یہ خیال ہونا چاہیے، تو اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسئلہ تو اٹھ رہا ہے اور کچھ طبیعتیں ادھر چل رہی ہیں۔ اور جب اس ذوق میں کمی آتی ہے جو خالص دین کا ذوق ہے، تو افکار میں اس قسم کی آزادی پیدا ہوتی ہے۔

بشاشتِ ایمان (ایمانی کیفیت)...... دراصل اس کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے کہ اس پر ہم پرکھیں۔ بلکہ صحیح بخاری کی جو روایت ہے، اس میں ایک لفظ یہ ہے۔ جب ہرقل نے ابوسفیان سے مختلف سوالات کئے ہیں تو ان میں ایک یہ بھی تھا۔ ''هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سُخْطَةً لِدِيْنِهٖ.'' ''کیا ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایمان لاکر ان کے دین کو برا سمجھ کر کوئی مرتد بھی ہو جاتا ہے؟'' انہوں نے کہا۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مرتد ہو گیا ہو۔

ہرقل یہ کہتا ہے کہ ''وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَةَ الْقُلُوْبِ''. ① یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب ایمان کی بشاشت قلب کے اندر رچ جائے۔ پھر ارتداد کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ تو حدیث میں اس کو انشراحِ تام اور بشاشتِ ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مختلف الفاظ جو احادیث میں آتے ہیں۔ کہیں ''حلاوۃِ ایمان'' فرمایا گیا۔ جیسے حدیث میں ہے۔ ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّجِدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ فَلْيَلْبَسِ الصُّوْفَ تَذَلُّلًا لِرَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ.'' ② جس کو یہ پسند ہو کہ میں ایمان کی مٹھاس چکھوں اسے چاہئے کہ اللہ کے سامنے ذلتِ نفس اختیار کرنے کے لئے اون کا کپڑا پہنے یعنی دکھلاوے کے لئے نہ ہو۔ تو اس کو ایمان کی حلاوت اور مٹھاس آ جائے گی۔

اب یہ ایک کیفیت ہے کیفیت کو ہم الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ کہیں اس کو ''شرحِ صدر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ ③ ''جب اللہ سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور شرحِ صدر نصیب ہو جاتا ہے تو اس کو ایک خاص نور عطاء کر دیا جاتا ہے''۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ اب قلب کے اندر ظلمت نہیں آ سکتی۔ جب شرحِ صدر ہو گیا۔ تو کہیں حلاوۃِ ایمان سے، کہیں بشاشتِ ایمان سے، کہیں شرحِ صدر سے، اس کی مختلف تعبیرات ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم ایک ہی ہے اور یہ کہ دین کے لئے سینہ کھل جائے اور اس پر طمانیت میسر آ جائے اور رضائے کامل حاصل ہو جائے۔ پھر اندیشہ نہیں رہتا۔

---

① الصحيح للبخاری، كتاب تفسير القرآن، باب قل يا اهل الكتاب تعالوا، ج: ۱۴، ص: ۲۲. ② كنز العمال، ج: ۱۵ ص: ۳۰۲ (الديلمي عن ابی هريرةؓ) علامہ پٹنیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قلت: الحديث حسن له شواهد فعند البيهقي بوجه آخر نحو "من لبس الصوف وحلب الشاة وركب الاتان فليس في جوفه شيء من الكبر وغيره ذالک دیکھئے: تذكرة الموضوعات، ج: ۱ ص: ۱۵۷. ③ پارہ: ۲۳، سورة الزمر، الآية: ۲۲.

کیفیّتِ مقام...... لیکن یہ کہ اس کا قاعدہ کیا ہے۔ یہ قواعد سے متعلق چیز نہیں۔ یہ تو ایک مقام ہے، جب آدمی اس مقام پر پہنچ جائے گا تو یہ ایک قلبی کیفیت ہے، وہ خود محسوس کرے گا کہ میں کس مقام پر ہوں۔ لفظوں میں کیفیات ادا نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تو ایمانی اور روحانی کیفیات ہیں۔ مادّی کیفیات کو آدمی الفاظ سے نہیں سمجھ سکتا، کتنی بلیغ تعبیر کیوں نہ ہو؟

میں آپ سے کہوں آپ ذرا مجھے سیب کا مزہ سمجھا دیجئے، تو آپ کتنی ہی فصیح و بلیغ تقریر کریں، آپ نہیں سمجھا سکتے۔ اس لئے کہ کیفیت الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی، آپ یوں کہیں گے کہ صاحب! دو پیسے خرچ کرو، کھا کے دیکھ لو، مزہ معلوم ہو جائے گا، یہ مادّی کیفیت ہے، یا مثلاً نفسانی کیفیت ہے۔ جیسے انسان کی عمر کے تین درجے ہیں، طفولیت، شباب اور کہولت ہے۔ بچہ اگر آپ سے یہ پوچھے کہ جوانی کی کیا کیفیات ہیں، مجھے سمجھا دیجئے۔ کیا آپ اس پر قادر ہیں کہ سمجھا دیں؟ کبھی نہیں سمجھا سکیں گے۔ یہ کہیں گے کہ بیٹا! ایک آٹھ دس برس کا انتظار کرو، جب جوان ہو جاؤ گے، خود محسوس ہو جائے گا کہ کیا کیفیت ہے۔ یا ایک جوان آدمی یوں کہے کہ مجھے بڑھاپے کے کیفیت سمجھا دو۔ ممکن نہیں کہ آپ سمجھا دیں۔ جب تک وہ کیفیت اس پر گزرے نہیں۔ اور وہ خود صاحبِ مقام نہیں بن جاتا۔ یا بوڑھا آدمی یوں کہے کہ مجھے محتضر کی کیفیت سمجھا دو کہ نزع کی حالت کیسی ہوتی ہے تو سوائے اس کے کوئی جواب نہیں کہ بھائی! جب یہ کیفیت آئے گی تو خود سمجھ لوگے، یہ لفظوں میں میں ادا نہیں کر سکتے۔ جب مادّی کیفیت کو لفظوں میں نہیں لا سکتے، نفسانی کیفیت کو نہیں لا سکتے، تو روحانی کیفیات جو مقاماتِ قلب سے تعلق رکھتی ہیں، وہ اتنی لطیف ہیں کہ ناممکن ہے کہ وہ لفظوں میں آسکتی ہوں اور جتنی آسکتی ہیں ان کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ بہتر کوئی نہیں بیان کر سکتا۔ اس کی علامتیں بتلا دی گئی ہیں کہ جب اس درجہ پر پہنچ جاؤ گے تو سمجھ لو کہ صاحبِ مقام ہو گئے۔

کیفیّتِ برزخ...... کسی بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، انہوں نے کہا کہ ہزاروں آدمی مرتے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں بتلایا کہ مجھ پر گزرا کیا۔ انہوں نے کہا میرا جب انتقال ہو تو تم میری قبر میں کاغذ اور قلم دوات رکھ دینا۔ میں تمہیں ساری کیفیات لکھ کر دوں گا۔ بس تم تیسرے دن آکر اس کاغذ کو اٹھا لینا۔ اور کہا میں نے تیسرے دن کی قید اس لئے لگائی ہے کہ تین دن میں مجھے اپنا اندازہ ہو جائے گا کہ مجھ پر کیا گزرے گی۔ میں مقبول ہوں یا نامقبول ہوں۔ جب اپنی طرف سے اطمینان ہو تب میں دوسرے کو اطلاع دوں گا کہ یہ کیفیت میرے اوپر گزری۔ چناں چہ ان کے انتقال کے بعد تیسرے دن لوگ پہنچے تو وہ جو کاغذ اندر رکھا تھا، واقعی اوپر موجود تھا۔ اور اس کے اوپر لکھا ہوا بھی ہے۔ اور لکھا ہوا کچھ ایسے حروف میں ہے کہ وہ روشنائی بھی نہیں ہے۔ بس کچھ حروف سمجھ آتے ہیں۔

غرض لوگ شوق سے دوڑے کہ شیخ نے برزخ کے احوال سے مطلع کیا ہوگا۔ وہ وعدہ کر کے گئے تھے۔ اس میں انہوں نے ایک سطر میں سارا حال لکھ دیا۔ وہ یہ تھا کہ۔ ”یہاں کی حالت دیدنی ہے، شنیدنی نہیں ہے“۔ دیکھنے اور گزرنے سے تعلق رکھتی ہے، سننے سے متعلق نہیں ہے۔ وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور جتنی بیان میں آسکتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ تو حدیث میں عالم برزخ کے جتنے واقعات بیان کر

دیئے گئے ہیں اس سے زیادہ کوئی بیان کر سکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی قوتِ بیانیہ ہے کہ ان کی کیفیات کو پھر بھی لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان سے زیادہ کسی کو قدرت نہیں ہے، تو یہ جواب دیا کہ یہاں کہ حالت دیدنی ہے، شنیدنی نہیں۔ سننے کے لائق نہیں۔ بس دیکھنے کے لائق ہے۔ غرض ہر کیفیاتی مقام کا یہی حال ہے کہ آپ اس کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتے۔ خواہ نفسانی مقام ہو، خواہ مادّی کیفیت ہو۔ صاحبِ کیفیت اور صاحبِ مقام بن جائیں۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

تعبیرِ کیفیت ناممکن ہے...... اور بظاہر اس کی بناء یہ ہے کہ جس قدر بھی کیفیات ہیں وہ امورِ کلیہ نہیں۔ وہ شخصی چیزیں ہیں، اگر امورِ کلیہ ہوں تو ان کو تو آپ تقریر و بیان سے بیان کر سکتے ہیں جن کا تعلق سارے انسانوں سے ہے۔ وہ امورِ شخصیہ ہیں، کسی کی کوئی کیفیت کسی کی کوئی کیفیت ہے کوئی کسی حال میں ہے۔ کوئی کسی مقام پر ہے۔ اور ایک کا مقام دوسرے کے لئے حجت نہیں۔ اپنے آپ کو آدمی خود ہی سمجھتا ہے اور خود ہی محسوس کر سکتا ہے اگر کلیاتی چیزیں ہوں تب تو ان کی تعبیر ہو لیکن جب وہ امورِ جزئیہ ہیں اور ان کا تعلق بھی کیفیات سے ہے تو ان کے لئے تعبیر رکھی نہیں گئی اور جتنی ہو سکتی ہے بس وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دی ہے۔ آگے نہ کسی کی جرات ہے نہ قوت ہے۔

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام   بس سخن کوتاہ باید والسلام

خام کبھی پختہ کار کی کیفیات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ جواب یہی ہوگا کہ تم پہلے پختہ کار بن جاؤ، پھر خود سمجھ لوگے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

کسی نے سوال کیا تھا کہ عاشقی کسے کہتے ہیں؟ عاشقی کیا ہوتی ہے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست   گفتم کہ چوں ما شوی بدانی

مجھ جیسے عاشق بن جاؤ، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ عاشقی کیا ہے۔ لفظوں میں کیسے بتلا سکتا ہوں

انسان کی قوتِ بیانیہ کا عجز...... اچھا یہ تو کیفیات ہیں جو باطنی چیزیں ہیں۔ انسان کے چہرے مہرے کی ایک آن اور شان ہوتی ہے۔ وہ لفظوں میں نہیں آ سکتی یعنی آپ چہرے کی تصویر کھینچ دیں گے لیکن چہرے کی جو آن بان ہے، اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ وہ تو جب سامنے ہوگا۔ اس کی ادائیں سامنے آئیں گی۔ آپ سمجھیں گے یہ محبوب ہے۔ لیکن لفظوں میں یہ آئیں یہ ممکن نہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواھد کشید

آدمی صورت کھینچ سکتا ہے۔

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواھد کشید   لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواھد کشید

صورت آدمی کھینچ سکتا ہے لیکن اس کے ناز و ادا کو کیسے کھینچے گا، الفاظ میں کیسے [illegible] گا۔ کاغذ سے اس کا

کوئی تعلق نہیں۔اس کا تعلق احساسات اور ادراکات سے ہے اور وہ ادراک باطنی ہے۔تو بہت سی ادائیں جو آنکھوں سے نظر آتی ہیں، بیان نہیں کی جاسکتیں۔اور کیفیاتِ روحانی ونفسانی، یہ تو آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتیں۔ان کو آدمی کیسے بیان کرے گا۔؟ یہ تو آنکھوں دیکھی چیز ہے جب اسے بیان نہیں کرسکتا۔غرض انسان کو بیان کی قوّت نہایت محدود دی گئی ہے، ہاں جو چیز جسمانی ہو لفظوں میں بھی آسکتی ہو، آواز کی گرفت میں بھی آسکتی ہو، اسے ہم بیان کرسکیں گے، جو نہ آواز کی گرفت میں آئے، نہ لفظوں کی گرفت میں آئے، اسے کیسے بیان کریں؟ سوائے اس کے کہ سکوت کرکے صاحب مقام پر محوّل کردیں کہ جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔

عدمِ احصاءِ ثناءِ باری کی وجہ...... اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ شانہٗ کی مدح وثناء اتنی انتہاء کو پہنچائی کہ عالم میں اتنی مدح وثناء کرنے والا کوئی نہیں۔جتنی حمد وثناء حق تعالیٰ شانہٗ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے اور تعریف، وتوصیف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہے، کسی نے نہیں کی۔لیکن اخیر میں فرماتے ہیں۔ ’’اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ.‘‘ ① ’’اے اللہ! میں تیری ثناء وصفت کا احاطہ کرہی نہیں کرسکتا۔بس مختصر یہ کہ تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے کو فرمایا ہے‘‘۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ثناء وصفت مقاماتِ کمال کی ہوتی ہے۔اور کمالاتِ الوہیت انبیاء علیہم السلام جتنے دیکھ سکتے ہیں۔اتنی ثناء کرسکتے ہیں۔باقی کمالاتِ الوہیت لفظوں کی گرفت میں تھوڑا ہی آسکتے ہیں۔جب بندوں کے مقامات بندوں کے قبضے میں نہیں آتے تو الوہیت کے مقامات کس طرح سے بندوں کے قبضے میں آجائیں گے، تو سوائے اس کے کہ سپر ڈال دی جائے اور عجز کا اقرار کیا جائے، کچھ نہیں ہوسکتا ؎

نہ ہر جا مرکب تواں تاختن ‏ ‏ ‏ ‏ کہ جاہا سپر باید انداختن

ہر جگہ گھوڑا نہیں دوڑایا جاسکتا۔بہت سی جگہیں آتی ہیں کہ لگام روک لینا پڑتا ہے اور آدمی سپر ڈال دیتا ہے کہ اس خاردار جنگل میں میں نہیں گھس سکتا، گھوڑا وہیں دوڑے گا کہ زمین سیدھی ہو، گھاس بچھی ہوئی ہو۔اور جہاں اونچ نیچ ہو، پہاڑ ہوں، گھاٹیاں ہوں اور نشیب وفراز ہوں وہاں گھوڑا بیچارہ کیا دوڑے گا، وہاں تو خیال بھی نہیں دوڑ سکتا چہ جائیکہ گھوڑا دوڑے۔میری ایک لمبی چوڑی نظم تھی، وہ تو یاد نہیں ہے۔اس میں، ایک شعر یاد ہے، وہ حق تعالیٰ کی ثناء وصفت کے بارے میں ہے ؎

خدا کی ثناءِ کامل یہی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ہم سے کچھ ثنا ممکن نہیں

جو یوں کہہ دے کہ میں آپ کی تعریف کرہی نہیں کرسکتا۔اس نے تعریف کی۔جو تعریف کرنے کا مدعی بن کے بیٹھے، ممکن نہیں کہ کرسکے۔ترکِ دعویٰ کردینا ہی تعریف ہے۔

تسلیمِ عجز ادائیگیٔ شکر ہے...... اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا کہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، ص: ۷۵۴، رقم: ۱۰۹.

﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ① ''اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو''۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کا وصف اور خلق شکر انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہے۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام پر شکر کا غلبہ ہے۔ تو امر کیا گیا کہ شکر ادا کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے امر اور حکم کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا، وہی سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے اور کیا مقصد ہے۔ تو عرض کیا کہ اے اللہ! یہ تو میرا فرض ہے کہ میں شکر ادا کروں اور جب حکم ہے تب تو میں شکر ادا کروں گا ہی۔ مگر حیران یوں ہوں کہ کس طرح شکر ادا کروں، اس لئے کہ نعمتوں کے اوپر جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، جب آپ توفیق دیں گے جبھی تو ادا کروں گا۔ اور توفیق دینا یہ خود ایک نعمت ہوگی، تو اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ یہ ایک اور نعمت بن گئی۔ تو پہلے اس نعمت کا شکر ادا کروں گا بعد میں اس کا۔ اور جب اس کا ادا کرنے بیٹھوں گا، اس کی توفیق بھی آپ دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت ہوگئی تو پہلے اس کا۔ اس طرح ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو شکر کی ابتداء ہی نہیں کر سکتا تو کس طرح سے شکر ادا کروں، بس میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔ میرے قبضہ قدرت میں آپ کا شکر ادا کرنا ہے ہی نہیں، حق تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا ''اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تم ادائے شکر سے عاجز ہو، تو یہ اقرار کر لینا ہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو شکر کا ادا کرنا یہی ہے کہ عجز تسلیم کر لے''۔

اس لئے کہ کوئی بھی بندہ کمالاتِ الٰہیہ کا حق ادا نہیں کر سکتا، یہی کہے گا کہ اے اللہ! عاجز ہوں۔ تو عجز مان لینا یہی ادائے حق ہے۔ ورنہ اگر واقعی شکر کی ادائیگی لازم ہو تو حقوق تو لامتناہی ہیں اور بندہ متناہی اور محدود ہے، یہ کیسے کرے گا؟ لامتناہی کا حق متناہی نہیں ادا کر سکتا۔ تو حق تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ لامحدود شکر کی ادائیگی یہ ہے کہ اپنا عجز مان لے کہ ہم عاجز ہیں۔ بس ہم سمجھ لیں گے کہ اس نے شکر ادا کر دیا۔ یہی ثناء وصفت کا حال ہے۔ ''لَآ اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ .''

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حمد وثناء کرنے والا عالم میں کوئی نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عارف باللہ کوئی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معرفت کے اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ انبیاء اور ملائکہ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اخیر میں آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ فرماتے ہیں کہ: ''لَآ اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ .''

یاجوج ماجوج میزانِ تحقیق پر...... یہ امرِ حق ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا، یاجوج ماجوج ایک قوم ہے جو قربِ قیامت میں نکلے گی۔ اور ان کے اوصاف بیان کئے کہ وہ پورے عالم پر چھا جائیں گے اور دریاؤں کا پانی پینے پر آئیں گے تو دریاؤں کو خشک کر دیں گے، لوگوں کے اموال پر اس درجے غاصب بنیں گے، ساری اشیاء ان کے قبضے میں آجائیں گی، اس طرح کی علامتیں یاجوج موجوج کی بیان فرمائی گئی ہیں۔

① پارہ: ۲۲، سورة السبأ، الآية: ۱۳.

لیکن زیادہ تفصیل نہیں فرمائی گئی کہ کون ہوں گے؟ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانوں میں سے ہی ہوں گے، کوئی جنات میں سے نہیں ہیں۔ صحیح روایات اور قرآن کریم میں ان کے بارے میں جو آیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک قوم ہے جو قوی ہوگی، پورے عالم پر چھا جائے گی۔ پورے عالم کے خزائن اور دفائن پر قبضہ کر لے گی۔ اور انسانوں کو عام طور سے قابو میں لے لے گی۔ چاہے ختم کر دے، چاہے باقی رکھے۔ پورے عالم میں اس کا اقتدار پھیل جائے گا اور ساری زمین کے خزائین اور دفائن ان کے قبضے میں آ جائیں گے۔ جسے چاہیں دیں۔ جسے چاہیں نہ دیں تو روایات میں اس قسم کے احوال اور ان کی صفات آتی ہیں۔ اب آگے یہ کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلی روایات ہیں، مستند روایات نہیں ہیں۔

اقوامِ یورپ کو یاجوج ماجوج قرار دیا جا سکتا ہے؟...... اب اس میں علماء کی بحثیں ہیں۔ بعض محقق علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ یورپ کی اقوام کو ''یاجوج ماجوج'' قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جتنی علامتیں فرمائی گئی ہیں یہ سب ان کے اوپر منطبق ہوتی ہیں۔ پورے عالم اسلام پر ان کا تسلّط بھی ہے، پورے عالم کے خزائن اور دفائن بھی ان کے ہاتھ میں آ گئے۔ دنیا کی ہر قوم گویا ان کے قابو میں ہے، جسے چاہیں نپچا کے ختم کر دیں۔ چاہیں آگے بڑھا دیں۔ تو پورے عالم پر اس طرح سے ان کا اقتدار چھایا ہوا ہے۔

سدِّ سکندری...... اب آگے جو چیزیں آتی ہیں کہ وہ سدِّ سکندری کے پیچھے ہیں اس کو وہ چاٹتے ہوں گے اور چاٹ چاٹ کر خستہ کر دیتے ہیں اور قربِ قیامت میں وہ انشاء اللہ کہہ کے بڑھیں گے تو وہ ختم ہو جائے گی اور وہ باہر نکل پڑیں گے۔ اس میں پھر تاویلیں کی گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ من جانب اللہ، ان کے اوپر ایک روک ڈالی گئی ہے۔ وہ قربِ قیامت میں اٹھا دی جائے گی، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دیوارِ مادّی ہو۔ اور پہاڑوں کے اندر بنائی گئی ہو۔ بہر حال بعض حقیقت کے قائل ہیں کہ واقعی دیوار ہے اور قوم اس کے پیچھے ہے اور وہ اسے چاٹتی ہے۔ چاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے توڑنے پھوڑنے کی فکر میں ہے۔ مگر قابو نہیں ملتا۔ جب ان کے خروج کا وقت آئے گا تو من جانب اللہ قدرت دے دی جائے گی۔ توڑ کر نکل پڑیں گے۔ اور جو اس کے قائل ہیں کہ یہ موجودہ یورپ کی اقوام ہیں۔ یہی ''یاجوج یا ماجوج'' ہیں۔ وہ اس کو مجازات پر محمول کرتے ہیں۔ حقیقت پر محمول نہیں کرتے۔

آیتِ قدرت...... لیکن قرآن کریم اور احادیث کے الفاظ سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک حقیقت بن سکے، مجاز لینا یہ اصول کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں ہے کہ کوئی قوم ہو اور وہ پہاڑوں کے آگے پیچھے بند ہو اور واقعی میں سد سکندری ہو جس تک ابھی ہماری نگاہیں نہیں پہنچیں۔ اور وہ اس کو توڑنے پھوڑنے میں لگے ہوئے ہوں اور اخیر زمانہ ایسا آئے کہ وہ نکل پڑیں، اس لئے کہ قران وحدیث سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی قوم ہے۔ عام طور پر جیسے انسان ہوتے ہیں، اس انداز کے نہیں ہیں۔ چاہے وہ بشر ہی ہوں مگر غیر معمولی ہیں۔ اور ان کے اسباب ووسائل بھی کچھ غیر معمولی ہوں گے۔ اس کا ایک ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ ان اقوام کو نہ مانا جائے

بلکہ وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کو محبوس رکھا ہے، وہ اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔ جیسے دجال کا ظاہر ہونا اس کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ قربِ قیامت میں آگ کا ظاہر ہونا قدرت کی نشانی ہے۔ اسی طرح سے اس قوم کا ظاہر ہونا یہ بھی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ مگر غیر معمولی چیز ہے۔ لیکن صحیح کیفیت کی تفاصیل زیادہ موجود نہیں ہیں، بس قیامت کی علامات میں سے ہے، جہاں اور غیر معمولی سینکڑوں چیزیں ظاہر ہوں گی، ان میں ایک یہ بھی ہے۔ ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ ① اِدھر سے اُدھر ہر گھاٹی میں سے نکلتے ہوئے نظر آ رہے ہوں گے۔ یورپ والوں کی یہ صورت نہیں ہے، ان کا تو ایک مستقل ملک ہے، وہ آتے ہیں، جاتے ہیں مگر تجارت کی لائین سے دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔

لیکن یہ کہ وہ ایک غیر معمولی انداز سے اس طرح خروج کریں کہ عالم میں ہر گھاٹی سے نکل کر ایک نئی قوم آ رہی ہو، یہ صورت نہیں ہے۔ بہر حال الفاظ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدرت کی غیر معمولی نشانی ہے جو قربِ قیامت میں ظاہر ہوگی۔ اب اس غیر معمولی کو غیر معمولی سمجھ کر ایسے اوصاف بیان کرنا کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے یا ان کے کان لمبے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلیات ہیں۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ...... ہمارے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی کچھ اس طرف مائل تھی کہ شاید یہ قومیں مراد ہوں۔ قطعی طور پر تو نہیں فرماتے تھے مگر خیال ظاہر فرماتے تھے کہ شاید یہی مراد ہوں۔ کیوں کہ بہت سی علامتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

اقوامِ یورپ کے مورثِ اعلیٰ کا نام ...... اور کل ہی یہ ذکر ہو رہا تھا کہ انگلینڈ میں جو اسمبلی ہال ہے، جو بہت پرانا اور قدیمی ہے، اس کے دروازے پر پتھر سے کندہ ہے۔ یا گوگ ما گوگ۔ اس کو اگر معرّب کیا جائے تو یاجوج ماجوج بنتا ہے۔ گویا وہ خود اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ۔ ہاشمی صاحب بیان کر رہے تھے کہ روس والے کہتے ہیں کہ ہمارا مورثِ اعلیٰ، جس کی ہم اولاد ہیں، اس کا نام "ماگوگ" تھا۔ اس قسم کی علامتیں دیکھ کر بعض علماء کا رجحان اس طرف ہو گیا کہ شاید یہی یاجوج ماجوج ہوں۔

ظہورِ خاتم الدجّالین کے آثار ...... آفتاب کے نمایاں ہونے سے پہلے اس کے آثار نمایاں شروع ہونے لگتے ہیں۔ پھر پو پھٹتی ہے۔ اسی طرح آفتابِ نبوّت کے طلوع سے پہلے قلوب کے اندر آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ تو جس طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار نمایاں ہوئے تاکہ صلاحیت اور استعداد ان کے دین کے قبول کرنے کی پیدا ہو۔ یہی صورت بعینہٖ دجّال کی ہے کہ اس کے ظہور سے پہلے قلوب میں دجل و فساد، ڈپلومیسی، مکاری وعیاری اور دغابازی، اس کے آثار اور صلاحیتیں پیدا ہونی شروع ہوں گی۔ اس درجہ کو ہر انسان اپنی اپنی بساط کے مطابق محسوس کرے گا کہ قلب کے اندر کچھ ظلمت اور کدورت اور کچھ فریب ہے اور دنیا کے تمدن

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، آیت: ۹۶۔

کی بنیاد بھی فریب اور دکھلاوے پر نمایاں ہونا شروع ہوگی۔ تو اس قسم کی چیزیں نمایاں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جب وہ ظہور کرے گا، اس وقت ہزاروں قلوب اس کو ماننے کے لئے مستعد ہوں گے۔ سوائے ان کے جن کے قلوب کے اندر ایمانوں کی صلاحیت بہت اقویٰ ہے۔ وہ نہ جھکیں گے لیکن عام طور سے اثر پیدا ہوگا۔ تو جس طرح سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل صلاح کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے تو ضروری ہے کہ خاتم الدجّالین سے پہلے قلوب دجل وفساد اور مکروفریب کو قبول کریں، گویا دنیا سے اخلاص مضمحل ہونے لگے اور مکروفریب دنیا پر غالب آنے لگے، یہاں تک کہ وہ ظاہر ہو جائے۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے دجّال کا تقابل ...... چوں کہ خاتم الانبیاءِ کمالات سے بھرپور ہیں اور ختم کرنے والے یعنی سارے کمالات کے منتہٰی ہیں۔ تو دجّال سارے فسادات کا منتہٰی ہوگا۔ اور اس درجہ کو کہ جیسے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں مونڈھے کے قریب مہر نبوت تھی، جس پر یہ لکھا ہوا تھا جیسے کہ بعض روایات میں ہے۔ ”سِرْ حَیْثُ شِئْتَ فَاِنَّکَ مَنْصُوْرٌ.“ ①
”تم جہاں بھی جاؤ، نصرتِ خداوندی تمہارے ساتھ ہوگی“۔

بعض روایات میں ہے کہ لفظ خاتم الانبیاء ”یَا مُحَمَّدُ“ کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ ایسا کچھ مترشح ہوتا ہے، اس کی بیّنت احادیث میں آتی ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اس درجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمالات نبوّت سے بھرپور ہیں کہ وہ چھلک کے اوپر آگئے اور نمایاں ہوگئے، اسی طرح سے خاتم الدجّالین دجل وفریب میں اتنا بھرپور ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا، ک۔ف۔ر۔ یعنی کفرِ مجسم۔ تو علامت اوپر آجائے گی، غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھیک تقابل ہے۔

تقابلِ اضداد کی حکمت ...... اس امت میں جس درجہ کمالات ظاہر ہوئے، اسی درجہ فسادات کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اوّل تو کمال سے فساد کا تقابل ہوتا ہے۔ ہر کمال کی خوبی تب کھلتی ہے جب اس کے مقابلے میں نقص آتا ہے۔ ایمان کی قوت تب کھلتی ہے۔ جب اس کے مقابلے میں کفر آجائے۔ ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ ② ہم باطل کو ٹکرا دیتے ہیں حق سے اور جب وہ حق سے ٹکر کھا کر پاش پاش ہوتا ہے تو حق کی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اگر باطل نہ رکھا جائے تو حق کی قوت نمایاں نہ ہو۔ تو اضداد رکھی گئیں

اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں دجّال رکھے گئے، جس درجے کا نبی اسی درجے کا دجّال۔ بہرحال میری غرض یہ تھی کہ جیسے شیاطین کا مقابلہ ملائکہ سے ہے، دجّالوں کا مقابلہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہے۔ انبیاء کے متبعین میں جو قُبل لوگ ہیں انہیں آئمہ ہدایت کہتے ہیں۔ ادھر کفر کے سلسلہ میں آئمہ الکفر ہیں۔ تو آئمہ ہدایت کا آئمہ ضلالت سے مقابلہ ہے۔ اسی طرح اتقیاء کا مقابلہ فجّار سے ہے۔ اوپر سے لے

① الحديث اخرجه الشيخ الصالحي الشامي في "سبل الهدى والارشاد" وقال، قال ابن دحية: وهذا غريب واستكروه ج: ۲ ص: ۵۲. عمدة القاري، كتاب الوضو، باب استعمال فضل وضو الناس، ص: ۲ لرقم ۱۳۱. ② پاره: ۱۷، سورة الانبياء الآية: ۱۸.

کر نیچے تک تقابل چل رہا ہے۔ بہر حال حضرات انبیاء علیہم السلام سے دجالین کا مقابلہ ہے۔اسی لئے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے خاتم الدجالین کا مقابلہ ہے۔

استدراجِ دجّال......ظاہر بات ہے کہ جس پر دجل کے سارے مراتب ختم ہوں گے، معمولی قسم کی روحانیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بڑے بڑے اولیاء کاملین بھی اس کے مقابلے سے عاجز ہوں گے۔اسی لئے حدیث میں حکم فرمایا گیا کہ: دجّال ظاہر ہو تو سیر و تماشے کے طور پر بھی اسے دیکھنے کے لئے مت نکلو۔ وہ ایمانوں کو اس طرح سلب کرے گا جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف جذب کر لیتا ہے۔تو تماشا دیکھنے کے لئے بھی مت جاؤ۔ بلکہ مقفّل اور محبوس ہو جاؤ۔ اس کے سامنے مت جاؤ، گویا یہ اس کی علامت ہے کہ کوئی کتنا بڑا صالح ہوگا، روحانیت والا ہوگا لیکن اس کا دجل اور فریب اور جو اس کے ہاتھ پر کرشمے استدراج کے طور پر ظاہر ہوں گے، وہ اتنے بڑے ہوں گے کہ ولایت کام نہیں دے گی، کوئی کتنا ہی بڑا ولی ء کامل ہو کر اس کا مقابلہ کرے۔ جب تک نبوّت کی قوت مقابلہ پر نہ آئے۔کیوں کہ اصل دجّال کا مقابلہ ہی نبوّت سے ہے۔

قتلِ دجّال کی صورت......اب ایک صورت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینی چاہیئے۔تب تو وہ قتل ہو۔عام ولایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔غرض ایک صورت تو یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دجّال کو ظاہر کر دیا جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قتل کر دیتے۔ وہ قتل تو ہو جاتا۔لیکن اگر وہ اس زمانے میں ظاہر ہو کر قتل ہو جاتا تو اس کے دجل وفریب کے جو مراتب اور مقامات ہیں، وہ نہ کھلتے کہ ان سے تقابل ہو کر ایمان کی قوتیں ظاہر ہوتیں۔ بلکہ وہ یکدم سامنے آتا اور ختم ہو گیا ہوتا۔اور مقصد یہ تھا کہ دجّال ظاہر ہو اور اس کے سبب باطل کی استعدادیں پیدا ہوں۔اس باطل سے پھر حق کی قوتیں ٹکرائیں۔اور حق کی قوت نمایاں اور واضح ہو، اگر اس وقت ظاہر ہوتا تو یہ تقابل ختم ہو جاتا بس وہ ہاتھ کے ہاتھ قتل ہو جاتا۔اس لئے اس کا ظہور آخر دور میں رکھا گیا تاکہ اس کے قلب کے اثرات سے امت میں باطل بھی ظاہر ہوتا رہے۔اور اسلام اس کا مقابلہ بھی کرتا رہے۔

اب دوسری صورت قتل کی یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک باقی رکھا جاتا کہ وہ ظاہر ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قتل کر دیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے فروتر بات ہے کہ محض قتل دجّال کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم میں باقی رکھا جاتا۔نیز یہ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھا جاتا تو دجل وفساد کے مراتب سامنے نہیں آسکتے تھے۔نبوّت کی قوتیں اتنی پھیلی ہوئی ہوتیں کہ دجل کچھ نہ کر سکے، تو اسے بھی موقع دینا تھا کہ وہ نمایاں ہو اور پھر شکست کھائے تاکہ دجل کا ضعف حق کے مقابلے میں واضح ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کو قاتلِ دجّال بنانے کی حکمت......اب کئی چیزیں پیدا ہو گئیں۔دجّال کا قتل بغیر نبوّت کی طاقت کے نہیں ہو سکتا۔اور نبوّت بھی معمولی نبوت نہیں بلکہ ختم نبوّت کی قوت ہو جب وہ ختم ہو۔ ولایت کام نہیں دے سکے گی۔اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا باقی رکھا جانا بھی مصلحت کے خلاف تھا کہ محض اس کے قتل کے

لئے باقی رہیں۔ اب اس کے جمع کی صورت حق تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ: حضرت مسیح علیہ السلام کو دجال کا قاتل قرار دیا۔ ان میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں متعدد مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں جو اور انبیاء علیہم السلام میں نہیں ہیں۔

وصفِ خاتمیّت میں مماثلت...... مثلاً پہلی بات یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور خاتمیّت کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ تو ایک گونہ خاتمیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی ہے کہ وہ خاتم انبیاءِ بنی اسرائیل گویا ہیں جو سب سے بڑا دورِ جو نبوت کا ہے، وہ اسرائیلی نبوّت کا ہے۔ ہزار ہا انبیاء اس کے اندر پیدا ہوئے اور فرمایا گیا ﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ہم نے اس خاندان کو جہانوں پر برگزیدہ کیا۔ اور اس خاندان میں ہم نے نبوت بھی دی اور بادشاہت بھی دی۔ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② نبوت کی دولت دی، ملوکیت کی دولت دی اور وہ نعمتیں دیں جو عالم میں ان سے پہلے کسی قوم کو نہیں دی گئیں، ایک عظیم انسانی خاندان جس میں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ اس کے خاتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان پر آ کر اسرائیلی نبوّت منتہی ہوگئی۔ تو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق نبوّت کے خاتم ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام خاتم انبیاءِ بنی اسرائیل ہیں۔ تو خاتمیّت کے مقام میں ایک گونہ گویا مناسبت ہوئی۔

وصفِ رحمت میں مماثلت...... پھر جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمتِ مجسم فرمائی گئی ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ③ یہی رحمتِ مجسّم حضرت مسیح علیہ السلام کی شان بتلائی گئی ہے۔ جہاں ان کی پیدائش کا ذکر ہے اس میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا﴾ ④ جب حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾ ⑤ ’’میرے بیٹے کہاں سے ہوسکتا ہے۔ بشر نے مجھے چھوا نہیں، زانیہ و باغیہ میں نہیں ہوں‘‘۔ ﴿قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾ ⑥ یوں ہی ہوگا۔ اللہ کا حکم ہو چکا ہے۔ اور یہ اس لئے ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام کو ہم نے اپنی قدرت کی نشانی بنانا ہے، بطورِ نشانِ قدرت کے ہم نمایاں کریں گے کہ بلا باپ کے بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ اور یہ امر طے شدہ ہے۔ ایسے ہی ہوگا۔ جو رحمت مجسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا۔ وہی رحمت مجسّم ہونے کی شان حضرت مسیح علیہ السلام کی فرمائی گئی۔

تربیّتِ اِتباع میں مماثلت...... جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان فرمائی گئی ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ⑦ خود ان صحابہ میں رحمت کا غلبہ ہے۔ وہی شان متبعین عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں

① پارہ: ۲۵، سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ الآیۃ: ۲۰۔ ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء الآیۃ: ۱۰۷۔
④ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱۔ ⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۰۔ ⑥ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱۔
⑦ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، آیت: ۲۹۔

فرمائی گئی۔فرمایا گیا﴿ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً﴾ ① ''ان کے اتباع کرنے والوں کے قلوب میں ہم نے رافت اور رحمت بھردی۔'' اتباعِ عیسوی میں غضب کا غلبہ نہیں تھا بلکہ رحمت کا غلبہ تھا۔تو جو غلبہ اصحابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں فرمایا گیا وہی غلبہ اصحابِ عیسوی کے اندر فرمایا گیا۔اس کا حاصل یہ نکلا کہ تربیّت کے اندر مشابہت ہے۔جو شانِ تربیّت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے وہی شانِ تربیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ہے جو شانِ رحمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔اسی کے قریب شانِ رحمت حضرت مسیح علیہ السلام میں ہے،غرض یہ مناسبات ہیں۔

زہد وشوکت کی زندگی میں مماثلت ...... اس کے ساتھ ساتھ ایک اور قوی مناسبت یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو زندگیاں عطاء کی گئیں۔ایک مکّی زندگی کہلاتی ہے۔ایک مدنی زندگی کہلاتی ہے،مکہ کی زندگی تیرہ سالہ اور مدینہ کی زندگی دس سالہ ہے۔اس طرح نبوّت کے تئیس برس ہوتے ہیں۔تو مکّہ کی تیرہ سالہ زندگی انتہائی زہد اور قناعت کی ہے جس میں تشدد کی اجازت نہیں مار کھاؤ،سہو اور جواب نہ دو۔﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ ② اے نبی درگزر اختیار کرو۔کہیں فرمایا﴿اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ﴾ ③ اگر یہ بک بک بھی کریں تو تم اعراض کرو۔درگذر کرو۔جاہلوں کی باتوں کی طرف دھیان مت کرو۔اگر یہ تمسخر بھی کرتے ہیں تو انہیں ہم پر چھوڑ دو۔انہیں ہم نپٹ لیں گے۔آپ انہیں جواب نہ دیں۔کہیں فرمایا﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا. اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا﴾ ④ اگر یہ ایذائیں پہنچائیں تو آپ تحمل کریں اور صبرِ جمیل اختیار کریں۔کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا انجام کچھ دور ہے۔حالاں کہ وہ بہت قریب آ گیا ہے۔عنقریب ان کو پتہ چل جائے گا کہ ان کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

غرض جگہ جگہ حکم ہے کہ نہ تلوار اٹھاؤ۔نہ زبان کھولو، نہ ہاتھ ہلاؤ، ماریں تو مار کھاؤ، گالیاں دیں تو چپ ہو جاؤ۔ہاں کیا کرو﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ⑤ ان کے ساتھ جہادِ کبیر کرتے رہو۔اس کے راستے میں مار کھانی پڑے تو مار کھالو، پٹنا پڑے پٹ لو۔گویا تلوار کے جہاد کو جہادِ صغیر کہا گیا۔اور زبان سے اعلائے کلمۃ اللہ کو کہا گیا کہ وہ جہادِ کبیر ہے،وہ جہاد کرتے رہو،لیکن مار کھانے کے لئے تیار رہو،مقابلہ میں اف نہ کرو۔تیرہ سال اس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گذری ہے۔

جب مظالم کی انتہاء ہوگئی کہ گالیاں بھی دی گئیں،ساحر بھی کہا گیا۔کذاب ومجنون بھی کہا گیا اور اشرّ بھی کہا گیا اونٹ کا بوجھ بھی ڈال دیا گیا،کانٹے راستے میں بچھائے گئے۔کتے بھی پیچھے لگائے گئے۔پتھر بھی مارے گئے

① پارہ:۲۷،سورۃ الحدید،الآیۃ:۲۷. ② پارہ:۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ:۸۵.

③ پارہ:۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ:۹۴،۹۵. ④ پارہ:۲۹،سورۃ المعارج،الآیۃ:۵ تا ۷.

⑤ پارہ:۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ:۵۲.

اور اخیر میں وطن سے نکلنے پر مجبور کردیا۔ تو وطن سے بے وطن بھی کیا۔ جب ظلم کی انتہا ہوگئی تب یہ آیت نزل ہوئی: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ﴾ ① اب ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن کی مظلومیت کی حد آ گئی ہے، کہ اب وہ مقابلہ کریں اور جواب دیں۔ بہر حال دس سالہ زندگی شوکت کی زندگی ہے۔ اور تیرہ سالہ زندگی درویشی اور انتہائی فقر وقناعت کی زندگی ہے، تیرہ سالہ زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ مدینے کی زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ لیکن اس شوکت کا پیش خیمہ یہی تیرہ سالہ زندگی بنی اس لیے اس تیرہ سالہ زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین کی تربیّت کی زہد وقناعت، صبر وحیا، شجاعت وسخاوت بھر دی تاکہ تیرہ برس کے بعد جب یہ مجاہد قوم نکلے تو حظِ نفس کی وجہ سے جہاد نہ کرے، نفسانیّت کی وجہ سے نہ کرے بلکہ خالص للّٰھیّت کے جذبہ سے میدان میں آئے۔

تو تیرہ برس تربیّت کی تاکہ مخلص مجاہد پیدا ہو جائیں۔ اخیر میں جا کے انہوں نے تلوار اٹھائی اور قتال کیا۔ پھر فتح مکّہ ہوئی، شوکت کا آغاز ہوا اور یہ سارے کام ہوئے۔ غرض یہ دو زندگیاں۔ اور یہ دونوں باتیں حضرت عیسیٰ السلام میں پائی جاتی ہیں، ایک عیسیٰ علیہ السلام کی چالیس سالہ زندگی ہے یعنی پیغمبری کی ابتداء۔ ان کی تاریخ یہ ہے کہ اگر تمہارے بائیں گال پر کوئی تھپڑ مارے۔ داہنا سامنے کر دو، اف نہ کرو، جواب نہ دو، حضرت مسیح علیہ السلام کی شریعت میں انتقام لینا جائز نہیں ہے بلکہ عفو اور درگزر واجب ہے، غرض تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی مارے تو اور گردن جھکا دو کہ بھئی! ایک اور مارتا جا، خدا تیرا بھلا کرے، یہ گویا مکّہ کی زندگی کے مشابہ ہے کہ جس کے اندر نہ ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے، نہ زبان کھولنے کی اجازت۔ لیکن جب مظلومیت کی انتہاء ہوئی۔ یہود نے یہاں تک کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر لٹکا دو۔ تب حق تعالیٰ شانہ نے دوسرا بندوبست کیا کہ جو پھانسی پر چڑھانے کے لئے اندر گھسا۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈال دی اور وہ پھانسی پا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انتہائی عزّت کے ساتھ اوپر اٹھا لیا گیا۔ دنیا چاہتی تھی کہ انتہائی طور پر ذلیل کریں کہ اس دنیا کے اندر ان کا وجود نہ رہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنی عزّت دیں گے کہ آسمانوں پر قیام کرائیں گے اور زندہ رہیں گے، یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔

﴿وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ ط وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ ط مَالَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا ○ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ﴾ ② نفی کی گئی ہے کہ نہ انہیں پھانسی دی گئی ہے نہ انہیں قتل کیا گیا، جو قتل یا پھانسی کے مدعی ہیں وہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس شخص کے اوپر شبیہ ڈالی گئی ہے جو لینے کے لئے اور پکڑنے کے لئے گیا تھا، اس کو قتل کیا گیا۔ انہیں علم نہیں ہے۔ اور اخیر میں پھر مؤکد طریق سے کہا کہ انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ تو جب قتل نہیں کیا اور پھر موت کے سامان نہیں ہوئے تو رفع کا مطلب یہی ہے کہ

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۹. ② پارہ: ۶، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۵۷، ۱۵۸.

جسم کے ساتھ انہیں اٹھایا گیا۔ اگر قتل کر دیئے جاتے اور پھانسی دے دیئے جاتے۔ پھر روح محض کا رفع ہوتا۔ لیکن قتل اور پھانسی کی نفی کر کے فرمایا گیا کہ اللہ نے انہیں اٹھالیا تو وہ اٹھانا زندگی کے ساتھ ہوسکتا ہے اور جسم کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ کہ جیسے مظلومیت کی انتہاء پر حکم دیا گیا کہ زمین سے آسمان کی طرف ہجرت کرو، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم چاہتی تھی کہ یہ اس مکہ شہر میں نہ رہیں۔ تو ملک میں ہجرات کرائی گئی۔ یہود چاہتے تھے کہ اس دنیا میں نہ رہیں۔ اس واسطے آسمانوں کی طرف ہجرت کرائی گئی تو ایک جگہ ہجرت یثرب کی واقع ہوئی ہے اور ایک جگہ آسمان کی واقع ہوئی۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد لوٹایا گیا اور دس سالہ شوکت کی زندگی ہے کہ اس میں تلوار ہاتھ میں ہے اور فاسقین و منافقین اور فاجرین کے مقابلے پر تلوار بھی ہے، حدود بھی ہیں اور قصاص بھی ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ لائیں گے، تاکہ اس زہد کی زندگی کے مقابلے میں اب ان کے ہاتھ میں تلوار بھی ہوگی دجال کا مقابلہ بھی ہوگا، دجال کے متبعین کے مقابلے میں تلوار لئے ہوئے ہوں گے۔ قتل وقتال بھی ہوگا، جہاد میں بھی کھڑے ہوں گے۔ اور استیصال کریں گے، جیسا کہ مشرکینِ مکہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جزیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے اسلام تھا یا قتل تھا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے۔ اس وقت دنیا کی قوموں کے لئے یا اسلام ہوگا۔ یا قتل ہوگا۔ جزیہ کا واسطہ بیچ میں نہیں ہوگا۔ یہ جزیہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ تو ٹھیک مشابہت اور مناسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے، شانِ رحمت میں بھی، وصفِ خاتمیت میں بھی، اَتباع اور متبعین کی شانِ رحمت کے اندر بھی، ہجرت کے اندر بھی، دونوں زندگیوں کے اندر بھی ابتدائی زندگی عدمِ تشدد کی۔ انتہائی زندگی تشدد کی، ان سب چیزوں میں مشابہتِ تامہ آپ کو حاصل ہے۔

ولادتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں شبیہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا دخل......اور اس میں لطیفے کے طور پر ایک چیز اور بھی ہے، وہ یہ کہ شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض تابعین رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اثر نقل کیا ہے۔ وہ اس درجے میں تو نہیں ہے کہ اسے بہت بڑی حجت شریعہ سمجھا جائے، ایک تو اثر ہے، اور وہ بھی تابعین رحمۃ اللہ علیہ، کا، مگر لطیفے کے درجے میں اور مویدات کے درجے میں اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں جس کا واقعہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: حضرت جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے: ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ ① ایک بشر تام الخلقت و کامل الخلقت نوجوان جس کے کسی جوڑ و بند میں فرق نہیں تھا، نہایت حسین وجمیل صورت کا انسان نمایاں ہوا۔ جس کو

① پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۷.

دیکھ کر حضرت مریم رضی اللہ عنہا گھبرا گئیں۔ اور فرمایا: ﴿اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا﴾ ① ”اللہ کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو متقی آدمی ہے“۔ تو کہاں ایک نوجوان عورت کے پاس تخلیہ میں آیا؟ ﴿قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَ هَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا﴾ ② ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں تیرے پروردگار کا رسول اور قاصد بن کے آیا ہوں تا کہ تجھے ایک بیٹا عطا کر دوں“۔ ﴿قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا﴾ ③ میرے بیٹا کدھر سے ہو جائے گا، بشر نے آج تک مجھے چھوا ہی نہیں، بقول شخصے کسی مرد کی آج تک صورت تک میں نے نہیں دیکھی۔ اور ویسے بھی اپنی ذات سے میں کوئی بغیا اور زانیہ نہیں ہوں۔ عفیفہ اور پاکدامن ہوں۔ کبھی کوئی چیز عفت کے خلاف مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ غرض اپنی ذات سے پاک دامن۔ اور مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔ زنا کا احتمال تک نہیں، پھر کیسے بیٹے آ جائے گا؟ گویا عادتِ عامہ کے اعتبار سے حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے ظاہر کیا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آنے والے تھے، وہ خرقِ عادت کے طور پر تھے۔ عادت کے طور پر نہیں تھے۔ تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ﴿قَالَ کَذٰلِکِ. قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ﴾ ④ ”یوں ہی ہوگا اور تیرے رب پر آسان ہے“۔

جو نر اور مادّہ کو ملا کر اولاد دے سکتا ہے، وہ فقط مادّہ سے بھی دے سکتا ہے، وہ فقط نر سے بھی پیدا کر سکتا ہے، دونوں نہ ہوں، ہوا سے پیدا کر دے۔ اب میں کہتا ہوں کہ یہ ہزاروں جاندار بھنڈے اور مچھر پسو ہیں، وہاں نر اور مادّہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ہوا سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو پروردگار بلا نر و مادّہ کے جاندار پیدا کر سکتا ہے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کو بلا ماں باپ کے پیدا کر سکتا ہے۔ جو حضرت حوا علیہا السلام کو بلا واسطہ عورت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلا باپ کے کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟۔ چوں کہ خرقِ عادت کے طور پر پیدا کرنا تھا۔ مگر حضرت مریم علیہا السلام کو عادت کے طور پر اشکال تھا، اس کو دفع کر دیا کہ ﴿قَالَ کَذٰلِکِ. قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ﴾ ⑤ ”تیرے رب پر یہ آسان ہے۔ اس میں اشکال کی کوئی بات نہیں۔ غرض انہوں نے پھونک مار دی اور وہ حاملہ ہو گئیں“۔

اس پر شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام جو بشر سوی یعنی کامل الخلقت بشر کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں تو اس کے بارے میں بعض تابعین کا اثر نقل کیا کہ وہ شبیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، یعنی صورتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بن کر نمایاں ہوئے۔ تو حقیقت جبریلی تھی اور صورت محمدی تھی۔ نفخہ تو جبریلی ہوا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ہوا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں شبیہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ دخل ہے اور کچھ مناسبت ضرور حاصل ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے اوصاف میں

① پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۸. ② پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۹.
③ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۰. ④ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱. ⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱.

مناسبت ہے، وصفِ خاتمیت میں بھی، وصفِ رحمت میں بھی، اِتباع کی شان تربیت میں بھی، اور زندگیوں کے ادوار میں بھی، یہ اس شبیہِ مبارک کا اثر ہے کہ ساری مناسبتیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔

زوجیّتِ حضرت مریم علیہا السلام...... اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حضرت مریم علیہا السلام بطورِ زوجہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جائیں گی۔ یہ روایات میں موجود ہے۔ اس سے گویا مناسبت نکلتی ہے کہ شبیہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت مریم علیہ السّلام مثل زوجہ کی تھیں۔ اب اس شبیہ کے ساتھ میں وہ حقیقت اور ذات بھی پیش کردی گئی کہ اب وہ اس کے لئے زوجہ بنے۔ بہر حال یہ چیزیں لطیفے کے طور پر عرض کررہا ہوں۔ یہ تو حجت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زوجہ بنا کر دی جائیں گی۔ لیکن یہ جو اثر میں نے نقل کیا ہے، یہ اتنی قوی حجت نہیں ہے۔ مگر لطائف اور مویدات کے درجے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال اتنی مناسبتیں ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقامِ تجدید...... جب اتنی مناسبتیں ہیں اور وصفِ خاتمیت میں بھی مناسبت ہے تو قتلِ دجّال کے لے زیادہ مستحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جب کہ وہ بمنزلہ بیٹے کے بھی ہوئے۔ تو باپ کے دین اور مشن پر جب آفت آئے تو بیٹا ہی زیادہ حق دار ہوتا ہے کہ باپ کی طرف سے مدافعت کرے اور باپ کی طرف سے حمایت کرے۔ یہ دجّال گویا دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر آفت لائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ مستحق تھے کہ دین کی حمایت کے لئے بطورِ مجدّد کے بڑھیں اور قتل کریں اور دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے اندر برپا کریں۔ چناں چہ اسے قتل کریں گے۔

غلبۂ اسلام...... اور حدیث میں ہے کہ دجّال کے ساتھ کثرت سے یہود ہوں گے۔ جن کے اندر تھوڑی بہت سعادت ہوگی وہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان قبول کریں گے۔ اس لئے کہ مہدی رضی اللہ عنہ وہ تبرکات نکالیں گے جو "تابوتِ سکینہ" میں ہیں۔ اور تابوتِ سکینہ کی روایات میں ذکر آتا ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پگڑی ہوگی۔ اور "الواح تورات" ہوں گی۔ یہ تابوت جو دفن کیا تھا، اس کا پتہ نہیں ہے۔

لیکن حضرت مہدی رضی اللہ عنہ پر منکشف ہوگا، اس میں سے وہ چیزیں دکھلائیں گے۔ تو جس جس یہودی کے اندر ذرا بھی سعادت ہوگی وہ ایمان قبول کرے گا۔ اور جس نصرانی میں سعادت ہوگی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کرے گا۔

تو دنیا میں تین ہی قومیں بڑی ہیں۔ ایک مسلمان، ایک یہود، اور ایک نصاریٰ۔ یہی عظیم قومیں ہیں جو مستند ہیں۔ یہود کا وجود اس طرح ختم ہوجائے گا، جن میں سعادت ہے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے۔ جن میں نہیں ہے وہ دجّال کے ساتھ ہوجائیں گے اور مقتول ہوجائیں گے۔ ایک قوم ختم ہوگئی۔ نصاریٰ کے بارے میں یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوپر ایمان لے آئیں گے۔ یہ قوم یوں ختم ہوئی۔ اب ایک ہی قوم مسلم رہ جاتی ہے۔

وَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ. ① تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔ پورے عالم میں ایک ہی دین اور ایک ہی مذہب اور ایک ہی پلیٹ فارم ہوگا۔ اور پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نقطۂ نظر ہو جائے گا۔

غرض جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دس سالہ شوکت قائم ہوئی اور حجاز کے بارے میں فرمایا گیا ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ ② ''فوج درفوج اسلام میں داخل ہو جائیں گے''۔ تو حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے پوری دنیا کے انسانوں کا بھی یہی نقشہ ہوگا۔ کہ ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ ③

مراتبِ تکمیلِ دین کی صورتیں..... فرق کیا ہوگا؟ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ④ دین کو کامل کر دیا گیا۔ تو تکمیلِ دین کی دو صورتیں ہیں ایک کیفی طور پر ایک اور کمی طور پر۔ ایک تو کیفیت کے لحاظ سے اتنا مکمل ہو کہ ہر فردِ دین کا ایسا مجسمہ بن جائے کہ گویا اسلام مجسّم ہے۔ تو یہ کیفیت کے لحاظ سے ہے۔ اور کمیّت وتعداد کے لحاظ سے اسلام کی تکمیل کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ دنیا میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہے۔ ساری تعداد مسلمانوں ہی کی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ عدد کے لحاظ سے اب مکمل ہوا اور کیفیت کے لحاظ سے یوں تکمیل ہے کہ چاہے تھوڑے ہوں مگر ہر ایک اسلام مجسّم ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اسلام کی کیفی تکمیل کی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب قریب ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم پیدا کئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے نمونے تھے۔ اور ایک ایک فرد اسلام مجسّم تھا۔ اس لئے امّت کا اجماع ہے کہ نیت، عدل، کمالات واخلاق اور علم ومعرفت کے لحاظ سے۔ ''اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ. ''⑤ ''ان سے زیادہ متقی اور پارسا دنیا میں نہیں ہے''۔

امت میں بڑے بڑے غوث پیدا ہو جائیں۔ صحابیت رضی اللہ عنہن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے، اس لئے کہ براہ راست آفتابِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیّت کی ہے۔ اور بلا واسطہ آفتابِ نبوّت کا نور ان کے قلب پر پڑا ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علہ وسلم نے ایمان کی تکمیل کیفیت کے لحاظ سے کی۔ تعداد تو تھوڑی تھی کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب نفوسِ قدسیہ نمایاں ہوئے۔ مگر ایک ایک فرد ایک ایک امّت کے برابر تھا۔ لیکن کمّی تکمیل باقی تھی کہ عددی طور پر اسلام اتنا پھیلے کہ دنیا میں غیر مسلم کا وجود باقی نہ رہے۔ یہ تکمیل آخری مجدّد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہوگی۔ وَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ. ہر قوم ختم ہو کر ایک قوم رہ جائے گی، اور وہ اسلامی قوم ہوگی۔ تو پورے عالم میں دینِ واحد پھیل جائے گی۔

اسلام کا غلبۂ تام..... اس لئے دعویٰ فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ⑥ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا اور ہدایت بھیجی تاکہ تمام ادیان پر اس دین کو غالب

---

① پارة: ۹، سورة الانفال، الآية: ۳۹. ② ③ پارة: ۳۰، سورة النصر، الآية: ۲.

④ پارة: ۶، سورة المائدة، الآية: ۳. ⑤ عمدة القاری، کتاب الوضو، باب الماء الذی یغسل به شعر، ج: ۳، ص: ۳۹۹. ⑥ پارة: ۲۸، سورة الصف، الآية: ۹.

کردے۔ اور غلبہء تام کا حاصل یہ ہوتا ہے۔ کہ مغلوب چیز کالعدم اور صفر کے درجے میں ہو جائے، غالب ہی کا وجود رہ جائے۔ تو ایک ہی دین غالب آجائے گا جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہوگا، اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گونا گوں مشابہتیں اور مناسبتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہیں۔ اوصاف میں بھی، افعال میں بھی، وجود میں بھی، ذات میں بھی۔

اور سب سے زیادہ زمانے کے لحاظ سے اقرب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان میں کوئی نبوّت نہیں آئی، تو عہد کے لحاظ سے اشبہ ترین بھی وہی ہیں۔ تو وہ زیادہ احق تھے کہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور مدافعت کریں اور اس دجالِ اعظم کو قتل کریں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قتل نہیں کرایا گیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شبیہ کے ہاتھ سے قتل کرایا گیا۔ جس میں وہی طاقت رکھی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ آسمانی کی حکمتیں...... اور اس کے ساتھ میں ایک فائدہ اور مصلحت یہ بھی حاصل ہوئی کہ یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِىْ (1) اگر آج کے دور میں موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرا اتباع کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میرے ہی دین میں داخل ہو کر رہنا پڑتا۔ تو حق تعالیٰ نے اس کو عملی طور پر نمایاں کر دیا کہ جس قوم کی ابتداء حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی ہے اس کا نچوڑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو امتی بنا کر لایا گیا تاکہ کل اسرائیلی پیغمبر امتی شمار کئے جائیں۔ خاتم سے جو چیز سرزد ہوتی ہے وہ پورے دائرے کی شمار کی جاتی ہے۔ تو یہ بھی اس سے نمایاں ہوگیا۔ غرض خاتم الدجالین کا ظہور خاتم الانبیاء ہی کے دور میں ہونا چاہیئے تھا۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کے دور میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا حقیقی تقابل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، ولایت کی روحانیت اس کے مقابلے کے لئے کافی نہیں ہے نبوّت کی روحانیت ضروری تھی اور اس میں بھی ختمِ نبوّت کی کچھ نہ کچھ شان موجود ہوتا کہ وہ خاتم الانبیاء کی طرف سے قاتل بنے۔ اس واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع کیا گیا۔

اور اس لئے بھی رفع کیا گیا کہ یہود نے انتہائی تذلیل کا ارادہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انتہائی اعزاز دیا۔ تم ان کو زمین میں بھی رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ ہم زندگی کے ساتھ آسمانوں میں باقی رکھیں گے۔

اب آگے روایتی مسئلہ ہے تو احادیث ان مضامین سے بھری پڑی ہیں، یہ چیزیں لطائف اور اسرار کے درجے میں ہیں کہ اگر کوئی یوں پوچھے کہ مصلحت آخر کیا تھی؟ تو یہ مصالح تھیں۔ لیکن معاملے کی بنا مصالح کے اوپر نہیں ہے۔ بنا تو روایت کے اوپر ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو، حکم اپنی جگہ حق ہے۔

اسلام کی شانِ خاتمیّت...... لیکن یہ اسلام کی ایک خاتمیّت کی شان ہے کہ جو حکم آیا اس میں حکمت ضرور ہے،

(1) مسند احمد، مسند جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، ج: ۲۹، ص: ۱۵۳۔

جو کوئی امر آیا اس میں کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے۔ جو ہدایت دی گئی اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ ﴿عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ. وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ ① جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اور میرے صحابہؓ معاذ اللہ صُمًّا وَّعُمْیَانًا اندھے بہروں کی طرح سے نہیں گرتے بلکہ حجت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ دین میں بصیرت ہے، دین اسلام رسوم کا مجموعہ نہیں ہے کہ چند رواج جمع ہو گئے جن کی نہ مصلحت معلوم ہو نہ کچھ اور۔ باپ دادا سے سنتے آئے بس عمل کر لیا۔

جیسا کہ دوسرے مذاہب میں رسوم غالب ہیں۔ ان رسوم کی مصلحت پوچھی جائے تو جواب یہ ہوتا ہے کہ: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآئَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ﴾ ② باپ دادا کو اسی طرح سے کرتے ہوئے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ کوئی علت یا کوئی حکمت جو منجاب اللہ نازل کی گئی ہو نہیں ہے۔ تو اسلام ایسی چیز نہیں ہے۔ اس میں جو حکم بھی ہے اس میں حکمت ہوگی۔ جو امر ہے اسمیں کوئی نہ کوئی علت ہوگی۔ جو ہدایت ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ تو مصالح اس طرح سے عارفین نے بیان کی ہیں۔ حکم کی بناء مصالح پر نہیں ہے۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس سے ایک طمانیت حاصل ہو جاتی ہے جب مصلحت حاصل ہو جاتی ہے۔ کہ چلو مصلحت بھی سامنے آ گئی۔ لیکن نفس ایمان مصالح کے اوپر موقوف نہیں۔

تعوّذِ دجّال کی دعاء کی حکمت ...... اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دجال پیدا ہو جاتا تو اس کا فتنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر معاذ اللہ کارگر تھوڑا ہی ہو سکتا تھا۔ اس دعاء میں دجال کے پیدا ہونے یا نہ ہونے کا ذکر نہیں۔ جس میں دجال سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ'' ③ ''اے اللہ! میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگتا ہوں''۔ اس میں امت کی تعلیم مقصود ہے۔ یعنی جن لوگوں کو دجال سے سابقہ پڑے گا ان کا فرض ہے کہ وہ یہ دعاء مانگیں۔ یا جیسے فرمایا گیا جو شخص سورہ کہف کثرت سے تلاوت کرے گا بالخصوص جمعہ کے دن تو فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔

دوسرے یہ کہ ایک دجّال ذات ہے اور ایک دجّالیت ہے اور اس کے اوصاف اور اس کا فتنہ۔ اوصاف اور فتنہ اس کے ظہور پر موقوف نہیں' اس کی آمد کے قرب میں دجل وفساد کے آثار شروع ہو جائیں گے۔ وہ اس کے ظہور کا اثر ہوگا۔ جیسے آفتاب کا اثر دو گھنٹے پہلے کچھ نہ کچھ سفیدی اور کچھ چاندنا شروع ہو جاتا ہے۔ یا جیسے حدیث میں فرمایا گیا: اِذَآ اَرَادَ اللّٰہُ شَیْئًا ھَیَّأَ لَہٗ اَسْبَابَہٗ ...... جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسباب کا ایک سلسلہ بچھاتا ہے کہ تدریجاً رفتہ رفتہ ایک مدت میں جا کے وہ چیز ظہور کرتی ہے مگر پہلے سے اسباب بچھنا شروع ہو جاتے ہیں، تو دجّال کے ظہور سے پہلے اسباب مہیا ہوں گے۔ قلوب میں اس کی باتیں قبول کرنے کی استعدادیں پیدا

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔ ② پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام، ص: ٦٦، رقم: ۸۳۲۔

ہوں گی تو دجل اور فسادات اس کے آثار میں سے ہیں۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دعاء مانگنا تاسی کے لیے ہے تا کہ امت کو اسوہ معلوم ہو جائے کہ یہ دعاء کرنی چاہئے۔

عبدیّتِ عیسوی (علیہ السلام)...... احادیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسجدِ اقصیٰ کی چھت کے اوپر ملائکہ کے کندھوں کے اوپر ہاتھ ٹیک کر آئیں گے۔ اور لباس یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اوپر دو چادریں ہوں گی۔ ایک زرد اور ایک گیرو رنگ کی۔ گویا جو زہد وقناعت کا مظاہرہ ہے اسی رنگ کا لباس ہوگا۔ اور آ کر فرمائیں گے کہ سیڑھی لگاؤ' گویا جو اور فضا میں تو بواسطہ ملائکہ آئے۔ یعنی باطنی اسباب کے تحت، اور جب چھت کے اوپر آ کر ٹک گئے۔ اب مادّی دنیا کا معاملہ شروع ہو گیا۔ تو اب مادی اسباب کی طلب ہوئی کہ سیڑھی لگاؤ کہ میں اتروں۔ ورنہ ملائکہ کے واسطہ ہی سے نیچے اتر سکتے تھے، لیکن ملائکہ نے جو اور فضا تک پہنچایا جہاں اسباب نہیں پہنچتے۔ اور جہاں سے اسباب شروع ہوئے وہاں سے اسباب اختیار کئے۔ کیونکہ عبدیت کا ظہور اسی میں ہوتا ہے کہ اسباب کو قطع نہ کیا جائے، بلکہ اختیار کیا جائے۔ جب آئیں گے تو نماز کا وقت ہوگا اور حضرت مہدی رضی اللہ عنہ تواضع کریں گے کہ آپ نماز پڑھائیں۔ فرمائیں گے نہیں۔ یہ امت اللہ کے ہاں بڑی معظم ہے: وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ. (1) تمہارے حضرت امام تمہارے ہی اندر سے ہوں گے، آپ ہی احق ہیں کہ نماز پڑھائیں چنانچہ مہدی رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں گے۔ بہر حال یہ سارے واقعات تفصیل سے آتے ہیں۔

مدفنِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی قبرِ مبارک کے درمیان میں جگہ خالی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں دفن ہوں گے۔ اولاد بھی ہوگی۔ اس واسطے کہ جب آسمان پر گئے ہیں جب تک تو نکاح نہیں ہوا تھا۔ آئیں گے تو نکاح بھی ہوگا۔ اولاد بھی ہوگی، پھر وفات ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دفن ہوں گے۔

یہ تمثیلی طور پر ایسا ہے جیسے کسی کی اولاد کوئی عظیم کارنامہ کر کے باپ کے اوپر سے آفت کو ٹلائے اور فاتح بن کے آئے کہ میں نے آپ کے مشن کو بالکل محفوظ کر دیا تو باپ شاباش کے طور پر بغل میں لے لے کہ میرے قریب آجا۔ دجال کو قتل کیا، عالم میں دین پھیلایا۔ فرمایا گیا کہ اب میرے پہلو میں آجاؤ جو تمہارا حق ہے۔

علاماتِ ظہورِ مہدیؓ...... جیسی تفصیل حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے ویسی ہے ظہورِ مہدیؓ کے بارے میں بھی ہے، حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں وہ ساری حدیثیں جن میں بعض صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔ مگر ساری قابلِ احتجاج ہیں۔ وہ سب نقل کر دی ہیں، اس میں تمام علامات ذکر ہیں۔ حضرت مہدیؓ کا نسب نامہ، ان کا حلیہ اور ان کے ظہور کی نوعیت، پھر علاماتِ قریبہ اور علاماتِ بعیدہ بھی بیان کی ہیں۔ بعض وہ علامات ہوں گی جو بالکل ظہور کے قریب میں آئیں گی۔

---

(1) الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسی بن مریم، ص: ۲۸۲، رقم: ۳۴۴۹.

قریب ترین علامت مثلاً یہ فرمائی گئی کہ حجاز کے اندر سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا۔ تو سونے کی کان تو حجاز میں نمایاں ہو چکی ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا زمین اپنے خزائن اور دفائن اگلنا شروع کر دے گی، تو آج کوئی حجاز کو جا کر دیکھے تو وہاں پانی بھی ہے، سبزی بھی اگ رہی ہے، اسی طرح معدنیات کے بھی آثار ہیں، وہ بھی نکل رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرزمین حجاز نے سونا اگلنا شروع کر دیا ہے۔ دنیا کے ملکوں کے پاس آج اتنی دولت نہیں جتنی عربوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کر دے رہے ہیں۔ یہ علامتیں ہیں۔

منیٰ میں جنگِ عظیم...... مگر قریبی علامت یہ فرمائی گئی کہ: جس سال ظہور ہوگا، وہ مکہ میں ہوگا، اس سال منیٰ میں حجاج میں باہم جنگِ عظیم ہوگی اور اتنا قتل وقتال ہوگا کہ جمرۂ عقبہ خون سے بھر جائے گا اور ہزاروں انسان آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ عدد بھی مذکور ہے کہ ۳۱۳ آدمی باقی بچیں گے۔ باقی سب قتل ہو جائیں گے، اب انہیں فکر پڑے گی کہ کوئی تو ہمارا سرگروہ ہو ورنہ ہماری زندگی بھی ختم ہو جائے گی اب ہم کہاں جائیں؟۔ پھر وہ مکہ مکرمہ میں آئیں گے۔ اور وہ اس علامت کو پہچانتے ہوں گے کہ منیٰ میں قتل ہونا اور جمرہ عقبہ کا خون سے بھرنا یہی ظہور مہدیؓ کی علامت ہے، تو انہیں یقین ہوگا کہ حضرت مہدیؓ ظاہر ہوں گے اور وہ مکے میں ہوں گے، تو حدیث میں ہے کہ وہ حضرت مہدیؓ کی طرف رجوع کریں گے تو حضرت مہدیؓ ان سے چھپ کر مدینے کا راستہ لیں گے، یہ لوگ وہاں پہنچیں گے، وہ پھر چھپ کر مکے میں آئیں گے۔ پھر مطاف کے اندر یہ انہیں پکڑیں گے۔ وہ فرمائیں گے کہ میں ایسی قوم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا جو اس درجہ آپس میں خونریزی کرے۔ تم لوگوں کا کیا اعتبار ہے۔ یہ انہیں بھی دھمکی دینا شروع کر دیں گے۔ پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ اسی کے بارے میں وہ روایت ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ ایک آواز بھی غیب سے ظاہر ہوگی کہ: ''هٰذَا خَلِيْفَةُ اللّٰهِ الْمَهْدِيُّ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْهُ.''(1) ''یہ خلیفۃ اللہ حضرت مہدیؓ ہیں ان کی سمع وطاعت کرو۔''

شام کی جنگِ عظیم...... جب وہ ان سے بیعت لے لیں گے، پھر یہ آواز پھیلے گی اور شہرہ ہوگا تو پھر نجائب عراق، ابدالِ شام اور اقطابِ ہند تمام اطراف سے جو مسلمان منتشر ہوں گے اور انتہائی کمزوری کی حالت میں ہوں گے، وہ سب سیاہ جھنڈوں کے نیچے خراسان کی طرف سے شام کی طرف بڑھیں گے تاکہ حضرت مہدیؓ کے لشکر میں داخل ہوں۔ اور حضرت مہدیؓ شام کو اپنا مرکز بنائیں گے اور شام ہی میں وہ ملحمۂ کبریٰ اور جنگ عظیم نمایاں ہوگی جس کے بارے میں احادیث میں فرمایا گیا کہ اتنا لمبا چوڑا محاذ ہوگا کہ کوا جو سب سے زیادہ اڑتا ہے یہ دن بھر اڑے گا اور لاشیں ہی لاشیں اس کے نیچے ہوں گی۔ یہ دیکھتا ہوا چلا جائے گا۔ اتنا لمبا محاذ ہوگا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جنگ محض تیر وتفنگ کی جنگ نہ ہوگی۔ ہزاروں میل کا لمبا محاذِ جنگ جبھی ہو سکتا ہے جب مشین ہو ورنہ اگر ایک میدان میں جنگ ہو جائے، چاہے دو لاکھ آدمیوں کی ہو۔ وہ میل دو میل یا دس

(1) الحديث اخرجه ابن ماجه ولفظه: فاذا رأيتموه فبايعوه ولوحبواً على الثلج فانه خليفة الله المهدى، ج: ۱۲ ص ۱۰۲.

میل میں ہوگی، لیکن ہزاروں میل مقتولین کی تعداد ہوجائے اور پھیلے ہوئے پڑے ہوں۔ظاہر ہے کہ یہ کوئی عظیم الشان اور لمبا چوڑا محاذ ہوگا۔

مغرب کی طاقتوں کی شکست......وہ ملحمۂ کبریٰ جس کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ مغرب کی طاقتیں ان کے ہاتھ پر ٹوٹیں گی۔اور پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہوگا اور دین واحد ہوجائے گا۔اس وقت سب سے زیادہ طاقت نصاریٰ کی ہوگی۔پورے عالم پر انہیں کا غلبہ ہوگا۔یہ طاقت حضرت مہدیؓ کے ہاتھ پر ٹوٹے گی۔اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دوامی مقابلہ اگر کسی قوم سے ہے تو وہ عیسائی قوم ہے

مشرکین سے اسلام کا مقابلہ......اس لئے کہ سب سے پہلے اسلام کو مشرکین عرب سے مقابلہ پڑا، لیکن وہ ختم ہوگیا اس واسطے کہ جب فتح مکہ ہوئی تو یا وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یا قتل یا ہوئے جلاوطن ہوگئے۔تو حدیث میں فرمایا گیا کہ آج شیطان مایوس ہوگیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں اب اس کی پوجا کی جائے۔یعنی اب دوسرا دین نہیں آئے، گا مگر مسلمانوں میں آپس میں تفریق اور گروہ بندیاں ہوگی۔مگر کوئی دوسرا دین اسلام کے مدمقابل آجائے یہ نہیں ہوگا۔گویا مشرکین سے حجاز میں دوامی طور مقابلہ ختم ہوگیا۔

مجوس سے اسلام کا مقابلہ......دوسرا مقابلہ مجوس سے پڑا، ان کی بڑی عظیم شوکت تھی، کسریٰ کی سلطنت تھی اور پورا ایران اور خراسان گویا ان کے ہاتھ میں تھا، تو حدیث میں ہے کہ آپؐ نے کسریٰ کے نام فرمان لکھ کر بھیجا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔اس نے آپؐ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے کرکے چاک کرکے پھینک دیا۔جب آپؐ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا ''جس طرح میرا فرمان ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔خدا اس کا ملک ٹکڑے ٹکڑے کرے''۔

یہ پیشن گوئی حضرت عمرؓ کے زمانے میں پوری ہوئی۔اور وہ یہ ہوا کہ کسریٰ پرویز جو ایران کا بادشاہ تھا، وہ اپنے دوائی خانے میں قوت باہ کی دوا کھانے لئے گھسا۔مگر غلطی سے وہ معجون کھا گیا جو سمی تھا اور وہ وہیں ختم ہوگیا۔اس کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے حکومت کا دعویٰ کیا، سرداروں نے الگ حکومت کا دعویٰ کیا' بھائی بھتیجوں نے الگ دعویٰ کیا۔پورے ملک میں طوائف الملو کی پھیل گئی اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔یہ پیشن گوئی فرمائی گئی تھی اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں پورا ایران اور خراسان فتح ہوگیا۔اس طرح مجوس سے مقابلہ دوامی نہ رہا اور ختم ہوگیا۔

یہود سے اسلام کا مقابلہ......تیسرا مقابلہ حجاز میں یہود سے مدینے اور خیبر وغیرہ میں ہوا۔یہاں یہ لوگ آباد تھے اور دو ان کے بڑے عظیم قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے۔جب انہوں نے پے در پے غدر کیا اور معاہدہ شکنی کی۔تو آخر میں یہ ہوا کہ بنو قریظہ قتل ہوگئے اور بنو نضیر جلاوطن کردیئے گئے جو مختلف بلاد میں جاکر آباد ہوئے۔تو حجاز میں یہود سے بھی مقابلہ ابدی طور پر ختم ہوگیا۔

عیسائیوں سے دوامی مقابلہ اور اس کا انجام......اب رہ گئے نصاریٰ۔ان کی روم وغیرہ کی طرف مستقل قوت تھی اور قیصر حکمران تھا۔ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا مقابلہ ان سے ختم ہو

جائے گا بلکہ یہ فرمایا۔ ''اَلرُّوْمُ ذَوَاتُ الْقُرُوْنِ اِذَا هَلَکَ قَرْنٌ خَلَفَهٗ قَرْنٌ اَلْحَرْبُ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمْ سِجَالٌ یَّنَالُوْنَ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُمْ'' روم جو ہیں ان کے درجات وقرون اور طبقات ہوں گے، ان کے اور ہمارے درمیان لڑائی ایسی رہے گی جیسے ڈول رسی کہ کبھی ڈول نیچے جائے گا۔ کبھی اوپر آئے گا کبھی ہم غالب، کبھی وہ غالب۔ کبھی وہ مغلوب کبھی ہم مغلوب۔

ہزار برس تک مسلمان غالب رہے، اس کے بعد ان کا غلبہ شروع ہوا۔ تین چار سو برس سے ان کا غلبہ ہے مسلمان مغلوب ہیں، ظہور مہدیؓ کی جو خبر دی گئی ہے اس وقت مسلمان پھر غالب ہوں گے اور یہ مغلوب ہوں گے۔ اور مغلوب بھی ایسے کہ مدغم ہو جائیں گے اور اس پر دور دنیا ختم ہے۔

غرض ان کے بارے میں دوامی مقابلہ فرمایا گیا۔ ورنہ اور کسی قوم سے دوامی مقابلہ نہیں۔ وقتی مقابلے ہوں گے لیکن یہ رہے گا کہ کبھی وہ غالب اور کبھی ہم غالب۔ ایک مجموعی طور پر اور ایک جزوی طور پر کہ کسی علاقے میں وہ غالب آ گئے۔ ہم مغلوب ہو گئے، کسی علاقے میں وہ مغلوب ہو گئے، ہم غالب آ گئے بلقان کی ریاست میں کبھی وہ مغلوب ہم غالب، کبھی ہم مغلوب وہ غالب۔ کاغان میں کبھی ہم مغلوب وہ غالب، کبھی وہ مغلوب کبھی ہم غالب۔ ترکی کے علاقوں میں یہی ہوتا رہا، ہندوستان میں یہی رہا، عراق میں یہی رہا، یہ غلبہ ومغلوبیت چلتی آ رہی ہے۔ آخری طور پر اس کے ختم کا نتیجہ ظہور مہدیؓ کے وقت نکلے گا، اس وقت اس قوم سے بھی مقابلہ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ اور اقوام سے ختم ہوا۔

مقامِ تجدید...... جو بھی مجدّد ہوتا ہے ضروری نہیں کہ اس کے علم میں ہو کہ میں مجدّد ہوں مگر جذبۂ تجدید تو اس میں ہوتا ہے اور عمل بھی وہ وہی کرتا ہے جو ایک مجدد کرتا ہے اور بعد میں اس کے اعمال سے کھل جاتا ہے، کہ یہ مجدّد تھا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مجدّد کو اپنے بارے میں معلوم ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مجدّد دعویٰ کرے کہ میں مجدد ہوں بلکہ اس کا عمل تجدید ہوتا ہے، خود بخود دل میں آ جاتا ہے کہ یہ دین کی تجدید کر رہا ہے، سوائے اس کے کہ جو لوگ مامور من اللہ ہوں اور ان کو اجازت دی جائے کہ تم دعویٰ بھی کرو، وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن نفس مقامِ تجدید کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مجدّد کو یہ معلوم ہو کہ میں مجدّد ہوں مگر کام اس سے وہی نمایاں ہوں گے جو ایک مجدّد کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمال عدل ..... حضرت مہدیؓ عظیم الشان جنگ کریں گے۔ اس جنگ کی تفصیل آتی ہے۔ تین جنگیں ہوں گی۔ عظیم ترین جنگ ''ملحمۂ کبریٰ'' اس میں اتنے مقتولین ہوں گے کہ مسلمان فاتح تو ہو جائیں گے مگر ان کے لئے کوئی خوشی اور مسرّت باقی نہیں رہے گی۔ اس کے بعد پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہوگا اور حدیث میں ہے کہ ساٹھ برس حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکمرانی کریں گے اور ان کے دور میں اس درجہ گویا امن و امان ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہوگا۔ جیسا کے روایت میں فرمایا گیا کہ سانپ اور انسانوں کے بچے ایک جگہ کھلیں گے، نہ سانپ کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ یہ مجھے مار دیں گے، نہ انسانوں کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ یہ

کاٹ لیں گے۔ نیز یہ کہ بھیڑ اور بھیڑیا ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔ اتنا امن ہوگا کہ بکری اپنے اندر امن کو محسوس کرے گی، عدل کی اتنی برکات ہوں گی کہ فرمایا گیا کہ انگور کا خوشہ اتنا پھیلے گا کہ پورا گھرانہ اور قبیلہ اس سے سیراب ہو جائے گا۔ ایک بکری اتنا دودھ دے گی کہ پورا قبیلہ اس کے دودھ سے سیراب ہو جائے گا۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک مالدار زکوٰۃ صدقات دینے کے لئے نکلے گا تو جس کو دے گا وہ کہے گا کہ میرے گھر میں ڈھیر لگے ہوئے ہیں، تو ہی آ کر لے لے۔ جسے دے گا کوئی قبول کرنے والا نہیں ہوگا کہ میرے گھر میں خود بہت موجود ہے، اس درجہ گویا فراوانی اور برکات ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہوں گی۔

اس لئے کہ عدل کا اثر اطمانیت ہے، اور جب قلوب میں اطمینان سا ہوتا ہے تو ہر چیز میں آدمی کو برکت محسوس ہوتی ہے۔ اسی واسطے جو بادشاہ اور حکومت عادل ہوتی ہے۔ اس کی علامت ہے کہ قلوب کے اندر اطمینان سا ہوتا ہے ورنہ بے چینی رہتی ہے، ظلم میں کبھی امن واطمینان نہیں ہوتا عدل میں اطمینان ہوتا ہے، تو جب کسی حکومت میں آدمی محسوس کرے کہ قلب میں تسلی کی کیفیات ہیں تو سمجھ لے کہ حکمران نیک نیت ہے اور عدل کر رہا ہے۔

عدل کی حسّی برکات...... اور حسّی طور پر بھی اس کی برکات ظاہر ہوتی ہیں، چناں چہ ہارون الرشیدؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ شکار کھیلتے ہوئے کسی جنگل میں دور تک چلے گئے اور فوج ولشکر سے بھی الگ ہو گئے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو ایک باغ نظر آیا۔ اس میں گھس گئے۔ باغ کا مالک بوڑھا تھا۔ اس سے انہوں نے جا کر کہا کہ بھئی! پانی ہو تو دو۔ وہ لباس سے اور چہرے مہرے سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتی ہے کوئی امیر ہے۔

اس نے بہت تہذیب سے بیٹھنے کو جگہ دی اور بٹھلایا۔ اور ایک انار توڑا اور اس کو دبایا تو اس کے عرق سے پورا گلاس بھر گیا۔ وہ ہارون الرشیدؒ کو پلایا وہ نہایت شیریں تھا۔ ہارون الرشیدؒ کے دل میں خیال یہ پیدا ہوا کہ اتنا عظیم باغ میرے پاس بھی نہیں۔ یہ کون امیر ہے جس کا یہ باغ ہے۔ اب جو میں جاؤں گا تو اس باغ پر قبضہ کروں گا۔ یہ باغ بادشاہ کے لئے مناسب ہے، غیر بادشاہ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ خواہ مجھے قیمت دینی پڑے یا دباؤ سے لینا پڑے مگر باغ میرے پاس آنا چاہئے۔

پھر کچھ ستائے اور آرام کیا۔ اس کے بعد جب اٹھنے لگے تو مالی سے کہا کہ بھئی! پانی اور پلاؤ۔ اس نے پھر ایک انار توڑا اب وہ اس کو خوب دباتا ہے مگر آدھے سے زیادہ گلاس بھرتا ہی نہیں۔ ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ درخت بھی وہی ہے۔ انار بھی وہی ہے۔ یہ کیا بات ہے گلاس بھرتا کیوں نہیں۔؟ اس بوڑھے مالی نے کہا کہ۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہِ وقت کی نیت میں فرق آیا ہے“۔

ہارون الرشیدؒ سمجھ گیا۔ بادشاہ تو وہ خود ہی تھا۔ فوراً اپنے دل میں توبہ کی اور استغفار کیا۔ اور کہا کہ اے اللہ! میں مجرم ہوں۔ میں ہرگز قبضہ نہیں کروں جس کا باغ ہے اسی کو مبارک رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جو بقیہ عرق تھا وہ بھی نکل آیا اور گلاس بھر گیا، تو بوڑھا کہتا ہے، معلوم ہوتا ہے بادشاہِ وقت کی نیت درست ہو گئی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے زمانے میں اس قدر بشاشت وطمانیت اور اس قدر برکات کا ظہور ہوگا کہ جو فطری طور پر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ان میں بھی دشمنی کا احساس باقی نہیں رہے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلفاءِ سبعہ...... یہ جو کلی خیر و برکت کا زمانہ ہے، یہ چالیس برس رہے گا۔اور اس چالیس برس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سات خلفاء حکمرانی کریں گے۔لیکن پھر رفتہ رفتہ فساد کی طرف زمانہ بڑھتا جائے گا۔ جب ساتویں خلیفہ نمایاں ہو کر ختم ہوں گے،اب گویا فساد کا غلبہ شروع ہوگا اور پھر اتنا غلبہ ہوگا کہ لوگ اس درجہ پر آ جائیں گے کہ''شرِ محض'' رہ جائیں گے اور ایمان والے گنے چنے ہوں گے جو اپنے ایمان کو بچانے کے لئے پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر پناہ لیں گے۔شہروں میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ گویا بالکل قربِ قیامت کا وقت ہوگا۔اور یہ علامت ہوگی کہ اب اس کائنات کے خیمہ کو ختم کرنا اور فنا کرنا ہوگا۔

دَآبَّةُ الْأَرْضِ...... اسی وقت دَآبَّةُ الْاَرْضِ ظاہر ہوگا یا''نارِ حجاز'' ظاہر ہوگی جو منتشر جگہ سے ہنکار کر مومنوں کو ایک سمت میں لے آئے گی،دابۃ الارض کا جو خروج ہوگا تو یہ عجیب شکل وشباہت کا جانور ہوگا کہ چہرہ انسانوں جیسا اور ہر جانوروں کی شباہت اس میں ہوگی۔ یہ نشان بناتا جائے گا۔مومن کے چہرے پر مومن کا اور کافر کے چہرے پر کافر کا۔پھر ایک وباء بھیجی جائے گی جس سے دو تین دن کے اندر اندر جتنے ایمان والے ہوں گے سب ختم ہو جائیں گے اور انتقال کر جائیں گے۔

جن پر قیامت قائم ہوگی...... اب شرار الخلق باقی رہ جائیں گے۔ جو شرِ محض ہوں گے،ان کی شان فرمائی گئی کہ نہ ان کا کوئی دین و مذہب ہوگا۔''لَایَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَّلَا یُنْکِرُوْنَ مُنْکَرًا''...... نہ اچھے برے کی تمیز باقی رہے گی۔ گدھے، کتے کی طرح سے سڑکوں پر بدکاریاں کرتے پھریں گے۔کوئی انسانیت کی حس نہیں ہوگی،محض شہوانی جذبات ہوں گے،ان پر قیامت قائم ہوگی،یوں عالم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

عالم کی بنیاد...... اس سے علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ عالم ذکر اللہ سے تھما ہوا ہے۔ایک بھی جب تک اللہ اللہ کہنے والا رہے گا، عالم مٹنے والا نہیں ہے۔غرض عالم کی روح ذکر اللہ ہے۔ جب روح نکل جائے گی تب لاش بن کے پھولے گا، پھٹے گا اور سڑے گا۔اس سے پہلے نہیں حدیث میں ہے''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ'' ① قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا عالم میں موجود ہے۔جب ایک بھی نہیں رہے گا،اب شرِ محض رہ جائے گا۔اس وقت قیامت قائم کر دی جائے گی۔

قبولیتِ بعدد...... بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جہاں چالیس آدمی جمع ہوں وہاں ایک نہ ایک ان میں مقبول ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجے کی بھی قبولیت ہو۔تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں کوئی بھی مقبول نہ ہو۔ ہزاروں کی تعداد میں مقبولین ہوں گے۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان،باب ذهاب الایمان فی آخر الزمان، ص: ۷۰۲. رقم:۳۷۵.

کیا اہلِ دنیا آسمان سے آگے جاسکتے ہیں؟...... دیکھئے آسمان میں جانے کی تو کوئی صورت ہے نہیں۔ نہ شرعی اصول اس کی اجازت دیتے ہیں نہ یہ واقعہ ہوگا۔ آسمان سے نیچے فضا ہے۔ یہ اس دنیا کا دائرہ ہے۔ تو دنیا والے اپنے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔ اپنے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ آسمان کا دائرہ وہ انسانوں کا دائرہ نہیں ہے۔ وہ ملائکہ کا دائرہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبادت نہ ہو۔ پھر شریعت نے آسمانوں کے دروازے بتلائے ہیں ان پر بڑے مستعد دربان ہیں۔ جن میں مقبولین کو بھی بغیر اجازت کے جانے کی صورت نہیں بنتی۔

جنابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے تو دروازے بند تھے، حضرت جبریل علیہ السلام نے گویا دروازہ کھٹکھٹایا تو بواب کی طرف سے اندر سے یہ جواب آیا۔ مَــنْ اَنْــتَ...... "تم کون ہو؟"۔ حالاں کہ حضرت جبریل علیہ السلام سَیِّدُ الْمَلٰٓئِکَۃِ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ملائکہ ان کی آواز بھی بھول گئے۔ ان کا تو ہر وقت کا آنا جانا ہے۔ پوچھنا اس کی دلیل ہے کہ ڈیوٹی پر اتنے مستعد ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا بھی آئے گا تو وہ قانون کے مطابق ڈیوٹی ادا کریں گے۔ اس لئے پوچھا گیا۔ مَنْ اَنْتَ...... "تم کون ہو؟"۔ فرمایا حضرت جبریلؑ۔ پھر پوچھتے ہیں وَمَنْ مَّعَکَ؟...... اور ساتھ کون ہیں؟"۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے علم میں ہے کہ کوئی ساتھ آرہا ہے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن ادائے فرض میں اتنی مستعدی کہ یہ پوچھا کہ ساتھ کون ہیں؟۔ جبریل علیہ السلام نے کہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

پھر بھی نہیں کہ دروازہ کھول دیں۔ تیسرا سوال اور کیا گیا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں یا ویسے ہی خود بخود آگئے ہیں؟ تو حضرت جبریل نے جواب دیا۔ وَقَـدْ اُرْسِلَ اِلَیْـهِ...... ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں۔ تب دروازے کھولے گئے اور کہا گیا مَرْحَبًا بِکُمْ نِعْمَ الْمَجِیْئُ جَآءَ. ① "بہترین آنا ہے جو آپ آئے۔ خوش آمدید"۔ جب مقبولین کے لئے آسمان میں جانے میں اتنی پابندیاں ہیں تو مردودین وہاں کیسے جائیں گے؟ وہ خود بخود ہی پہنچ جائیں گے؟

سیارات کا تعلق اہلِ دنیا سے ہے...... اس کی بنا یہ ہے کہ جو اس دنیا میں بسنے والے انسان ہیں وہ اپنی دنیا کے دائرے میں رہتے ہیں لیکن دنیا کے دائرے سے نکل کر ایک دوسرا عالم شروع ہوجاتا ہے، اس عالم میں یہ دخل نہیں دے سکتے۔ رہے ستارے تو وہ اس دنیا ہی کے عالم میں ہیں اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اِنَّـا زَیَّنَّـا السَّـمَـآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْکَوَاکِبِ﴾ ② آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں سے آراستہ کر رکھا ہے۔ یہ ستارے اس آسمان کی زینت ہیں۔ اور زینت ہمارے لئے بنائی گئی۔ یہ زینت جبھی ہوسکتی ہے جب یہ ستارے آسمان کی نچلی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب المعراج، ص: ۳۱۵، رقم: ۳۸۸۷.

② پارہ: ۲۳، سورۃ الصافات، الآیۃ: ۶.

سطح سے نیچے ہوں۔ اگر اوپر کی سطح پر ہوتے تو ہمارے لئے زینت نہ بنتے۔

معلوم ہوا یہ ستارے زمین ہی سے متعلق ہیں۔ سورج اور چاند جو گردش کرتے ہیں یا یہ رات اور دن، یہ دنیا ہی کے لئے ہیں۔ آسمانوں اور جنتوں کے لئے تو رات اور دن نہیں ہیں۔ یہ رات دن کی گردش اس دائرہ دنیا کے اندر ہے اور اس کا تعلق ان سیارات سے ہے۔ یا مثلاً جڑی بوٹیاں ہیں۔ تو ہر جڑی بوٹی میں کسی نہ کسی ستارے کی تاثیر ہے جس سے وہ دفعیہ امراض میں موثر ہوتے ہیں، گل بنفشہ میں فلاں خاصیتیں ہیں۔ وہ جب جڑی بوٹیوں پر روشنی ڈالتے ہیں تو ویسی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور ویسے ہی امراض کا دفعیہ ہوتا ہے۔ تو یہ سارے ستارے گویا ہمارے لئے بنائے گئے ہیں۔ دنیا سے ان کا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ① ''ستاروں سے ہی لوگ راستہ پاتے ہیں''۔ یہ جہاز رانی کا فن ستاروں ہی کے ذریعے سے ہے۔ سمندروں میں سڑکیں تو نہیں ہوتیں۔ ستاروں سے سمتیں متعین کر کے جہازوں کو چلاتے ہیں۔ معلوم ہوا ستارے ہمارے لئے بنائے گئے ہیں، دائرہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسمان سے تعلق نہیں ہے۔ آسمان کی چھت میں جس طرح سے بھی لٹکا دیئے گئے ہیں۔ غرض جب یہ دنیا سے متعلق ہیں تو دنیا والوں کا ان تک پہنچنا ممکن ہے لیکن اپنی دنیا کے دائرے سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ جائیں۔ انسان میں یہ طاقت نہیں ہے۔ دعوے کوئی کتنے ہی کرے، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے چاند، سورج اور مشتری میں چلے جائیں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کرے جلدی چلے جائیں تاکہ زمین میں کچھ فساد کم ہو۔ ہمارا اس میں کیا نقصان ہے؟

توبہ کا دروازہ بند ہونے کا وقت...... حدیث میں آتا ہے کہ آفتاب جب مغرب سے طلوع کرے گا اور نصف النہار تک آئے گا اور پھر لوٹ جائے گا اور معمول کے مطابق طلوع کرے گا، جب یہ آیتِ کبریٰ ظاہر ہو جائے گی تب توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس واسطے کہ ایمان لانے سے مقصود قلوب کی آزمائش ہے۔ اور جب اتنی نمایاں خرق عادت ظاہر ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد آزمائش کا موقع نہیں رہے گا، اب تو وہ چیزیں سامنے آگئیں جن کی خبریں دی جا رہی تھیں، جن کو محض پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار پر ماننا چاہئے تھا۔ مشاہدے سے مانا تو اس کا نام ایمان نہیں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد پر ماننا چاہئے۔ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ آنکھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہ ماننا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم غلط نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایمان ہے۔ تو اپنی عقل سے کسی چیز کو سمجھ لینا یہ ایمان نہیں۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ میں ایمان لے آیا کہ دو کا دُگنا چار ہوتا ہے۔ اسے ایمان نہیں کہتے۔ یہ تو قضیہ عقلیہ ہے۔

التفاتِ حقائق اسلام کا موضوع ہے...... اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو، حقائق کی طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔ اسی واسطے تصویر کی ممانعت فرمائی گئی، ہوسکتا تھا کہ اس زمانے میں بھی مصوّر رہوں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک رکھتے ہوں۔ مگر ممانعت فرما دی گئی کہ صورتوں میں الجھ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۶۔

جائیں گے اور حقیقت رہ جائے گی، اس لئے مسلمانوں کو صورتوں سے ہی الگ رکھا ہے۔ آج کل سب کچھ مظاہروں اور نعروں میں آ گیا ہے، حقیقت گم ہو گئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کا مذہبی فائدہ...... (ہندوستان میں) سارے مسلمان اکٹھے ہو گئے اور یہ طے پایا کہ مشترک معاملات میں مل کر متفقہ طور پر گورنمنٹ سے مطالبہ کیا جائے۔ جو اپنی خصوصیات ہیں وہ آپ اپنے گھروں میں انجام دیں۔ اس میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے گا۔ لیکن جب گورنمنٹ کے سامنے آئیں تو مل کر آئیں اور وہ یہ نعرہ ہو کہ پرسنل لاء اور عائلی قوانین میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ نہ گورنمنٹ کو نہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کو۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرا گاندھی کو اعلان کرنا پڑا کہ "ہم کوئی دخل دینا نہیں چاہتے۔ مسلمان چاہیں کہ دخل دو، تب ہم دخل دیں گے"۔

ہم نے کہا وہ مسلمان کون ہے جو چاہے گا۔ سب تو یہاں آ گئے، سب کے نمائندے یہاں جمع ہیں۔ شیعہ و سنی بھی، اہلحدیث بھی۔ اب وہ کون سے مسلمان ہیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب دب دبا گئے اور وہ جو نعرے لگا رہے تھے کہ ترمیمات ہوں گی سب چپکے ہو کے بیٹھ گئے۔

دیوبندی و بریلوی حضرات کے باہمی قرب کا فائدہ...... اس موقع پر ہم نے بریلوی حضرات سے بھی خواہش کا اظہار کیا کہ آپ بھی آئیں عام طور پر وہ مذہبی معاملات میں ہمارے ساتھ شریک ہوتے نہیں۔ مگر اس موقع پر شریک ہوئے۔ اس لئے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ انہیں خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم نہ گئے تو سب نکھٹو کہیں گے اور ہماری بات گر جائے گی تو اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ سب سے بڑے مفتی، مفتی برہان الدین صاحب جو جبل پور کے رہنے والے ہیں، وہ آئے۔ مجھے اس موقع پر صدر بنا دیا تھا۔ میں نے انتہائی ان کی آؤ بھگت کی، جب وہ تشریف لائیں تو بیس قدم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنا، ہر پانچ منٹ کے بعد پان پیش کرنا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد چائے پیش کرنا۔ اور ان کی باتیں بھی بڑی عقیدت کی نگاہ سے سنیں کہ جو تچی بات کہے، اسے ماننا چاہئے۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو انہوں نے کہا۔ میں نے سنا ہے آپ حج کے لئے جانے والے ہیں؟ میں نے کہا ارادہ تو ہے۔ انہوں نے کہا "روضۂ اقدس پر میرا اسلام عرض کر دینا"۔ میں نے کہا انشاء اللہ ضرور عرض کروں گا۔ خیر میں نے کہا تکفیر تو ختم ہوئی۔ کسی کافر کے ذریعے روضۂ اقدس پر کوئی تھوڑا ہی سلام پہنچاتا ہے، غرض ملنے سے بھی سینکڑوں شبہات رفع ہوتے ہیں۔ بہت سے منافع ان کے ہاں ہیں جن سے ہم محروم ہیں۔ اور بہت سے منافع ہمارے ہاں ہیں جن سے وہ محروم ہیں، رلے ملیں گے تو ایک دوسرے سے فائدہ تو اٹھائے گا۔

باہمی نفرت اسلام کا ذوق نہیں...... یہ باہمی نفرتیں پیدا کرنا یہ اسلام کا ذوق نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ﴾ ① "یہ کفار جن چیزوں کی

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۸۔

پرستش کرتے ہیں ان کو بھی برا مت کہو کہ وہ چڑ میں آ کر تمہارے بڑوں کو برا کہیں۔ اس لئے انہیں بھی گالی مت دو''۔ اب یہاں گالم گلوچ بھی ہے اور یہ کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ وہ ایسا وہ ویسا۔ تو اسلام کا یہ ذوق ہی نہیں۔ یہ ایک مصیبت ہے۔ بس جہل عام ہے۔ آدمی دین کچھ پڑھے لکھے تو ذوق پیدا ہو اور پتہ چلے، بس بھیڑ چال ہے، جس نے جو رسم ڈال دی اور دو تین برس کی بعد وہی دین کا جز بن گیا۔

رسوم کا غلبہ...... چناں چہ میرا امریکہ جانا ہوا تو قوم کے کچھ لیڈر ملنے کے لئے بیچارے نیک طینت اور نومسلم آئے۔ میں نے حسب معمول پان کھایا۔ وہ یوں سمجھے کہ کوئی دینی چیز ہے۔ کہنے لگے اب ہم سب پان کھایا کریں گے اور ڈبہ بٹوہ رکھیں گے۔ میں نے کہا! یہ کوئی دینی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک عادت کی بات ہے۔ ایسا مت کرنا۔ اتنے سیدھے سادھے لوگ ہیں، اب اگر وہ پان کا ڈبہ رکھتے اور اسے دین سمجھ کر رائج کرتے تو ان میں یہ رائج ہوتا کہ پان کھانا دین اسلام کا رکن ہے اور جو نہیں رکھے گا وہ کافر ہو جائے گا، اس لئے وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ یہ ہے سارا قصہ۔

اختلافی مسائل کا آسان حل...... ورنہ اگر مسائل میں نگاہ ہو تو قرآنِ کریم کا صاف حکم ہے: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ① اگر تم میں تنازع ہو تو اللہ و رسول کو حکم بنا کے رجوع کرو، صحابہؓ کا عمل موجود ہے، رجوع کرو۔ جب وہ عمل پیش کیا جائے تو کہتے ہیں، صاحب! یہ تو سر آنکھوں پر ہے۔ مگر رواج یہی ہے۔ تو رواج پر چلیں گے۔ نہ صحابہؓ کے تعامل پر، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل پر، اس کا کوئی علاج نہیں۔ بس جہالت ہے اور اسلامی ذوق نہیں ہے۔

بریلوی عالم کی توہین بھی درست نہیں...... اب مولانا احمد رضا خان صاحب ہیں۔ ایک دن حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی مجلس میں۔ غالبًا خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ نے یا کسی اور نے یہ لفظ کہا کہ ''احمد رضا یوں کہتا ہے''۔ بس حضرت بگڑ گئے۔ فرمایا عالم تو ہیں۔ ہمیں توہین کرنے کیا حق ہے؟ کیوں نہیں تم نے مولانا کا لفظ کہا؟

غرض بہت ڈانٹا ڈپٹا۔ بہر حال ہم تو اس طریق پر ہیں کہ قطعاً ان کی بے حرمتی جائز نہیں سمجھتے، کافر، فاسق کہنا تو بڑی چیز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو خلافِ سنت امور ہیں۔ انہیں ظاہر کرتے ہیں کہ بدعات ہیں۔ خلافِ سنت ہیں، انہیں ترک کرو، لیکن کرنے والے کی توہین کریں، یہ نہیں ہے۔

مولانا احمد رضا خان صاحبؒ دیوبند کے فیض یافتہ ہیں...... مولانا احمد رضا خان دیوبند کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔ وہ اس طرح کہ مولانا محمد یٰسین صاحب رحمہ اللہ علیہ جنھوں نے بریلی میں مدرسہ اشاعتِ العلوم قائم کیا، یہ ان کے شاگرد ہیں۔ اور وہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں مگر اسے ظاہر نہیں کرتے۔ اور ابتداء ابتداء میں مولانا محمد یٰسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو مولانا احمد رضا خانؒ جو خط لکھتے تو نہایت تعظیم سے لکھتے، ایسے جیسے کوئی اپنے شیخ کو لکھ رہا ہے۔ بعد میں ان کے خیالات بدلے۔ کیا بات پیش آئی، وہ اللہ ہی جانے۔ پھر تو کافر سے

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

ورے کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

اپنے کام سے کام...... ہم تو یہ کہتے ہیں کہ نہ ہم مولانا احمد رضا خان صاحب کو برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں نہ کبھی کہا۔ دار العلوم میں آپ آ کے دیکھیں، کوئی ذکر یا چرچا ہے ہی نہیں۔ کون بریلوی اور کون وہ۔ سب اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ادھر دیکھو تو ابجد کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ وہ کافر، دہ کافر، وہ فاسق۔ وہاں کفر و اسلام کا یہ قصہ نہیں۔ سب تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ برسہا برس نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ اپنا مشغلہ ہی بہت ہے، کہاں اس جھگڑے میں پڑیں کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ ہوگا وہ، ہمیں اس سے کیا؟ وہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

لَعَمْرِیْ اِنَّ فِیْ ذَنْبِیْ لَشُغْلًا بِنَفْسِیْ عَنْ ذُنُوْبِ بَنِیْ اُمَیَّۃ

میرے اتنے گناہ ہیں کہ مجھے شمار کرنے کی فرصت نہیں۔ بنی امیہ کے گناہوں کو کہاں شمار کروں۔؟ برسوں نام بھی نہیں سنیں گے۔ کون ہے بریلوی اور کون ہے رافضی؟

مسجد دھلوانے کا قصہ...... بمبئی میں یہ کیفیت تھی کہ کوئی دیوبند والا مسجد میں چلا جائے تو مسجد دھلوائی جاتی تھی، حالاں کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کفار آتے تھے لیکن دھلوائی کبھی نہیں گئی، جب کہ وہ صحیح کافر تھے۔ اس لئے کہ نجاست اعتقادی ہے، بدن کی نجاست نہیں ہے جو مسجد آلودہ ہو۔ پھر بمبئی میں جانا آنا ہوا۔ اب قصہ برعکس ہو گیا، ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی جو معتدل ہے اور ان خرافات کو سمجھ گئی۔

حضراتِ دیوبند اور پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم...... پیر مہر علی شاہ صاحب نے دیوبند سے کوئی استفادہ نہیں کیا، مگر دیوبند کے لوگ ان کے معتقد تھے۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ ان سے بڑی عقیدت سے اور بڑی نیازمندی سے ملتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ ایک تو کچھ رسوم ہیں۔ ان بزرگوں میں اگر کوئی رسم بھی ہے تو وہ صرف اس لئے کہ ہمارے بزرگوں نے کیا ہم بھی کریں گے۔ لیکن دوسروں کی تکفیر نہیں کرتے اور برا بھلا نہیں کہتے۔ چوں کہ ان میں اخلاص تھا اس لئے دیوبند کے حضرات بھی ان سے عقیدت سے ملتے تھے۔

ایک بریلوی بزرگ سے ملاقات کے اثرات...... ملتان میں انقلاب سے پہلے ایک دفعہ میرا جانا ہوا۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے خیر المدارس کا جلسہ کیا تھا۔ میں نے جا کے پوچھا، یہاں کوئی بزرگ، کوئی عالم اور بھی ہے جس سے ملیں۔ انہوں نے کہا۔ مولانا محمد بخش صاحب ہیں اور بریلوی فرقے کے ہیں۔ میں نے کہا ہم انہیں فرقہ نہیں سمجھتے۔ نہ ہم فرقہ، نہ وہ فرقہ۔ مولانا عبد الخالق صاحبؒ نے بہت روکا کہ ان کے خلاف تو جلسہ کر رہے ہیں اور تم جا کے ملو گے۔ میں نے کہا خلاف کا وقت آئے گا، خلاف بھی کریں گے۔ اور وہ مسئلہ کی بات ہو گی لیکن ملنے میں کیا حرج ہے۔

ان سے چھپ چھپا کر، میرے ساتھ حافظ شریف احمد تھے، مغرب کے وقت ان کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہ مصلے

پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک لوٹے میں برف کا پانی بھی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے میرے آنے کی انہیں اطلاع کر دی۔ بڑی شفقت سے پیش آئے اور اس پانی کے لوٹے کو منہ سے لگا کر پہلے خود پیا اور مجھے کہا تم بھی پیو، میں نے پانی پیا۔

اس کے بعد کہنے لگے، دیوبند کے بزرگوں کے کچھ احوال تو سناؤ، میں نے وہاں کے بزرگوں کے حالات سنائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو دارالعلوم میں تعلیم کے لئے بھیجا، مگر ایک کو تو وہاں کی آب وہوا موافق نہیں آئی۔ واپس چلا آیا اور ایک البتہ سال رہا۔ مگر امتحان سے پہلے وہ بھی چلا آیا۔ خدا جانے کیا مجبوری پیش آئی۔ بہر حال ان کے گھرانے سے تکفیر نکل گئی۔ اس لئے میں ہمیشہ اس کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ بھئی منافرت مت پیدا کرو، اپنی رائے ہے، اگر آپ دیانۃً صحیح سمجھتے ہیں تو اس پر عمل کریں، لیکن نفرتیں پیدا کرنا، یہ صحیح نہیں۔

سنت وبدعت کا تاثیری امتیاز......مگر مشکل یہ ہے کہ حدیث شریف میں بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ''مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ'' ① جس قوم میں بدعت آئے گی اس میں دنگا فساد اور جھگڑا ضرور آئے گا۔ یہ بدعت کا خاصہ ہے۔ سنت میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سنت تو ایک ہی ہے، جس کا جی چاہے عمل کرے اور بدعات ہر جگہ کی الگ الگ ہیں۔ تو بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اصل دین ختم ہو جائے گا۔ نزاع وجدال اور گروہ بندی و پارٹی بازی، یہ شروع ہو جائے گی۔

تقسیم ہند کے بارے میں علمائے دیوبند کا اختلاف.....حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو کانگریس کے حامی تھے، کانگریسی تھے اور کانگریس کے کٹر قسم کے حامی تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس میں خون خرابے مچیں گے۔ اور مسلمان اِدھر سے اُدھر ہو جائیں گے۔ تو جانیں تلف ہوں گی۔ اور اسی طرح کے دیگر مصالح ان کے پیش نظر تھے۔ لیکن یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ جب پاکستان بن گیا تو فرمایا اب اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں، اب ہماری آبرو اسی میں ہے کہ وہ قوی ہو اور مضبوط رہے یہ تو ان کا حال ہے، جو مخالف تھے۔

اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ دیوبندی نہیں تھے؟ حضرت تھانویؒ دیوبندی نہیں تھے؟ مولانا ظفر احمد صاحبؒ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی نہیں تھے؟ یہ سارے پاکستان کے حامی تھے۔ تو یہ کہہ دینا کہ دیوبند مخالف تھا۔ رائیں ہوتی ہیں، کسی کی کچھ کسی کی کچھ، مگر بن جانے کے بعد مخالفین کی رائیں بدل گئیں کہ اب ہم کسی قسم کا نزاع یا اختلاف نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو ہماری عزت اس میں ہے کہ پاکستان قوی اور مضبوط ہو۔ دیوبند کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اشخاص کے اندر اختلاف تھا، دیوبند تو ایک ادارہ ہے، وہ نہ لیگی، نہ کانگریسی، ہمیشہ غیر جانبدار رہا۔ تو دیوبند اور چیز ہے۔ افراد اور چیز ہیں۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حامی تھے اور حامی ہونے کی بناء یہ تھی کہ یہ نعرہ لگایا جا رہا تھا کہ ہمیں ایک اسٹیٹ چاہئے جس میں اسلامی قوانین جاری کر سکیں، سارے مسلمان

① جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الزخرف، ج: ۱۱ ص: ۵۱۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دشمن ہوں۔ میرا ان کا اختلاف مسئلہ کا اور حجت کا اختلاف ہے۔ ذاتی اختلاف نہیں ہے، اگر تو نے یہاں آ کے قدم رکھا تو میں حضرت علیؓ کا ادنیٰ سپاہی ہو کر تجھ سے جنگ کروں گا''۔ اور اس کی ساری امیدیں ختم کر دیں۔ اور اگر وہ معاذ اللہ دب جاتے، وہ قیصر ہی غالب آ تا۔ اسی کی حکومت ہو جاتی۔

غیر قوموں کا طریق واردات...... غرض ان قوموں کا خاصہ یہی ہے کہ پہلے ملک میں اور قوم میں تفریق ڈالوتی ہیں اور سینکڑوں معاملات میں اختلاف پیدا کرتی ہیں۔ اسلام نے اخوتِ اسلامی سکھلائی تھی کہ مشرق و مغرب کے مسلمان ایک ہوں۔

انہوں نے کیا کیا۔ وطنیت کا رشتہ الگ ڈالا۔ اب جغرافیائی خطوط پہ لڑائی کرائی، نسلیت کا رشتہ الگ ڈالا کہ گورے الگ اور کالے الگ، غرض اس قسم کے سینکڑوں اختلاف پیدا کر دیئے۔ اور لوگوں کو لڑا رہے ہیں، جغرافیائی خطوط پر کہیں لڑ رہے ہیں، کہیں رنگ و نسل کے مسئلہ پر لڑ رہے ہیں، کہیں زبان کے مسئلے پر لڑ رہے ہیں۔ لیکن وہ جو اصل وحدت کی بنیاد تھی، اس کو سب چھوڑے ہوئے ہیں جس میں سارے مسلمان ایک ہوتے ہیں۔

ایک تو اختلاف آرا ہوتا ہے اور حجت کا اختلاف ہوتا ہے، وہ علماء و عقلاء میں آ رہا ہے، وہ مضر نہیں ہے، اس اختلاف کو نزاع و جدال اور جھگڑے پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا، یہ مضر چیز ہے۔ یہ جذبات کا کام ہے۔ مسئلہ کا کام نہیں ہے، مسئلہ لڑائی نہیں سکھلاتا۔ ہم مسئلہ کو آڑ بناتے ہیں اور جذبات اپنے نکالتے ہیں، پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

اجلاس صد سالہ...... اجلاس صدِ سالہ کو ''جشن'' کہنے سے ہم ہر جگہ احتیاط کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے جشن کا نام نہ دیا جائے۔ یہ ایک دستار بندی کا اجلاس ہے جبکہ جشن ایک رسم ہے۔ دار العلوم کے اجلاس صدِ سالہ میں شرکت کے لئے یہاں کے لوگوں کا کام ہے کہ وہ صدرِ پاکستان سے ملیں اور اس کی اہمیت ان پر واضح کریں۔ پھر جو وہ فرمائیں اس کی تعمیل کی جائے، معلوم ہوا ہے کہ ایک وفد ان سے ملا ہے تو انہوں نے پانچ سو آدمی کی اجازت دے دی ہے۔ ان پانچ سو کا انتخاب کرنا بھی یہاں کے لوگوں کا کام ہے۔

گروہی خصوصیّت کی دعوت کا نقصان...... دعوتیں مختلف ہو گئیں۔ اپنی اپنی خصوصیات کی لوگ دعوتیں دیتے ہیں اور اسے اسلام پکارتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام سب سے زیادہ بلند چیز ہے، جماعتی خصوصیات کا نام اسلام تھوڑا ہی ہے۔ ہر شخص اپنی گروہی خصوصیات کو اسلام کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اسلام کو مسلمانوں سے خطرہ ہے اور کسی سے نہیں ہے۔

اسبابِ اتحاد...... دوسرے میں نے ہر جگہ کہا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے۔ سب مل کر باہم متحد ہو کر اپنے ملک کو مضبوط بنائیں۔ اور یاد رکھئے! اتحاد جو قائم ہوتا ہے کبھی تو وہ قوتِ عقیدت سے قائم ہوتا ہے، کوئی ایک بزرگ شخص ہے، لوگ اس پر جمع ہو گئے۔ ان میں باہمی اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ کوئی عالم ربانی یا شیخ طریقت ہے۔ اس کے متوسّل جمع ہو جاتے ہیں۔ مرکز ایک ہو گیا۔ مگر وہ اتحاد محدود ہوتا ہے۔

ایک قوت قہری یعنی حکومت کی قوّت ہے، وہ بھی ایک مرکز پر جمع کرتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ سب

اس کے حامی تھے کہ اس سے بہتر کیا بات ہے۔ تو جس نے رائے دی یہ سمجھ کر دی کہ وہاں اسلام رائج ہوگا۔

دوسرے حضرات کی رائے یہ تھی کہ یہ ہوگا، نہیں اس لئے کہ جو لوگ بناء رہے ہیں انہیں خود دین سے مناسبت نہیں ہے، وہ نیک نیتی سے بھی چاہیں کہ اسلام رائج ہو، تب بھی نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ ان کے اندر اسلامی ذوق ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ملک تقسیم ہوگا تو یہ بھی ہوگا کہ کچھ لوگ اِدھر آئیں کچھ لوگ اُدھر جائیں، اس میں خون خرابے بھی مچیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو خون کے دریا نظر آتے ہیں۔ اور یہ ہوا۔ لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ لاکھوں مسلمان عورتوں کی آبروئیں بھی گئیں اور مالی نقصان بھی ہوا۔ تو یہ چیزیں ان کے پیش نظر تھیں جس کی بناء پر ان حضرات کی رائے تھی کہ نہ بننا چاہیے۔

اور جن کی رائے تھی کہ بنے تو وہ اس پر تھے کہ جب ایک اسٹیٹ بنے گی، اس میں اسلامی قانون جاری ہو گا۔ تو زیادہ نہ سہی پورے ہندوستان میں ایک جگہ تو اسلامی اسٹیٹ ہو جائے۔ ان کی نگاہ اس پر تھی۔ اور ہم رات دن دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ ملک مضبوط ہو اور ہم وہاں بیٹھ کر دعاء ہی کر سکتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔؟ اور اس کے متمنّی ہیں کہ اس ملک کو سب متفق و متحد ہو کر سنبھالیں، اللہ نے جب ایک ملک دے دیا ہے، باہمی لڑائی سے اسے ختم نہ کریں اور ان لوگوں سے عبرت پکڑیں جن میں نزاع ہوا۔ اور تیسرا آ کر غالب ہوا۔ افغانستان میں یہی ہوا کہ بیس پارٹیاں خلاف میں کھڑی ہو گئیں، باہمی نزاع ہوا۔ تو روس نے آ کر غلبہ پایا، اسی طرح سے اور جگہوں پر بھی ہوا کہ جب باہمی نزاع ہوا تیسرا غالب۔

مسلمانوں کا باہمی اختلاف غیروں کو غلبہ دلاتا ہے...... ملک ابن سعود کا ایک مقولہ ہے، جب ان سے کہا گیا کہ یہود بڑی قوت پکڑتے جا رہے ہیں اور ممالک اسلامیہ کے لئے خطرہ بڑھ رہا ہے۔ ملک نے جواب دیا: ”ساری دنیا کے یہود ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، مجھے ذرّہ برابر فکر نہیں۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم ہی آپس میں لڑو گے اور غیروں کو موقع دو گے کہ وہ آ کر غالب ہوں اور دخل دیں“۔ غرض یہ واقعہ ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت تباہ ہوئی ہے باہمی نزاع اور باہمی رقابتوں سے تیسرے کو موقع ملا۔ اور دوسری قومیں ہمیشہ اس کی ساعی رہی ہیں کہ ایک کا ساتھ دے کر دوسرے کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب ہو جائے تو پھر غالب آ جاؤ۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کلبِ روم کو جواب...... حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جب جنگ ہوئی تو قیصر روم کا پیغام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچا کہ ”میں نے سنا ہے کہ علی تمہارے مقابلے پر ہیں اور میں ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ فوجی مدد، مالی مدد“۔

اس کا مقصد یہ کہ حضرت امیر معاویہؓ کا ساتھ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب ہو کر ختم ہو جائیں تو انہیں بھی مغلوب کر دینا آسان ہوگا۔ یہ گویا اس کی ذہنی کیفیت تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس کا جواب لکھا، اس میں لقب لکھا الی کلب الروم رومی کتے کی طرف یہ خط پہنچے اور لکھا کہ: ”تو یہ سمجھتا ہے کہ میں

لوگ جمع ہو جائیں اور اتفاق کریں اور حکومت کو مضبوط بنائیں۔ اور بیرونی خطرات پہ نگاہ رکھیں۔ اس لئے کہ آپ کے اختلاف سے غیروں کو دخل اندازی کا موقع ملے گا۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سارے مسلمان متحد ہو کر ملک کو اور حکومت کو مضبوط کریں۔

عشرۂ فنڈ...... میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ (زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً) میں حاضر ہوں۔ اور حضرت ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آدمی میرے پاس پہنچا، اور اس نے دس روپے دیئے کہ یہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ارسال فرمائے ہیں کہ یہ دارالعلوم میں داخل کر دیئے جائیں۔ میں نے اس آدمی سے عرض کیا کہ یہ زکوٰۃ ہے یا عطیہ؟ اس نے کہا یہ عطیہ ہے۔ خواب ہی میں یہ بات دل میں جم گئی کہ میں اس مبارک رقم کو اجلاس صد سالہ کے سلسلہ میں داخل کروں گا۔

چناں چہ صبح کو میں نے یہ مفصّل خواب لکھ کر اور دس روپے کا نوٹ نتھی کر کے دفتر اجلاس میں بھیجوا دیا۔ وہاں شہر کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو خواب سنا تو بہت سے لوگوں نے کسی نے ماں کی طرف سے، کسی نے بیوی کی طرف سے، کسی نے بہن کی طرف سے دس دس روپے دیئے، جس سے دو ڈیڑھ سو روپے جمع ہو گئے، اس کے بعد گھر میں تذکرہ ہوا تو میں نے بیان کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو میاں سالم، اسلم اور اعظم تینوں نے ایک ایک بچے اور ایک ایک عورت کی طرف سے دس دس روپے دے کر دو سو سے کچھ زائد انہوں نے جمع کر دیئے۔ پھر طلباء میں چرچا ہوا تو کچھ طلباء میرے پاس آئے کہ اس قسم کے خواب کا چرچا ہے۔ اس کی کیا اصلیت ہے؟ طلباء چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی بیان کر دیا جائے۔ چناں چہ طلباء کا اجتماع ہوا، ڈیڑھ دو ہزار طلباء جمع ہوئے۔ اور میں نے خواب بیان کیا۔ پھر جو پیسوں کی بارش ہونا شروع ہوئی حالاں کہ بے چارے غریب اور غریب الدیار طلباء مگر چودہ سو روپے انہوں نے اسی مجلس میں جمع کر دیئے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تھا تو ہاتھ کی گھڑی اتار کر مجھے دے دی۔ اب شہر میں یہ چیز پھیلی، جو آ رہا ہے دس روپے کا نوٹ لئے آ رہا ہے، صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام کی برکت ہے کہ نام آتا ہے تو لوگ اُمڈ پڑتے ہیں۔ اور عشرہ فنڈ میں خوب پیسہ جمع کراتے ہیں۔

اس پر میں نے دفتر اجلاس کو لکھا کہ جتنی بھی رقم آئے وہ حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف سے داخل کی جائے اور دینے والے کا نام معرفت میں لکھ دیا جائے کہ معرفت فلاں کی اور من جانب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اس طرح بہت سارو پیہ جمع ہو گیا۔ اس کے بعد میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں لوگوں نے کہا کہ یہاں بھی خواب کا چرچا ہے۔ وہاں بیان کیا تو کوئی چھ سات ہزار روپیہ لوگوں نے دس دس روپے دیکر جمع کر دیا۔ تو میں نے کہا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لاکھوں روپیہ دے سکتی تھیں مگر دس روپے اس لئے دیئے کہ ہر ایک کو دس دینے آسان ہیں۔ اور سو، ہزار دینے مشکل ہیں۔ اس لئے دس روپے عنایت فرمائے۔ تو اس کا نام ہم نے ''عشرہ فنڈ'' رکھ دیا اس کا یہاں پاکستان میں لاہور میں ذکر ہوا تو یہاں لوگوں نے دینا شروع کیا۔ اب تک ''عشرہ

فنڈ'' میں پندرہ، سولہ ہزار روپیہ جمع ہو چکا ہے، یہ اس خواب کی حقیقت ہے۔

عطیۂ رحمت ...... اسی طرح دو روپے کے بارے میں یہ ہے کہ الہ آباد کے ڈاکٹر صلاح الدین صاحب، انہوں نے خواب دیکھا اور مجھے خط لکھا۔ ''مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دو روپے عنایت فرمائے اور میرا نام لیا کہ اس کے پاس بھیج دو کہ ایک دارالعلوم میں داخل کرے، ایک صد سالہ اجلاس کے فنڈ میں داخل کرے چناں چہ وہ خود لے کر پہنچے''۔ میں نے اس پر کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، تو ایک دو روپیہ اس لئے رکھا کہ ہر شخص کو دینا آسان ہے۔

انفاقِ محبوب کا التزام ...... اگر خرچ کرو تو محبوب ترین چیز خرچ کرو، محبوب چیز ہو، یہ نہ ہو کہ جسے اپنے نزدیک ردّی سمجھ رکھا ہے اسے اللہ کے نام پر دے دی، اچھی چیزیں خود رکھو، غرض جو دو محبوب چیز ہو، یہ نہیں فرمایا جو محبوب چیز ہو وہی دو۔ اس سے لزوم ہے کہ جو دو وہ محبوب ہو۔ جو محبوب ہو وہ سب کچھ دے دو یہ نہیں ہے۔ کسی کے پاس اگر دس چیزیں ہیں اور وہ محبوب ہیں، ایک چیز دے دے، وہ بھی کافی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ دس کی دس دے دے ترغیب پر عمل کرے گا، درجات ملیں گے۔ امر نہیں ہے کہ اگر نہیں دے گا تو گنہگار ہوگا۔

نعمائے جنت ...... جنت میں جو نعمتیں ہیں وہ، وہ ہیں کہ لَا عَيْنٌ رَأَتْ ...... نہ کسی آنکھ نے دیکھی۔ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ ...... نہ کسی کان نے سنی۔ وَلَا عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ خَطَرَ. ① نہ کسی قلب پر ان کا خطرہ گزرا۔ اس لئے کہ آدمی نے دیکھا تو ہے نہیں جو کچھ سمجھے گا عقل سے سمجھے گا۔ تو یہ سمجھے گا کہ جیسی دنیا میں نعمتیں ہیں ایسی ہی جنت میں ہوں گی۔ حالاں کہ وہ اس سے بالاتر ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل محض سے سوچتے ہیں۔ لیکن جو ''وحیِ خداوندی'' سے سوچتے ہیں، وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا معائنہ کرایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری نعمتیں دیکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہے، جنت کی ساری نعمتیں دیکھیں، تو ایک ہیں انبیاء علیہم السلام اور مقرّبین، وہ محض عقل سے نہیں سوچتے وہ تو وحیِ خداوندی اور مشاہدے کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔ یہ حکم عوام کے لئے کہ عقل سے جتنا سوچو گے اس کی چیزیں عقل سے بالاتر ہیں، اس لئے انبیاء علیہم السلام اس میں داخل نہیں ہیں۔

انسان ہر طرف سے عدم میں گھرا ہوا ہے ...... انسانی صفات بہت محدود ہیں۔ ہر طرف سے انسان کو عدم نے گھیر رکھا ہے۔ چناں چہ صفتِ علم کی بات ہے۔ ایک انسان کو چار سو، پانچ سو مسائل کا علم ہوگا، ہزار کا ہوگا، اس کے بعد وہی عدم العلم ہے۔ تو جہل نے گھیر رکھا ہے، بیچ میں تھوڑا سا علم ہے۔

یا مثلاً ہماری قدرت ہے۔ ہم آپ سے کہیں گے کہ اگالدان اٹھالاؤ۔ آپ اٹھالائیں گے، قدرت ہے۔ یا آپ سے کہیں گے چارپائی اٹھالاؤ، مشقت سے سہی، آپ اٹھالائیں گے، ہم کہیں گے مکان اٹھالاؤ۔ آپ کہیں

① الصحيح للبخاري، كتاب بدء الخلق، باب صفة الجنة...... ص: ۲۶۳، رقم: ۳۲۴۴.

گے مجھ میں تو قدرت نہیں۔تو بیچ میں قدرت ہے چاروں طرف عدم القدرت ہے۔زیادہ تر چیزیں وہ ہیں جو قدرت سے خارج ہیں۔

اسی طرح سے دیگر صفات میں بھی۔مثلاً آپ محافظ ہیں،اپنی حفاظت کرسکتے ہیں۔ایک بچے کی کریں گے دو بچوں کی کریں گے۔گھر والوں کو ساتھ ملا کر دس کی حفاظت کریں گے۔ہم کہیں گے سارے شہر کی حفاظت کرو،آپ کہیں گے مجھ میں تو قدرت نہیں،امیر اور پریزیڈنٹ جو ہے،وہ کرسکتا ہے۔ہم اس سے کہیں گے ساری دنیا کی حفاظت کرو،سمندروں میں جو مچھلیاں ہیں ان کی بھی حفاظت کرو،وہ کہے گا میرے اندر تو قدرت نہیں،تو پھر عدم القدرت آ گئی۔تو بیچ میں تھوڑی سی حفاظت اور قدرت ہے۔غرض ہر انسان کی ہر صفت کمال کو عدم الصفات نے گھیر رکھا ہے،عدم چاروں طرف سے محیط ہے۔بیچ میں تھوڑا سا وجود دیا گیا ہے۔خود ہماری ذات جو ہے،پہلے نہیں تھے۔بعد میں نہیں ہوں گے۔بیچ میں تھوڑے سے ہیں۔تو دو طرف سے عدم میں گھرے ہوئے ہیں۔بیچ میں تھوڑا سا وجود ہے،جب وجود ہمارا تھوڑا سا ہے تو صفاتِ وجود بھی تھوڑی سی ہیں۔کمالات بھی تھوڑے سے ہیں۔لامحدود کمالات نہیں ہو سکتے۔

وجودِ حقیقی......لامحدود کمالات اسی کے ہو سکتے ہیں جس کا وجود لامحدود ہے۔جو ازل سے ابد تک رہے گا۔اور وہ اللہ کی ذاتِ برکات ہے۔یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ حق تعالیٰ کا علم محیط،اس کی قدرت محیط،اسی لئے فرمایا ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ ① ”ہر چیز اس کے علم کے احاطے میں ہے“۔اور قدرت کے بارے میں فرمایا گیا:﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ② ”وہ ہر چیز پر قادر ہے“۔کہیں فرمایا:﴿عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ ③ ”اس کا اقتدار ہے،کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے“۔کہیں فرمایا:﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ ④ ”مالک الملک وہی ہے،جسے چاہے ملک دے دے،جس سے چاہے چھین لے،جس کو چاہے بادشاہ بنا دے۔جسے چاہے گدی سے اتار دے“۔غرض سب کی بادشاہتیں تو حد رکھتی ہیں کہ ہوئیں اور ختم ہو گئیں لیکن جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اس کی بادشاہت بھی ازلی اور ابدی ہے۔تو وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

اسلام میں انتخابِ امیر کا ایک طریق......حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت کے وقت چھ نام منتخب کئے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی کو امیر بنالو،حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔فرمایا ان سے زیادہ کوئی مستحق خلافت نہیں ہے،ان میں سے کسی کو منتخب کر لیا جائے۔مگر انتخاب میں تین دن سے زیادہ دیر نہ کی جائے۔

① پارہ: ۲۸،سورۃ الطلاق،الآیۃ: ۱۲. ② پارہ:سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۲۰.
③ پارہ: ۲۷،سورۃ القمر،الآیۃ: ۵۵. ④ پارہ: ۳،سورۃ آل عمران،الآیۃ: ۲۶.

چناں چہ یہ حضرات جمع ہوئے تو حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ نے فرمایا۔ چھ میں سے تین کو سب اختیار دے دیئے جائیں، تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنا اختیار حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

پھر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وحضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سے جو خلافت نہ چاہتا ہو انتخاب کا اختیار اسی کو دے دیا جائے اس پر دونوں حضرات خاموش رہے۔ تو حضرت عبدالرحمنؓ نے فرمایا۔ میں اپنے لئے خلافت نہیں چاہتا لہٰذا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے۔ چناں چہ انہیں یہ اختیار ان دونوں حضرات کی طرف سے سونپ دیا گیا۔ اور انہیں تین دن مہلت دی گئی۔ پھر آراء کی کثرت حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہوئی تو ان کو امیر منتخب کیا گیا۔ اور اہلِ حل وعقد نے تسلیم کر لیا۔ گویا اسلام میں دونوں طریقے ہیں۔ نامزدگی بھی ہے اور انتخاب بھی ہے۔

انتخاب کا مغربی طریقہ...... مگر انتخاب کا ایک تو موجودہ طریقہ ہے کہ جتنے بالغ ہوں سب سے رائے لی جائے، وہ امیر کے بارے میں کیا رائے دیں گے اس میں غیر عالم بھی ہیں، جہلاء بھی ہیں، جنہیں یہ ہی پتہ نہیں کہ امارت کے معنی کیا ہیں۔ یہ مسئلہ اہل حل وعقد کے اوپر رکھا گیا کہ جو قوم کے اندر علم اور دیانت کے لحاظ سے نمایاں طریق پر بڑے ہیں اور ان کی تقویٰ وطہارت پر لوگوں کو اعتماد ہے، وہ مل کر جسے منتخب کر لیں، قوم اس کو مان لیتی ہے۔ اس لئے طریقہ تو سہل ہے اور ایک معقول طریقہ ہے۔ لیکن اس میں نقصان اس سے ہوتا ہے کہ ہر لیڈر اس فکر میں رہتا ہے کہ میں بنوں اور وہ اپنے مناقب وفضائل خود بیان کرتا ہے کہ میرے یہ کارنامے ہیں۔ لہٰذا مجھے منتخب کرو، ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں تو ووٹ حاصل کرنے والا ہی تو اپنے مناقب بیان کرتا ہے کہ میری کارگزاریاں یہ ہیں اور فلاں نے مجھے یوں کہا۔ اس کے بارے میں صراحۃً اسلام نے فرمایا: **انا لا نولی هذا من سأله ولا من حرص عليه** ① جو خود کسی عہدے کا متلاشی اور خواہاں ہو، ہم اس کو عہدے دار نہیں بنائیں گے اس کی بھی جڑ کٹ گئی، یہیں سے نزاع شروع ہوتا ہے، اب اہل حل وعقد جو سیاسی امور سے بھی واقف ہوں اور ان میں دیانت بھی ہو۔ ایک تو ہے کوری سیاست یعنی جوڑ توڑ۔ اور ایک یہ کہ ضمیر کی سچائی اور دیانت وتقویٰ اور قلب کی طہارت اور ضمیر کی صداقت۔ اس سے جو وہ رائے دیں گے وہ خیر وبرکت کی ہوگی، قوم بھی قبول کرے گی۔

امیر تغلّب...... بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی تغلب کے ساتھ امیر بن گیا، زور اور قوّت کے ساتھ اس نے قبضہ کر لیا۔ پھر اس میں لکھتے ہیں کہ وہ بھی امیر بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس کے ہٹانے میں فتنہ ہے اور فتنے سے بچانا ضروری ہے، اس لئے کہ ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ ② اگر خود بھی بن گیا ہو اور اس میں صلاحیت بھی موجود

① الصحيح للبخاری، کتاب الاحکام، باب مایکره من الحرص علی الامارة، ص: ۵۹۵، رقم: ۷۱۴۹.

② پاره: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۹۱.

ہو۔قوم کا فرض ہے کہ اسے مان لے، جھگڑے نہ ڈالے۔

اقتدار میں رسہ کشی کا سبب......جھگڑے جو پڑتے ہیں وہ اس لئے نہیں پڑتے کہ اس میں خرابی ہے۔خرابی سے تو کوئی بھی شخص خالی نہیں۔ ہرایک میں کمزوری ہوتی ہے بلکہ اس لئے پڑتے ہیں کہ ہرایک خواہاں ہوتا ہے کہ میں اس عہدے پر آ جاؤں۔ یہ اقتدار پسندی جھگڑے کی بنیاد ہے۔تو اس کے لئے پہلے ہی فرمادیا کہ جو طالب ہوگا ہم اسے عہدہ نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ وہ خودغرض ہے، اس کے اندر اغراض پوشیدہ ہیں۔اب اہلِ حل وعقد جو ہوں، جن کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ہو، یا قوم کو ان کی دیانت وتقویٰ پر اعتماد ہو۔ اور یہ کہ وہ خودغرض نہیں ہیں۔ ان کو جمع کر کے کسی کا انتخاب کردیا جائے۔اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ساری قوم سے کہا جائے۔ جو اوپر کے لوگ ہیں ساری قوم کا وہی تو خلاصہ ہیں۔وہ حقیقت میں قوم ہی کی نمائندگی ہوتی ہے۔

رائے عامّہ کی ہمواری......اس میں البتہ یہ ہوتا ہے کہ جن کے دلوں میں خلاف ہو، اسے رفع کیا جاتا ہے کہ میاں، یہ واقعہ یوں نہیں، یوں ہے۔قوم سنبھل جاتی ہے۔اب جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا گیا تو اسی چھ آدمیوں کی مجلس میں طے تو ہو گیا تھا، لیکن حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گھر گھر جا کر پوچھا کہ کس کو چاہتے ہو۔؟ چوں کہ بنی امیہ کی تعداد زیادہ تھی اور ان میں اقتدار بھی بڑھا ہوا تھا، اس لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند کیا اور اکثریت کی رائے ادھر ہی آئی اور ان کو امیر بنادیا گیا۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے رائے لی۔حتیٰ کہ لوگوں کے گھر جا کر رائے لی۔اس کا حاصل یہ ہے کہ رائے عامّہ کو ایک حد تک ہموار کرنا ضروری ہے اور وہ یہی ہے کہ جو امیر ہے اس کے واقعی فضائل بیان کئے جائیں کہ اس میں اہلیت ہے۔اس کے خلاف کوئی جذبہ ہو اس کو دفع کیا جائے۔

امیر کی غلطی کا حکم......اب ایسا کوئی آدمی جو بالکل مزکّی اور مقدّس ہو، جس میں غلطی کا نشان نہ ہو، عالم بشریّت میں کوئی نہیں ملے گا۔ ہرایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی غلطی اور خطاء ہوتی ہے اور اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔اس کے بارے میں تو یہ فرمادیا گیا کہ اگر امیر کوئی غلطی بھی کر جائے تو حتیٰ الامکان نصیحت کرو، کچھ نہ ہو تو اس کا اتباع کرو، فتنہ نہ پیدا کرو، اگرچہ وہ رائے غلط بھی ہے۔بنیاد سب کی یہ نکلتی ہے کہ خودغرض نہ ہو۔دیانت اور تقویٰ قلب میں موجود ہو۔پھر سب آسان ہے ورنہ جھگڑے پیدا ہوتے رہیں گے۔

یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص میں ملک کے سنبھالنے اور چلانے کی اگر فی الجملہ صلاحیت ہے تو اس کے خلاف نہ کیا جائے اور اسے کام کرنے کا موقع دیا جائے اور اگر وہ غلطی بھی کرے تو اس غلطی کو اچھالا نہ جائے۔الا یہ کہ وہ اسلام کی تخریب کے لئے کام کرے، پھر بے شک اس کو بدل ڈالو۔

افراط وتفریط فرقہ واریّت کی بنیاد ہے......مولانا احمد رضا خانؒ اور بریلویت کے بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو آج تک کہیں ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ بہرحال وہ مسلمان ہیں۔ایک ہے کسی چیز میں غلو اور

مبالغہ کرنا اور تشدّد کرنا، اس کو دنیا میں بھی پسند نہیں کیا گیا، اور دین میں بھی پسند نہیں کیا گیا۔ دین کے بارے میں فرمادیا گیا لَاتَغْلُوْافِیْ دِیْنِکُمْ. ① دین کے اندر غلومت کرو۔ سادہ سادہ طریق پر چلتے رہو۔ جس قوم نے غلو کیا ہے، وہ افراط وتفریط سے ہوتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہود نے تو یہ افراط کی کہ انہیں ولدِ غیا کہا کہ معاذ اللہ ولد الزنا ہیں۔ انتہائی گستاخی کی۔ نصاریٰ نے کہا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ تفریط کی۔ تو ایک اِدھر بڑھ گیا اور ایک اُدھر بڑھ گیا۔ جو اصلیت تھی کہ اللہ کے پاک بندے ہیں اور اس کے پاک رسولؑ ہیں۔ اس کی طرف کوئی نہیں آیا۔ یا خدا بنایا یا معاذ اللہ ایک بدکار انسان ثابت کیا۔ یہ ہے وہ افراط وتفریط جس سے فرقے بنتے ہیں۔

یا جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّ فِیْکَ مَثَلُ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ. تم میں عیسیٰ ابن مریم کی مثال پائی جاتی ہے، بعض فرقے تمہاری محبت میں پڑ کر تباہ ہوں گے اور بعض تمہاری عداوت میں پڑ کر تباہ ہوں گے۔ تو خوارج نے تو عداوت کا راستہ اختیار کیا۔ اور یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کو قتل کر دیں اور روافض کے بعض فرقے ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ان میں خدا حلول کئے ہوئے ہے اور حضرت حضرت امام تسلیم کیا اور حضرت حضرت امام کے معنی معصوم کے لئے۔ اور کہا حضرت حضرت امام شریعت میں تصرّف کر سکتا ہے۔ اگر وہ یوں کہے کہ پانچ نمازوں کو تین کرو، تو اسے کر دینے کا حق ہے۔ حالاں کہ اس کا رسول کو بھی حق نہیں، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ﴾ ② ”مجھے اس کا حق نہیں ہے کہ میں قرآن کریم میں اپنے نفس کی رائے سے کچھ تبدیلی کر دوں۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور میں امین ہوں“۔

غرض نبی کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ شریعت میں تصرّف کرے اور وہاں حضرت حضرت امام کو حق دے دیا گیا۔ یہ اِدھر غلو ہے اور وہ اُدھر غلو ہے۔ یہیں سے فرقہ بندی شروع ہوگئی۔ یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے کہ بعض مسائل مختلف فیہ ہیں یعنی اختلافی مسائل میں اگر غلو نہ کیا جائے اور اعتدال سے چلا جائے تو میں سمجھتا ہوں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ اب اس اختلاف کو لڑنے جھگڑنے کا ذریعہ ہی بنایا جائے، یہ جذبات کی بات ہوئی مسائل کی بات تو نہ ہوئی۔

عرس کا مسئلہ...... اس میں دیوبند کے حضرات معتدل ہیں۔ مان لیجئے عرس کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرس اپنی ذات سے کوئی بری چیز نہیں۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ اہل اللہ میں سے کسی شیخ طریقت کا انتقال ہوتا تو جو متوسل ہوتے، وہ جمع ہو جاتے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ جو لوگ ضعیف النسبت ہوتے انہیں قوی النسبت لوگوں سے قوّت پہنچتی تھی اور تقویّت حاصل ہوتی تھی، ان کی نسبت مضبوط ہوتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ان کو مختلف ولایات میں بھیجا جاتا تھا کہ تم وہاں جا کے اصلاح کرو، تم وہاں جا کے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله تعالی یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم، ج:۳، ص:۲۹۶۱۔

② پارہ:۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ:۱۵۔

اصلاح کرو۔ اورتم وہاں جا کے اسلام پھیلاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضراتِ صوفیاء کی بدولت پھیلا ہے۔ ان کے ہاں عرس کا موضوع ہی یہ تھا کہ سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر ہدایت اور تبلیغ حق کے لئے وجود بھیجے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہر قصبے اور ہر ضلع میں تقریباً شاہِ ولایت کی قبر ہے، سہارن پور میں بھی شاہِ ولایت کی قبر۔ دیوبند میں بھی شاہِ ولایت کی قبر۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہوں میں سنا گیا۔ وہ اصل میں یہ تھا کہ جس وفد کو بھیجا جاتا اس کا ایک امیر بنا دیا جاتا۔ اس کا نام شاہِ ولایت ہوتا تھا۔ وہ جہاں انتقال کر گیا، وہاں دفن ہوا۔ تو شاہِ ولایت کے طور پر دفن ہو گیا۔ وہ شاہِ ولایت ہو گیا۔

غرض وہاں ولائتیں تقسیم ہوتی تھیں کہ تبلیغ دین کرو، مسلمانوں کی اصلاح کرو، حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، ان کے بارے میں عیسائیوں کی شہادت ہے۔ مسٹر آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یعنی اسلام کی دعوت کس طرح سے پھیلی۔ اس میں لکھا ہے کہ "ہندوستان میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنے اور ننانوے لاکھ آدمی بلاواسطہ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ اور جو ان کے خلفاء کے ہاتھ پر ہوئے ہیں، ان کی تعداد الگ ہے"۔

حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نو سو خلیفہ دکن میں پہنچے، وہاں جا کے اسلام پھیلایا، ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ وہاں جا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں ایسی تنگ جگہ کہ آدمی کا جانا مشکل، مگر کوئی نہ کوئی مسجد موجود ہے یا مزار موجود ہے۔ وہاں تک یہ حضرت پہنچے ہیں، نو سو خلفاء بھیجے جنہوں نے دین پھیلایا۔

تو اصل میں عرسوں کا یہ مقصد تھا لیکن وہ ہوتے ہوتے مثل مشہور ہے۔ الولایہ سردہ آمد رفتہ رفتہ کچرہ شد، آیا تھا سردہ بن کر، ہو گیا کچرہ، اب عرسوں کے معنی میلے کے ہو گئے، عورتیں اس میں، ناچ گانا اس میں، دکانیں اس میں، ہر طرح کی خرافات۔ اس کو کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں عرسوں کو روکتے ہیں۔ وہ عرسوں کا روکنا نہیں ہے۔ وہ خرافات کا روکنا ہے جو خلافِ سنت ہی نہیں بلکہ بدعات ہیں۔ جو رسمیں پڑی ہوئی ہیں اور جہلاء کی ایجاد کردہ ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر عرس ان چیزوں سے پاک ہو جائے، وہاں سے تبلیغ کے لئے وفد بھیجے جائیں۔ مواعظ ہوں، تقریریں ہوں اور تلاوت ہو، کوئی بھی نہیں روکتا۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے، ہر سال سرہند شریف عرس میں جاتے تھے اور دیوبند والا کوئی انہیں نہیں روکتا تھا، اس لئے کہ وہاں یہ خرافات ہی نہیں تھیں۔ یا تلاوت ہے یا تبلیغ ہے یا مواعظ ہیں۔ غرض اصل میں عرس کو نہیں روکا جاتا بلکہ ان خرافات کو روکا جاتا ہے۔ عوام ان خرافات کے خوگر ہیں، وہ اس پر عار دلاتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! عرس کو روک دیا۔ حالاں کہ بزرگوں نے یہ رسم ڈالی ہوئی ہے۔ کیا بزرگوں نے ناچ گانے کی رسم ڈالی تھی؟ اس کا

منشاءِ تبلیغ وموعظت اور دینِ حق پھیلانا تھا۔ وہ تو رہا نہیں، ناچ گانا رہ گیا۔ بہرحال بہت سی چیزیں جہالت سے پیدا ہوئی ہیں جب شریعت کا علم ہی نہ ہو تو خرافات ہی ہوں گی۔

اسلام کے نام پر رائج رسوم......اور اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ ان بزرگوں کی دیانت وتقویٰ اور پاکیزہ اعمال کو دیکھ کر قومیں متوجہ ہوئیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں لیکن تعلیم کا بندوبست نہیں ہوا۔ تو جن لوگوں کے گھروں میں ہندوانہ رسمیں تھیں۔ انہیں صورت بدل کر اسلامی رسوم قرار دے دیا۔ وہ گوگال کا جھنڈا نکالتے تھے۔ انہوں نے شیخ سدّو کا جھنڈا نکال دیا، وہ ستیوں پر پرشاد چڑھاتے تھے، انہوں نے قبروں پر چڑھانا شروع کر دیا۔ ساری ہی اس میں ہندوانہ رسمیں ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ اسلام کے نام سے رائج ہیں۔ یہ عرسوں پہ ہونے والی چیزیں درحقیقت کچھ ہنود سے آئی ہوئی چیزیں ہیں۔ کچھ اِدھر کی کچھ اُدھر کی۔ وہ پھیل گئیں۔ اب انہیں کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ بزرگوں کی تعظیم نہیں کرتے۔ بزرگوں نے یہ چیزیں تھوڑا ہی پھیلائی تھیں۔ وہ تو مقدّس لوگ تھے۔

ذکرِ میلاد یا جشنِ میلاد......اسی طرح مثلاً میلاد شریف ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ ولادت تو طاعت وعبادت ہے، اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ذکرِ میلاد کے معنی جشنِ میلاد کے ہو گئے ہیں۔ اب دیکھیں گے جگہ جگہ سبز مینار سے بنے ہوئے ہیں، روشنیاں پھیل رہی ہیں۔ یہ سیرت پھیل رہی ہے۔ سیرت تو ان تکلفات کو مٹانے کے لئے آئی تھی۔ نہ ان کو رواج دینے اور مظاہرے کرنے کے لئے آئی تھی، دل میں تو سیرت کا نشان نہیں، مگر بازاروں میں جھنڈوں کے اوپر، میناروں اور برجون کے اوپر گھوم رہی ہے، سیرت آدمیوں کے لئے آئی تھی، یا جھنڈوں اور قمقموں کے لئے آئی تھی۔؟ اس میں لگے ہوئے ہیں اور مظاہروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب اس سے روکو تو کہتے ہیں کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی نہیں اور محبت کے معنی یہ ہیں کہ یہ خرافات کرد تب تو محبت ہے۔ نہ کرو تو محبت نہیں ہے۔ اب انہیں کس طرح سمجھایا جائے۔ حدود قائم نہیں رہیں۔

اب اس میں علمائے کرام اگر ان خرافات سے ٹوکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نیا اسلام کہاں سے لا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تو ان کے گھروں سے جو اسلام آیا ہے۔ وہ یہ رسوم ہیں۔ اور جو لوگ رسوم سے روکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نئے لوگ کہاں سے رسوم کو روکنے کے لئے آ گئے ہیں۔ حالاں کہ ان رسوم کو روکتے ہیں جو جاہلانہ طریق پر مروّج ہیں۔ اصل شئے کو نہیں روکتے۔ اس کو کوئی نہیں سمجھتا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تجربہ لکھا ہے کہ جو لوگ قبروں پر طواف اور سجدے کرنے جاتے ہیں انہیں حج کی توفیق کم ہوتی ہے اس لئے کہ جو جذبہ اُدھر خرچ کرنا تھا وہ اِدھر خرچ ہو گیا۔

جو لوگ گانے بجانے میں رہتے ہیں، انہیں تلاوتِ قرآن کریم کی کم توفیق ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ جذبہ ادھر لگ گیا۔ اور اسلام اس لئے آیا تھا کہ یہ جذبات دین کے بارے میں صرف ہوں۔ قرآن وحدیث کے بارے

میں صرف ہوں، تو نہ تو تعلیم ہے کہ مسائل معلوم کریں جس سے سیرت کی حقیقت معلوم ہو، اس پر عملدار آمد کریں۔ نہ تمرین وٹرینگ ہے۔ بس جو رسمیں چل پڑیں، جس نے بھی ایجاد کردیں بس سبحان اللہ بہت عمدہ چیز ہے۔ چند دن کے بعد وہی دین بن گیا۔ تو ان چیزوں کو روکتے ہیں نہ کہ اصل دین سے روکتے ہیں۔

دیوبندی بریلوی کوئی فرقہ نہیں...... اس لئے میری سمجھ میں اب تک بھی نہیں آیا کہ وہ اختلاف ونزاع ہے کیا چیز جس کو بریلویّت اور دیوبندیّت کے نام سے کھولا جا رہا ہے۔ دیوبندیّت کوئی فرقہ تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو اہلسنت و الجماعت ہیں۔ دیوبندیّت کی جو نسبت ہے وہ تعلیمی نسبت ہے کہ دیوبند میں تعلیم پائی، دیوبندی مشہور ہوگئے، جنہوں نے علی گڑھ میں تعلیم وہ علیگ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ندوہ میں تعلیم پائی وہ ندوی کے نام سے مشہور ہوگئے، باقیات صالحات مدارس میں تعلیم پائی تو وہ باقوی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اب یہ فرقہ تھوڑا ہی ہیں کہ ندوی ایک فرقہ، باقوی ایک فرقہ اور دیوبندی ایک فرقہ یہ تو تعلیمی نسبت ہے مگر فرقہ بنادیا۔

انگریز کا انتقام...... بنیاد اصل میں ساری یہ ہے کہ دیوبندی جماعت انگریزوں کے مقابلہ میں کھڑی ہوئی تھی۔ تلوار لے کر جہاد کیا۔ تو انگریزوں کے دل میں اس جماعت سے عداوت تھی مگر یہ قوم بہت دانش مند ہے۔ کھلے بندوں مقابلہ نہیں کرتی۔ تدبیر ایسی کرتی ہے کہ وہ آپس میں الجھ جائیں اور باہمی نفرتیں پیدا ہوجائیں۔ اس نے لوگوں کو ہموار کیا کہ ان کو بدنام کرو، چناں چہ جو لوگ رّدِ بدعات کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں جو بدعات میں مبتلا تھے۔ ان کو موقع ملا کہ تم ڈنڈا لے کر کھڑے ہوجاؤ، وہ کھڑے ہوگئے۔ اب یہ بدعات کا رّد کرتے ہیں۔ وہ لوگ مقابلہ پر آگئے بس پھر فرقہ بندی کی ٹھن گئی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بدعات رّد کرنے کی ہی چیز ہے۔

رد بدعات اور اتباعِ سنّت...... مسلمان تو اتباعِ سنّت کے لئے آیا ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اس نمونے پر میں عمل کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ صلوا نماز پڑھ لیا کرو، یہ فرمایا صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي ① ''نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو''۔ اس طریق پر نماز ہوگی مقبول ہے، نہیں ہوگی نامقبول ہے۔ حج کرو جس طرح مجھے کرتے ہوئے دیکھو۔ خود ساختہ طریق پر کروگے، وہ حج نہیں ہوگا، غرض ہم تو پیروی سنّت کے لئے آئے ہیں۔ قرآن سے علم لیا، حدیث سے عمل لیا، فقہ سے اس کی تشریح لی۔ بس اس پر عمل کرو۔ اس کے جو خلاف ہے ظاہر بات ہے کہ وہ عمل کے قابل نہیں۔ جو ان کے خلاف کہے گا وہ اسے بدنام کریں گے، اس لئے کہ وہ ان کی رسوم کے خلاف پڑتا ہے۔ اور لوگ رسموں کے عادی ہوگئے۔ دین کی حقیقت قلوب میں نہیں۔ یہ ساری بنیاد ہے۔ ورنہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نزاع کیا ہے۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے تم بھی۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ تمہارے ہاں بھی، طریقت تمہارے ہاں بھی۔ یہ ساری چیزیں مشترک ہیں۔ آخر نزاع کیا ہے۔؟۔ عرس ومیلا، یہ نزاعی مسئلے ہیں؟ فروعی چیزیں ہیں۔ ان میں جو خرافات آئی

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانو جماعة، ج: ۱، ص: ۲۲۶.

ہیں وہ جاہلوں کے راستے سے آئی ہیں۔ جو واقعی چیزیں ہیں اس کے ہم بھی قائل ہیں کہ کرو۔

اِتباعِ آباء...... اب مثلاً جنازے کی نماز ہے۔ تو اس میں سنّت طریق یہ ہے کہ نماز پڑھ لی۔ اور میّت کو لے جا کر دفن کرو۔ اب اس کے بعد مستقل ایک دعاء مانگی جاتی ہے حالاں کہ وہ نماز بھی تو دعاء ہے، اس نماز میں یہ تو نہیں ہے کہ اس میں رکوع وسجدہ ہو، وہ تو شفاعت وسفارش اور دعاء ہے۔ اب اس کے بعد پھر دعاء اور بعض نے قبروں پر اذانیں دینی شروع کر دیں۔ سنّت سے کہیں اس کا ثبوت نہیں۔ اب اگر کہو تو کہتے ہیں کہ یہ دین تو ہم نے اپنے باپ دادا سے پایا ہے۔ تو کفارِ مکّہ جو کہا کرتے تھے ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا﴾ ① باپ دادا کو یوں ہی کرتے پایا ہے۔ تو قرآن کریم نے جواب دیا۔ ﴿اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآءُ هُمْ لَايَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَايَهْتَدُوْنَ﴾ ② ''کہ تمہارے باپ دادا چاہے نہ علم رکھتے ہوں اور نہ راستے پر ہوں پھر بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ یہ تو تعصب ہے''۔ حق پسندی تو یہ ہے کہ حکمِ رسول آ جائے تو اسے مانو۔ اور اتباعِ سنّت کو غالب رکھو۔

غلبۂ آدابِ شریعت...... ہم نے ان دیوبندی بزرگوں میں یہ دیکھا جو صاحبِ حال بھی تھے، دلوں میں سوز بھی تھا، مگر شریعت کا ادب غالب ہے۔ اس سے باہر نہیں نکلتے تھے کہ کوئی سنّت ترک ہو جائے۔ خواہ جان پہ بن جائے۔ مگر سنّت ترک نہ ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو انگریز کے خلاف ہونے والے جہاد میں امیر جہاد تھے۔ گورنمنٹ عدل وانصاف کی تھی نہیں۔ ذرا ذرا سے حیلوں پر علماء کو پھانسیاں دی جا رہی تھیں۔ اور حضرت کھلے بندوں پھرتے، چھتّے کی مسجد میں گئے، مخبر نے خبر دی کہ اس وقت چھتّے کی مسجد میں موجود ہیں تو پولیس نے آ کر مسجد کو گھیر لیا۔ ایک سارجنٹ اندر آیا۔ آ کر حضرتؒ سے پوچھتا ہے کہ مولوی محمد قاسم کہاں ہوں گے؟

دو قدم پیچھے ہٹ کر حضرت نے فرمایا ''ابھی تو یہیں تھے۔ دیکھ لیجئے یہیں ہوں گے''۔ وہ دیکھتے رہے اور آپ شاہ رکن الدین کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہاں پولیس نے گھیرا ڈالا تو وہاں سے نکل کر شاہ ولایت کی مسجد میں پہنچ گئے۔ بس یوں ہی چکر دیتے رہے۔ ان کے سالے شیخ نہال احمد صاحب مرحوم جو گاؤں گیاؤں کے مالک تھے۔ دیوبند سے کوئی آٹھ دس میل پہ جو چکوالی گاؤں ہے، وہ ان کا تھا۔ انہوں نے منت خوشامد کی۔ کہ ٹھیک ہے تم یہاں تو رکتے نہیں۔ میں تمہیں لے جا کے گاؤں میں رکھوں گا، ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔

چناں چہ مخبر نے پھر خبر دی کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ چکوالی میں ہیں۔ تو پولیس نے آ کر سارے گاؤں کا گھیرا ڈال لیا۔ اب وہ یورپین افسر تھا۔ وہ اندر آیا، حضرت نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ فرمایا۔ آیئے، تشریف لایئے۔ فرمایا، چائے بنواؤ۔ چناں چہ ان کے لئے چائے بنی اس نے کہا آپ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے واقف ہیں حضرت نے فرمایا۔ جی ہاں خوب واقف ہوں۔ اس نے کہا کیسے آدمی ہیں؟ فرمایا نیک آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ اس نے کہا میں تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ فرمایا شوق سے لیجئے۔ تو جس کی تلاش تھی وہی تو تلاشی

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۰۔

دلا رہے تھے۔ ایک ایک کمرہ دیکھا، پتہ نہیں چلا۔ خیر وہ شکریہ ادا کر کے واپس ہوا۔ باہر جاکے اس نے کارڈ نکال کر حلیہ دیکھا تو اس نے کہا کہیں یہی تو نہیں تھے؟ واپس ہوا تو حضرتؒ نانوتہ جاچکے تھے، وہ نانوتہ گیا۔ تو حضرت دیوبند آچکے تھے، آخرکار عزیزوں نے مل کر مجبور کیا کہ چندون روپوش ہوکر گھر میں رہیں۔ تو حضرتؒ کی سسرال دیوبند میں تھی دیوان کا محلہ ہے۔ بہت بڑا محل ہے۔ وہ بڑے رئیس لوگ تھے، انہوں نے مجبور کر کے ٹھہرایا۔

تین دن بعد پھر گھر سے نکل آئے۔ لوگوں نے کہا کہ حالات مخدوش ہیں۔ فرمایا تین دن سے زیادہ چھپنا خلاف سنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو ہجرت کے لئے تشریف لے گئے ہیں تو تین دن غارِثور میں چھپے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کا اتباع بھی نصیب ہوگیا، تو انہیں جان کی پرواہ نہیں تھی، اتباع سنت غالب تھا۔ میں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ سبق پڑھا رہے تھے، جتنی دیر طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے، اتنی دیر ذکر کی ہلکی ہلکی آواز آرہی ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون ذکر کر رہا ہے۔ وہ خود حضرتؒ ذکر کرتے تھے۔ جب وہ عبارت پڑھ چکا۔ تقریر کی، مطلب بیان کیا، اس نے اگلا صفحہ پڑھا، پھر ذکر میں مشغول ہوگئے۔

اور اس میں کیفیت یہ تھی کہ رقتِ قلب سے آنسو آئے تو اس کو اس طرح پیتے تھے کہ دوسروں پر نہ کھلے کہ آنسو آئے ہیں۔ بالکل ضبط کرتے تھے۔ آدابِ شریعت اتنا غالب تھا کہ وہ اپنے حال وقال کو آگے نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ شریعت کو حضرت حضرت امام رکھتے تھے۔ یہی طریقہ ہم لوگوں کا ہے کہ حال بھی پیدا کرو، سوز وگداز بھی پیدا کرو۔ ذکر اللہ بھی پیدا کرو، قلب میں رقّت بھی ہو، مگر ادب شریعت کا غالب رہے۔ اب کوئی اگر بالکل ہی مغلوب الحال ہوجائے تو مستثنیٰ ہے۔ وہ معذور ہے، اس پر کوئی گرفت نہیں۔ لیکن جہاں تک ارادے اور حواس کا تعلق ہے تو حال کو مغلوب کرو، اور شریعت کو اس پر غالب کرو۔

اَبُو الْحَالِ اور اِبْنُ الْحَالِ...... اس لئے ان حضرات کے ہاں دولقب ہیں۔ ایک ابو الحال اور ایک ابن الحال، ابو الحال تو وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور سنّت کو غالب کر کے رکھے، یہی ان کا طریقہ تھا، اور ابن الحال وہ ہے جو حالات سے مغلوب ہوجائے، غرض ان کے ہاں بیعت وارشاد بھی تھی، حَالَ وَقَالَ بھی تھے ساری چیزیں تھیں مگر اِتباعِ سنّت کا غلبہ تھا۔ دین کی عظمت، دین کا ادب یہ ہر چیز سے مقدّم تھا۔

اور ہم تو مختصر لفظوں میں یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ ایک ہے قانونِ عام جو سب کے لئے عام ہے، وہ قانون شریعت ہے، ہر کس وناکس کے لئے پیغام ہے۔ اور ایک طریقت ہے، وہ شخصی احوال کا نام ہے۔ اور ایک شخص کا حال دوسرے پر حجت نہیں ہوتا، اس واسطے وہ نظیر میں نہیں پیش کیا جائے گا کہ فلاں ایسے ہے، تم بھی ایسے کرو، ہر ایک کا حال الگ الگ ہے، جو سب کے لئے یکساں ہے وہ قانون شرعی ہے۔ تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ کوئی بہت بلند پہنچ گیا، کوئی نیچے رہ گیا، نیچے والا یہ چاہے کہ میں کود پھلانگ کر اس تک پہنچ جاؤں، فطرت کے خلاف ہے۔ کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ پہنچادے، پہنچ جائے۔

بس یہ فرق ہے، ورنہ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا اختلاف ہے؟ ایک طوفان برپا ہے اور تکفیر جاری ہے، فلاں کافر، فلاں کافر، لوگوں نے اپنی خصوصیات کا نام اسلام رکھ لیا ہے۔ حالاں کہ اسلام بہت بلند و بالا چیز ہے۔